۸ شمارہ ۴] لاهور [جولائی ۵۵

اس شمارہ میں

تحریر: پروفیسر سراج الدین، پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی

معاونین: عبدالغفور چودھری، فضل احمد

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

جولائی ۱۹۵۵ء

جلد ________ ۸

شمارہ ________ ۴

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

ناشر

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

اداریہ

۴ جولائی سے ۱۷ جولائی تک گھوڑا گلی (مری) میں ایک ایسی تعلیمی تحریک کی داغ بیل ڈالی گئی جو اپنے اندر تعلیم کی تعمیر نو کے بہت سے امکانات رکھتی ہے، ان دو ہفتوں میں یہاں ایک تعلیمی ورکشاپ (تجدیدی نصاب) جاری رہی جس کا مقصد یہ تھا کہ پنجاب کے استادوں کو جدید ترین تعلیمی فکر اور ایک نہایت کامیاب جدید طریق تدریس سے باخبر کیا جائے، اس تجدیدی نصاب کا اہتمام سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور اور واشنگٹن سینٹ یونیورسٹی (ریاست ہائے متحدہ امریکہ) کی طرف سے کیا گیا، اور اس میں متائیس استادوں نے شرکت کی جو پنجاب کے مختلف اضلاع سے بھیجے گئے تھے۔

موجودہ نصاب تعلیم کے متعلق عام شکایت یہ ہے کہ یہ خالص علمی قسم کا ہے اور طالب علموں کو اس قابل نہیں بناتا کہ دور حاضر کے حقائق کا خوبی اور قابلیت کے ساتھ سامنا کر سکیں، یہ نصاب کلرک اور علمی لوگ تو پیدا کرتا ہے لیکن ٹیکنیکل ماہر، صنعت کار، کاریگر، سائنس دان اور ہنر ور لوگ پیدا نہیں کرتا، اس صورت حال کی اصلاح کے لیے نصاب تعلیم میں انقلابی تبدیلی کی سفارش کی جاتی ہے۔

نصاب تعلیم آخر کس چیز کا نام ہے؟ بہت سے لوگ فوراً جواب دیں گے کہ یہ ان مضامین کے مجموعے کا نام ہے جو کسی امتحان کے لیے لازمی قرار دیے گئے ہوں۔ بے شک نصاب کا پرانا تصور یہی تھا (اور ہمارے استادوں کی غالب اکثریت ابھی اسی فرسودہ تصور کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے) لیکن جدید تعلیمی فکر نصاب کو محض نفس مضمون ہی سے عبارت نہیں سمجھتا بلکہ طریق تدریس کو بھی اس کا لازمی جزو خیال کرتا ہے، نفس مضمون اور طریق تدریس نصاب کے دو اہم

فنون میں اور ان ہر دو کی صحت مندی کا لحاظ رکھے بغیر کوئی نصاب توازن حاصل نہیں کرسکتا۔

اب تک پنجاب میں اصلاح نصاب کی جو کوششیں ہوئی ہیں وہ نفس مضمون کے ردوبدل سے آگے نہیں بڑھیں۔ مگر ظاہر ہے کہ نفس مضمون خواہ کتنا ہی پسندیدہ کیوں نہ ہو جب تک طریق تدریس بھی پسندیدہ نہ ہو، اس وقت تک طالب علموں میں تحقیق و جستجو کی وہ نگاہ پیدا نہیں ہو سکتی جو اصلی ایجاد و اختراع اور صنعتی ترقی کی ضامن ہوا کرتی ہے۔ جو ملک آج سائنس اور صنعت کے میدان میں دنیا کو راستہ دکھا رہے ہیں وہ مدت سے نفس مضمون کی بجائے طریق تدریس پر زیادہ زور دے رہے ہیں، جب تک نئی پود کی تربیت ایسی فضا میں نہیں ہوتی جو اس میں بے لاگ تنقیدی نگاہ اور بے باک جراتِ عمل پیدا کر دے اس وقت تک قومی زندگی میں کسی دوررس تبدیلی کی امید رکھنا عبث ہے، فکر و عمل کے یہ اوصاف زیادہ تر کمرۂ جماعت میں برتے جانے والے طریقوں کی پیداوار ہوتے ہیں۔

گھوڑا گلی کے تجدیدی نصاب میں "وحدتی طریقۂ تدریس" (یونٹ میتھڈ آف ٹیچنگ) موضوع بحث تھا، یہ طریق تدریس آج کل ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں بہت مقبول ہے، یہ تدریس کو ایسی بامعنی اور مربوط سرگرمیوں کی شکل دیتا ہے جو کسی حقیقی مرکز دلچسپی کے گرد منظم کی گئی ہوں اور طلبہ کے اپنے مقاصد کو اس طور پر پورا کریں کہ انہیں نہ صرف معنی خیز تعلیمی تجربہ حاصل ہو بلکہ موزوں قسم کی اصلاح کردار بھی، وحدتی طریق کے نمایاں خواص یہ ہیں۔

(۱) تعلّم کو بے حرکت کیفیت کی بجائے ایک متحرک کیفیت سمجھا جاتا ہے۔

(۲) علم کو مصنوعی حد بندیوں میں بانٹنے کی بجائے اسے ایک وحدت تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس لیے مختلف تعلیمی سرگرمیاں باہم مربوط اور طے کردہ مقاصد کے تابع رکھی جاتی ہیں۔

(۳) تعلیم کی مقصدیت وحدتی تصور کا ضروری جزو ہے، اس لیے عملی تجربہ کے ذریعہ سیکھنا اس تصور کی جان ہے۔

(۴) تدریس وحدت کے خاتمہ پر اس کی مختلف سرگرمیوں کی قدروقیمت اور طے کردہ مقاصد کی تکمیل کا

جائزہ لینا اس طریق تدریس کی ایک اہم خاصیت ہے۔

گھوڑا گلی میں جمع ہونے والے اساتذہ نے وحدتی طریق کے صرف نظری پہلو ہی کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ اس کے عملی امکانات کا بھی۔ ہر نظری فلسفہ بنیاد عمل بنتے وقت مقامی حالات کے رنگ میں خواہ مخواہ رنگا جاتا ہے، اس لیے کوئی طریق تدریس جو دوسرے ملکوں میں کامیاب ثابت ہوا ہو اپنے تمام برگ و بار سمیت اس ملک میں درآمد نہیں کیا جا سکتا۔ مخصوص پاکستانی حالات میں اس کے برگ بار کی کیفیت لامحالہ مختلف ہو گی۔ گھوڑا گلی ورکشاپ میں یہ نکتہ خاص طور پر مرکز توجہ رہا۔ وحدتی طریق نظری طور پر نہایت مفید طریق تدریس ہے لیکن اسے پاکستانی کمرہ جماعت کی ضرورتوں کے مطابق ڈھالنا ان اساتذہ کا کام ہے جو پاکستان کے مدرسوں میں پڑھاتے ہیں۔

ورکشاپ میں شرکت کرنے والے اساتذہ نے ان مخصوص مجبوریوں اور دشواریوں کا بار بار ذکر کیا جن کا انہیں ہر وقت سامنا رہتا ہے۔ بالآخر ان دقتوں پر کافی حد تک قابو پانے کے طریقے بھی انہوں نے خود ہی سوچے اور ورکشاپ کے خاتمہ سے پہلے ہر استاد نے اپنے اپنے خاص مضمون میں ایک ایسی تدریسی وحدت تیار کی جو وہ اپنے کمرہ جماعت میں قابل عمل سمجھتا تھا، اس طرح جو کام شکستہ [illegible] فضا میں شروع ہوا تھا آخر یقین و عزم کی منزل پر ختم ہوا۔

وحدتی طریق کی اصل روح کو اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ تعلیم کی حقیقی غایت طلبا میں خود سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ سچ یہ ہے کہ قرآن کی حامل امت کے لیے یہ کوئی نیا سبق نہیں۔ قرآن حکیم نے بار بار یہ نکتہ دہرایا ہے کہ تدبر و تفکر ہی انسانیت کا اصل معراج ہے جو تعلیم لوگوں میں تدبر اور تفکر کا ملکہ پیدا نہیں کرتی اسے تعلیم کا نام دینا خود فریبی ہے۔ ہمارا نصاب چند در چند اثرات کے تحت عرصے سے یہ بنیادی غایت پوری کرنے سے قاصر ہے، نصاب میں دوبارہ صحت مند توازن پیدا کرنا اکیلے تعلیمی افسروں کا کام نہیں بلکہ اس کے لیے اساتذہ کے سرگرم تعاون کی بھی ضرورت ہے گھوڑا گلی میں جمع ہونے والے اساتذہ نے اس تعاون کی عملی شرح اچھی طرح سمجھ لی ہے، اگر یہ لوگ اس کام کو مبلغانہ جوش کے ساتھ شروع کر دیں تو وہ ایک ایسی اہم تعلیمی تحریک کو جنم دیں گے جس کی پاکستان کو سخت ضرورت ہے۔

گونگوں کو گویائی بخشنے والا مدرسہ

فضل احمد

اِنَّ شَرَّ الدَّوابِ عِندَ اللہِ الصُّمُّ البُکْمُ الَّذِینَ لَا یَعقِلُونَ

ترجمہ:۔ بے شک اللہ کے نزدیک بدترین حیوان وہ ہیں جو بہرے اور گونگے ہوں اور کچھ سمجھ نہ سکتے ہوں۔

قرآن حکیم نے اوپر دیے گئے الفاظ میں ان سیاہ بخت انسانوں کی تصویر کھینچی ہے جو دعوت حق کے خلاف اپنے کان بند کر لیتے ہیں، اس لیے سچی بات ان کی زبان پر بھی نہیں آ سکتی اور اس طرح وہ دلیل وحجت پر غور و فکر کرنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت میں جہاں ایک ابدی روحانی حقیقت کی بے مثال شرح موجود ہے وہاں انسانی فہم و ادراک کا ایک جامع تجزیہ بھی کیا گیا ہے، فہم و ادراک کی طرف پہلا قدم سماعت ہے، جب تک کان کسی آواز کو نہ سنیں اس وقت تک اس کے مطالب کو سمجھنے اور ان پر غور و فکر کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، سننے کی قوت ایک بہت بڑا خدائی انعام ہے جو انسان کو دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم نے اکثر مقامات پر انسان کو خدائی نعمتیں یاد دلائی ہیں، ان میں جسمانی قویٰ کو عموماً اولیت دی گئی ہے اور پھر ان میں سے قوت سماعت کا ذکر بصارت اور گویائی سے پہلے کیا گیا ہے، بے شک سننے کی قوت ایک انمول نعمت ہے، اس کے بغیر آدمی انسانیت کے اکثر اوصاف سے محروم ہو جاتا ہے۔

یہ بات انسان کو مدت سے معلوم ہے کہ جو بچے گونگے ہوں وہ ساتھ ہی بہرے بھی ہوتے ہیں، دراصل ان کا بہرہ پن ہی انہیں گونگا بنانے کا سبب ہوتا ہے، چونکہ ان کے کان ہر انسانی آواز کے لیے بند ہوتے ہیں اس لیے وہ ان آوازوں کو پیدا کرنا بھی نہیں سیکھ سکتے

عموماً قوتِ گویائی کو انسانی زندگی کا ایسا ہی خاصہ خیال کرنے کے عادی ہیں جیسے سانس لینا لیکن
ہیں یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ دنیا میں ایسے بدنصیب بچے بھی پیدا ہوتے ہیں جو بولنا نہیں
سیکھ سکتے کیوں کہ وہ سُننے کی طاقت سے محروم آتے ہیں۔

ٹیلیفون کا موجد

"بچو! تمہیں اب کچھ یاد نہیں کہ تم نے زبان سے پہلا لفظ کون سا نکالا تھا لیکن ذرا اس سیاہ بخت
بچے کا تصور کرو جس نے انسانی آواز کو کبھی نہیں سنا، ذرا سوچو کہ سُننے والے لوگوں کے درمیان
زندگی بسر کرنے کے لیے اس بچے کو کتنے حوصلے کی ضرورت ہے"

یہ الفاظ ہیں جو ٹیلیفون کے موجد الگزینڈر گراہم بیل نے ایک مرتبہ بچوں کے ایک مجمع کو خطاب
کرتے ہوئے کہے تھے۔ گراہم بیل کو بہرے بچوں کی محرومی کا بے حد احساس تھا، اس نے زندگی کی تقریباً
نصف صدی اس دھن میں گذار دی کہ کسی طرح اس محرومی کا علاج کیا جائے، اس غرض کے لیے
اس نے تحقیق و تجربہ کا راستہ اختیار کیا، آخر اس نے دوسرے ہم خیال لوگوں کے ساتھ مل کر ریاست
میساچوسٹس (امریکہ) میں نارتھمپٹن کے مقام پر بہروں کے لیے کلارک اسکول کے نام سے جاری شدہ
مدرسہ کے ساتھ مستقل تعلق قائم کر لیا اور پورے اکیاون برس تک اس ادارے کی روح رواں رہا
"اپنے پوتوں پوتیوں سے کہا کرتا تھا۔" دنیا کی عظیم ترین کامیابیوں میں سے ایک کامیابی اس بچے کی
ہے جو بہرہ پیدا ہوا ہو لیکن سماعت حاصل کر کے بولنا سیکھ جائے"

نیا پُر احسان

کلارک اسکول ۱۸۶۷ء میں جاری ہوا تھا، اسی سال شہر نیو یارک میں بھی لیکسنگٹن اسکول کے
نام سے بہروں کے لیے ایک مدرسہ جاری کیا گیا، ان دونوں مدرسوں میں زبانی طریق تدریس اختیار
کیا گیا یعنی بہرے بچوں کو ہونٹوں کی حرکات دیکھ کر آواز سمجھنا اور بولنا سکھایا جانے لگا۔ ۱۸۸۹ء
میں گراہم بیل نے بہرے بچوں کو پڑھانے والے استادوں کی تربیت کے لیے ایک نصاب جاری کیا
اس وقت سے لے کر اب تک کوئی پانچ سو استادوں نے یہ تربیت حاصل کی ہے اور یہ لوگ

نہ صرف ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی مختلف ریاستوں میں پھیلے ہوئے ہیں بلکہ دنیا کے دوسرے بیسیوں ملکوں میں بھی، ان لوگوں نے بہروں کو سننے اور بولنے کی قوت عطا کی ہے اور ارجنٹینا سے لے کر سناڈا تک۔ آسٹریلیا سے لے کر جاپان تک۔ ترکی سے لے کر مشرقی پاکستان تک اور جنوبی افریقہ سے لے کر ناروے تک ہر جگہ مایوس والدین کے دلوں میں امید کی نئی کرن پیدا کی ہے۔

کلارک اسکول

حال ہی میں، ایک صاحب کلارک اسکول دیکھنے گئے۔ انہیں مبصروں کی مخصوص جگہ پہ بٹھا دیا گیا، جہاں سے وہ جماعت کو دیکھ سکتے تھے۔ مگر جماعت انہیں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ استانی ایک بے حد خوبصورت ساڑھے چار سالہ بچی کو سبق دے رہی تھی۔ سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی اس بچی کو مدرسہ میں آئے ابھی چند ہفتے گزرے تھے۔ اس نے زندگی میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا تھا۔ استانی نے بچی کو گود میں بٹھا لیا اور اس کا ننھا سا ہاتھ اپنے گال پر رکھ دیا تاکہ جب وہ منہ سے لفظ نکالے تو بچی کا ہاتھ آلات صوت کی تھرتھراہٹ کو محسوس کرے، سامنے آئینہ دھرا تھا جس میں بچی استانی کے ہونٹوں کی حرکات اور منہ کی کیفیت کو دیکھ سکتی تھی۔

اب استانی نے بار بار لفظ "بال" دہرانا شروع کیا، وہ کبھی آہستہ بولنے لگتی اور کبھی جلدی جلدی استانی کی زبان اور ہونٹوں کی حرکات کو آئینے میں دیکھ کر بچی نے بھی اس کی نقل کرنا شروع کی۔ اب اس کا ننھا ہاتھ فوراً اس کے اپنے گال پر رکھ دیا گیا تاکہ وہ اپنی آواز کی تھرتھراہٹ کو محسوس کر سکے، استانی اور بچی دیر تک اس مشق میں لگی رہیں۔ استانی اس جوش اور دل سوزی سے کام کر رہی تھی۔ گویا اس کی زندگی کا مدار اسی کامیابی پر ہے۔ بچی کے شوق کا بھی بالکل یہی حال تھا آخر استانی نے سنہری بالوں کا ایک گچھا اٹھایا جو پاس ہی پڑا تھا اور بچی کو دکھاتے ہوئے کہا "دیکھو یہ بال ہیں" بچی مسکرانے لگی اور استانی بھی، اب استانی نے پھر ننھا ہاتھ اپنے گال پر رکھا اور بلند آواز سے کہا "دیکھو یہ بال ہیں"

استانی نے یہ جملہ چند بار دہرایا، بچی بڑے غور سے آئینہ میں دیکھتی رہی اور ہاتھ سے آلات

کی تھرتھراہٹ کو محسوس کرتی رہی، آخر اسے بات چیت کے ترنم کا دھندلا سا احساس ہوا اور وہ یہ جان گئی کہ بات چیت میں صرف ایک ہی لفظ نہیں بولا جاتا۔ یہ سبق اسی طرح جاری رہا، بچی کا ہاتھ کبھی استانی کے گال پر ہوتا تو کبھی اپنے گال پر۔ اس کی نگاہ لگاتار آئینے پر جمی تھی، آخر بچی کی جیت ہوئی۔ مگر اس کے الفاظ ادھورے اور زیر و بم سے خالی تھے، اس کے پاس ان کمیوں کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا تاہم وہ اپنی کامیابی پر پھولی نہ سماتی تھی، استانی کی خوشی کا بھی یہی عالم تھا۔

سبق میں حد درجہ کے انہماک نے ننھی بچی کو تھکا دیا تھا، چناں چہ اب وہ کھیل کے میدان کی طرف دوڑ گئی۔ استانی نے ایک اور خوب صورت بچی کی طرف مخاطب ہو کر کہا "مریم اب تمہاری باری ہے" وہ بھاگی آئی اور استانی کی گود میں آن بیٹھی۔ استانی نے کاغذ کا ایک لمبا ٹکڑا ایک سرے سے پکڑا اور اسے بچی کے منہ کے سامنے تھام کر اسے کہا کہ منہ پھیلا کر زور سے پھونک مارو، دراصل یہ گالوں کے پٹھوں کے لیے ورزش تھی، مریم کے یہ پٹھے کم زور تھے۔

مریم کے لیے یہ سبق نہیں کھیل تھا، لیکن اس کھیل کے ضمن میں ایک تو وہ "واؤ" کی آواز پیدا کرنا سیکھ رہی تھی دوسرے وہ اپنے سانس پر قابو پانا سیکھ رہی تھی، واؤ کی آواز نہ صرف بول چال میں کام آنے والی تھی بلکہ کنڈر گارٹن سبقوں میں بھی سانس پر قابو تقریر اور گانے دونوں کے لیے ضروری تھا۔

اس کے بعد استانی نے ایک اور بچے کو بلایا اور اسے سانس پر قابو سکھانے کے لیے ایک جلتی ہوئی موم بتی کو پھونک مار کر بجھانے کو کہا، اس کے بعد وہ ایک چھوٹے لڑکے کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کا کندھا چھو کر بولی:۔ ادھر آؤ۔ دیکھیں تم کیا کچھ سن سکتے ہو، اگرچہ وہ کچھ نہ سن سکتا تھا۔ تاہم اس کی نگاہ استانی کے ہونٹوں پر جمی تھی اور وہ ہونٹوں کی حرکات کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا، اب استانی ایک ڈھول ایک گھڑیال اور ایک سیٹی اٹھا لائی اور ان تینوں کو تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ اتنے زور سے بجایا کہ کمرہ شور سے گونجنے لگا۔ لڑکا کانوں پر زور ڈال ڈال کر تینوں آوازوں میں تمیز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

نئی تکنیک

کلارک اسکول اس بات کی پوری کوشش کرتا ہے کہ بہرے بچوں میں جو کچھ تھوڑی بہت قوت سماعت باقی ہو اس سے خدمت لی جائے اور اس کی بدولت ہونٹوں کی حرکات سمجھنے میں مدد ملے، اس مطلب کے لیے سماعت کے آلے ایجاد کیے گئے ہیں جنہیں بچے استعمال کرتے ہیں، یہ اختراع کوئی پچیس برس گذرے کی گئی تھی، اس سے پہلے کلارک اسکول میں بھی قوت سماعت کے بچے کھچے ریزوں سے کچھ کام نہ لیا جاتا تھا۔ اوپر جس بچے کے ڈھول، گھڑیال اور سیٹی کی آوازوں میں تمیز کرنے کا ذکر کیا گیا ہے وہ انہی آلوں کی مدد سے ایسا کر رہا تھا، آج سے پچیس برس پہلے یہ ممکن نہ ہوتا۔

کلارک اسکول کی کامیابی کا بڑا دار و مدار ان تحقیقاتی مطالعوں اور تجربوں پر ہے جو اس درسگاہ میں لگاتار جاری رہتے ہیں اور جن کی بدولت نئی نئی اختراعیں اور تکنیکیں معلوم ہوتی رہتی ہیں، سچ پوچھو تو یہ کارنامہ ان لوگوں کا ہے جو بہروں کی اس درسگاہ میں کام کرتے ہیں، ان لوگوں کا دل ان سوختہ بختوں کی محرومی پر کڑھتا ہے، جن کے دل و دماغ سکوت و بے گفتاری کی زندان میں گرفتار ہونے کے باعث اردگرد کی دنیا سے بے خبر رہتے ہیں، یہ احساس ان لوگوں کو انتہائی بے جگری سے جہاد کرنے پر ابھارتا ہے اور یہی جذبہ جہاد بہرے بچوں کی راہ نجات کی دریافت کا موجب ہوا ہے۔

ابتدا کیوں کر ہوئی

بہرے بچوں کی تعلیم اور کلارک اسکول کی تاسیس کی ابتدا چند ایسے واقعات کے ساتھ وابستہ ہے جن کا ذکر بے حد سبق آموز ہوگا، سنہ ۱۸۶۰ء کا واقعہ ہے کہ کیمبرج (ماساچوسٹس) کے وکیل مسٹر ہیوبارڈ کی چار سالہ بچی میبل پر قرمزی بخار کا شدید حملہ ہوا جس میں اس کی قوت گویائی فنا ہو گئی، بخار کے خاتمہ پر یہ بچی مہینوں چپ چاپ اور پژمردہ اپنے بستر پر لیٹی رہی، اس وقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۲۱ مدرسے ایسے موجود تھے جو ناقص قوت سماعت والے بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔ ان سب نے بلا استثنا یہی فیصلہ دیا کہ میبل ناقابل علاج ہے، وہ مکمل طور پر بہری اور گونگی ہو چکی ہے اور اسے پڑھایا نہیں جا سکتا۔ بہی خواہ دوستوں نے بھی حرماں نصیب والدین کو یہی مشورہ دیا کہ بجائے صرف

بچی کی سماعت بلکہ اس کے ذہن کو بھی متاثر کیا ہے، اس لیے اس کی گویائی لوٹانے کی کوشش کرنا بے کار ہے۔

مسٹر ہیو بارڈ بڑے عزم کے انسان تھے، انہوں نے ماہروں اور دوستوں دونوں کی رائے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس بات کو ہرگز قبول نہیں کر سکتا کہ میری بچی عمر بھر لب بستہ ہی دنیا سے چلی جائے، چناں چہ والدین نے گھر پر بچی کو پڑھانے کی کوشش جاری رکھی، وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ بہروں کو پڑھانے کے لیے ہونٹوں کی حرکات کا پڑھنا سکھایا جاتا ہے۔ ایک روز میبل کی ماں تقریری سبق دہرانے میں مصروف تھی کہ اسے یکایک خیال آیا کہ بچی نے بیماری سے پہلے تیسویں دعا زبانی یاد کی تھی، چناں چہ اس نے یہ دعا دہرانی شروع کی، بچی بڑے غور سے ماں کے ہونٹوں کو ہلتے ہوئے دیکھتی رہی اور پھر یکایک دعا پڑھنے میں اس کے ساتھ شریک ہوگئی، رفتہ رفتہ یہ ساری دعا اس کے حافظہ میں پھر سے آن موجود ہوئی اور وہ اسے سنانے لگی۔

والدین کے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی تھی۔ اب انہوں نے اپنی کوششوں کو تیز تر کر دیا اور دعا کے الفاظ کو بنیاد قرار دے کر اس پر ذخیرہ الفاظ کی عمارت اٹھانی شروع کی، وہ الفاظ کو ہمیشہ حرکات اور اشیا کے ساتھ وابستہ کرتے تھے اور اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ میبل کی بہنیں اور دوسرے اشخاص اس کے ساتھ اشاروں سے نہیں بلکہ زبانی بات چیت کریں، اگرچہ تحقیق و تجربہ نے اب اس طریق تدریس کی صحت پر مہر ثبت کر دی ہے، لیکن ۱۸۶۰ء میں جب مسٹر ہیو بارڈ اور اس کی بیوی نے یہ طریقہ اختیار کیا تو وہ بالکل اندھیرے میں تیر چلا رہے تھے۔

میبل نے حیرت انگیز رفتار سے ترقی کی، دو سال بعد مسٹر ہیو بارڈ نے ایک قابل معلمہ کی خدمات حاصل کیں جو میبل اور اس کی دوسری تندرست بہنوں کو پڑھانے لگی، انہی دنوں مسٹر ہیو بارڈ کو معلوم ہوا کہ ریاست روڈ آئی لینڈ کے گورنر کی بیٹی بھی بہری اور گونگی ہے اور اسے کامیابی کے ساتھ ہونٹوں کی حرکات پڑھنے کا طریقہ سکھایا جا رہا ہے، چناں چہ مسٹر ہیو بارڈ اور گورنر کے درمیان خط و کتابت جاری ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

اب مسٹر ہیوبارڈ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ دوسرے بہرے بچوں کی محرومی کو دور کرنے کی بھی کوشش ہونی چاہیے، چناں چہ انہوں نے ریاست ماساچوسٹس کی قانون ساز اسمبلی میں تجویز پیش کی کہ اس غرض کے لیے روپیہ بہم پہونچایا جائے، یہ تجویز ناکام رہی، اس کی مخالفت میں ڈوڈلے نامی ایک رکن اسمبلی سب سے آگے آگے تھا۔ اس نے نہایت پر زور پیرائے میں کہا کہ بہرے بچوں کو بولنا سکھانا بالکل ناممکن ہے، میری اپنی بیٹی بہری ہے اور انتہائی کوشش کے باوجود ایک لفظ منہ سے نکالنا نہیں سیکھ سکی۔

مسٹر ہیوبارڈ نے ہمت نہ ہاری، انہوں نے اپنی بیٹی کی معلمہ مس روجرز کی حوصلہ افزائی کی کہ بہرے بچوں کے لیے ایک مدرسہ جاری کریں۔ ایک سال بعد قانون ساز اسمبلی کے اراکین کو اس مدرسے کے تعلیم یافتہ بچوں کی حیرت انگیز کامیابی کی شرح اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع دیا گیا۔ مس روجرز کے چند ہونہار شاگرد مسٹر ہیوبارڈ کی بیٹی میبل اور گورنر رو ڈآئی لینڈ کی بیٹی سب ایک ساتھ بیٹھی بڑی بے تکلفی سے امریکی خانہ جنگی کے متعلق بات چیت کر رہی تھیں اور اسمبلی کے رکن حیرت کی تصویر بنے سن رہے تھے اس گروہ میں ڈوڈلے بھی موجود تھا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے اور بولا، "اگر میری پیاری بیٹی تھریسا کو کوئی صرف ایک لفظ "ابا" کہنا سکھا دے تو میں منہ مانگا معاوضہ دوں گا"

مسٹر ہیوبارڈ نے بڑھ کر اس کی آنکھوں سے رومال ہٹایا اور زور سے اس کا ناک صاف کرتے ہوئے کہا، مجھے تمہارے جذبات کا علم ہے مجھے یقین ہے کہ مس روجرز تھریسا کو یہ لفظ سکھا سکے گی۔

مس روجرز نے یہ خدمت بخوشی اپنے ذمہ لی اور چند دن بعد تھریسا نہ صرف "ابا" بلکہ چند اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ بھی کہنے کے قابل ہو گئی، کچھ دنوں بعد ڈوڈلے اپنے ایک دوست جان کلارک کو ملنے کے لیے نارتھمپٹن گیا اور اسے اس "معجزہ" کا سارا حال سنایا جو اس نے بوسٹن میں دیکھا تھا۔

۱۸۶۷ء میں مسٹر ہیوبارڈ نے قانون ساز اسمبلی میں پھر اپنی تجویز پیش کی، اب کی بار ڈوڈلے اس کی حمایت میں سب سے آگے تھا، اس کے زور بیان کے طفیل آخر اسمبلی نے بہرے بچوں کی تعلیم کے لیے ایک رقم منظور کر دی، اس اثنا میں مسٹر کلارک نے پیشکش کی کہ اگر بہروں کا مدرسہ ان کے قصبہ نارتھمپٹن میں قائم کیا جائے تو وہ پچاس ہزار ڈالر اس مدرسہ کی نذر کریں گے، چناں چہ یہ مدرسہ

نا لیعپسٹن میں کھولا گیا اور جب ۱۸۶۹ء میں مسٹر کلارک نے وفات پائی تو ڈھائی لاکھ ڈالر اس کے لیے اور چھوڑ گئے۔

مس روجرز اس مدرسہ کی پہلی پرنسپل مقرر ہوئیں۔ ان کے بعد مدرسہ کی باگ ڈور مس ییل کے ہاتھ میں آئی جنہوں نے پورے ترسیٹھ سال تک اس مدرسہ کے ساتھ سرگرم تعلق قائم رکھ کر ایک دائمی ریکارڈ قائم کر دیا۔ کلارک مدرسہ کی آج جو شکل و صورت ہے وہ مس ییل کی ترتیب دادہ ہے۔ مس ییل ہی نے ۱۸۷۱ء میں نوجوان سائنس دان مسٹر گراہم بیل کی تجویزوں اور مشوروں کو خوش آمدید کہا اور ان کی اختراع کردہ تدریسی امدادوں سے کام لینا شروع کیا۔ ان امدادوں میں سے ایک "بصری زبان" بھی ہے۔ یہ دراصل تحریری علامتوں کا ایک نقشہ ہے جو مختلف آوازیں نکالتے وقت آلات صوت کی شکلوں کو ظاہر کرتا ہے "ترمیم شدہ بصری زبان" کا نقشہ آج تک کلارک اسکول کے استادوں کی تربیت میں استعمال ہو رہا ہے۔

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

مسٹر ہیوبارڈ کو بہروں کی تعلیم کے مسئلہ سے جو شغف تھا اس کا حال اوپر کی سطروں میں گذر چکا ہے۔ اب اس دشت کی سیاحی میں ایک اور نوجوان سائنس داں شریک ہو چکا تھا۔ یہ پروفیسر بیل تھا۔ ایک شام مس ییل نے ان دونوں کا باہم تعارف کرایا۔ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے مسٹر ہیوبارڈ نے پیش کش کی کہ وہ ٹیلیفون کے متعلق بعض تجربوں کے اخراجات برداشت کرنے کو تیار ہیں۔

چند سالوں بعد مسٹر بیل نے مسٹر ہیوبارڈ کی بہری بیٹی میبل سے شادی کر لی اور میاں بیوی ایک مشترکہ مقصد کی تلاش میں لگ گئے۔ انہوں نے امریکہ کے دارالخلافہ واشنگٹن ڈی۔ سی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ یہاں انہوں نے "والٹا بیورو" کے نام سے ایک مرکز جاری کیا جس کا مقصد بہرے پن کے متعلق ہر قسم کی معلومات بہم پہونچانا تھا۔ ایک روز کلارک اسکول کی پرنسپل مس ییل کو دعوت موصول ہوئی کہ "والٹا بیورو" کو دیکھنے آئیں اور مشورہ دیں کہ اس مرکز کو

والدین اور اتنادوں کے لیے کیوں کر زیادہ مفید بنایا جاسکتا ہے۔

مس بیل واشنگٹن پہونچیں۔ مسٹر ہیوبارڈ بھی وہاں مدعو تھے۔ شام کو والٹا بیورو میں کھانے کی دعوت دی گئی۔ مہمانوں نے دیکھا کہ خسر اور داماد اس طرح گہری گفتگو میں مصروف ہیں جیسے دونوں کے درمیان ایک بہت بڑا راز ہو، دونوں کے چہرے خوشی سے یوں تمتما رہے تھے جیسے کلارک اسکول کے ان بچوں کے جنہوں نے پہلی بار زبان سے لفظ نکالنا سیکھا ہو۔ کھانے کے بعد مہمانوں کو کتب خانہ دکھایا گیا جہاں ایک بہت بڑا روشن گلوب ایک اونچی میز پر دھرا تھا۔

امید کا بڑا مرکز

مس ہیوبارڈ اور مسٹر ڈوڈلے کو دنیا سے رخصت ہوئے اب ساٹھ برس سے اوپر ہوتے ہیں لیکن ان کا لگایا ہوا پودا ایک تنومند درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے جس کے سایہ میں دور دور کے تھکے ماندے مسافر آکر پناہ ڈھونڈتے ہیں، بہرے بچوں کے والدین جب دوسری سمتوں سے آس توڑ بیٹھتے ہیں تو آخر وہ کلارک اسکول ہی کا دامن تھامتے ہیں۔

۱۹۲۵ء کی بات ہے کہ ریاست میری لینڈ کا ایک نوجوان استاد جارج پراٹ برما میں جنگی خدمات انجام دے رہا تھا، اس کی عدم موجودگی میں اس کے گھر لڑکی پیدا ہوئی، جب لڑکی ایک برس کی ہوئی تو اس کی ماں کو یہ معلوم کر کے بڑی مایوسی ہوئی کہ وہ کچھ سن نہیں سکتی، جب اس کا خاوند برما سے لوٹا تو میاں بیوی مدتوں ڈاکٹروں کے ہاں مارے مارے پھرتے رہے مگر کچھ کامیابی نہ ہوئی، مسٹر پراٹ خود استاد تھے مگر ان کی بیٹی نے انسانی آواز کی بھنک تک نہ سنی تھی، اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ مسٹر ہیوبارڈ کی بیٹی میبل کی طرح سابقہ ذخیرہ الفاظ کو بنیاد بنا کر کچھ اور سکھایا جاسکتا۔

آخر ایک دوست نے مسٹر پراٹ کو مشورہ دیا کہ واشنگٹن ڈی سی میں مسٹر بیل کے قائم کردہ "والٹا بیورو" سے رجوع کریں، وہاں سے انہیں ان تمام اداروں کا حال معلوم ہوا جو بہرے بچوں کی مدد کا اہتمام کرتے ہیں، ۱۸۶۷ء میں مسٹر ہیوبارڈ کو صرف ۱۰۲ ایسے مدرسے مل سکے تھے جو ناقص سماعت کے بچوں کو پڑھاتے تھے اب ان کی تعداد ۳۰۰ کو پہونچ چکی تھی اور ان میں بائیس ہزار بچے زیر تعلیم

ان میں سے بعض مدرسے صرف تقریری طریق تدریس سے کام لے رہے تھے۔ مگر بعض ملا جلا طریق استعمال کر رہے تھے۔ بعض تقریر کے ساتھ انگشتی ابجد اور فرانسیسی علامتی تحریر سے بھی کام لے رہے تھے۔
"واشا ہیو رو" سے مسٹر پراٹ کو یہ بھی مشورہ ملا کہ وہ لاس انجیلز کی مشہور جان ٹریسی کلینک تیار کردہ خط و کتابتی نصاب سے بھی استفادہ کریں جو بہرے بچوں کے والدین کے لیے تیار کیا گیا ہے، انہیں یہ بھی مشورہ ملا کہ مانچسٹر (انگلستان) کی وکٹوریہ یونی ورسٹی کا شائع کردہ نصاب بھی حاصل کریں جو پروفیسر ایوانگ اور ان کی بیوی نے بہرے بچوں کے لیے تیار کیا ہے۔
مسٹر پراٹ نے یہ تمام تدبیریں آزمائیں، یہ کوششیں بھی بار آور ثابت ہوئیں، لیکن مسٹر پراٹ کو پورا اطمینان نہ ہوا۔ آخر ۱۹۲۹ء میں وہ اپنی بچی کو کلارک اسکول میں لے کر آئے۔ ایک سال بعد مسٹر پراٹ سے درخواست کی گئی کہ کلارک اسکول میں پرنسپل کا عہدہ سنبھال لیں، انہوں نے فوراً یہ پیشکش قبول کر لی۔ اس طرح مسٹر ہیوبارڈ، مسٹر کلارک اور مسز ڈوڈلے کا قائم کیا ہوا ادارہ ایک ایسے آدمی کے ہاتھوں میں چلا گیا جسے بہرے بچوں کے ساتھ پدری جذبات کی بنا پر ہمدردی ہے۔

انگلستان میں بہروں کا ہائی اسکول۔

لندن کے قریب نیو بیری کے مقام پر "میری ہیر گرامر اسکول" کے نام سے ایک ثانوی مدرسہ بہرے بچوں کے لیے قائم ہے۔ اس مدرسہ میں خالص تقریری طریقہ ہی سے کام لیا جاتا ہے، اور یہ انگریزی بولنے والے ملکوں میں اپنی قسم کا واحد مدرسہ ہے۔ کلارک اسکول اور اس قسم کے دوسرے مدرسے بہرے بچوں کو قوت گویائی عطا کر کے انہیں عام ثانوی مدرسوں میں بھیج دیتے ہیں جہاں وہ دوسرے تندرست بچوں کے ساتھ پڑھتے ہیں اور عام طور پر اچھے ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس میری ہیر گرامر اسکول کے بہرے بچے ثانوی درجہ تک ساری تعلیم ایک الگ مدرسہ میں حاصل کرتے ہیں۔

کلارک اسکول کا طریق کار

جب بچے ہونٹوں کی حرکات کو پڑھنا سیکھ جاتے ہیں تو اگلا کام ان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ

کرنا ہے، یہ کام تصویروں کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ کلارک اسکول کے اُستاد نیشنل جیوگرافک میگزین کے موجودہ اور پرانے شماروں سے بڑی خدمت لیتے ہیں۔ اگر اس مدرسہ میں استاد کو نئے الفاظ سکھاتے دیکھو تو بچے ایک نصف دائرہ میں کرسیوں پر بیٹھے نظر آئیں گے، ان کے سروں پر ہیڈ فون آلے نظر آئیں گے یہ تمام آلے ایک کونے میں رکھے ہوئے اعلیٰ قسم کے لاؤڈ سپیکر کے ساتھ متعلق ہوں گے۔ استانی تصویروں کا ایک نقشہ دیوار کے ساتھ لٹکاتی ہے اور طلبا سے بار بار کہتی ہے کہ تصویر میں دکھائی گئی چیز کا نام لیں۔ ہر تصویر کے نیچے ایک فقرہ لکھا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر تصویر میں گیند دکھائی گئی ہے تو اس کے نیچے لکھا ہوگا "یہ احمد کی گیند ہے" چیز کا نام بتانے کے بعد طالب علم اس فقرے کو پڑھے گا۔ اس طور پر بہرے بچے نہ صرف ہونٹوں کی حرکات پڑھنے میں مشق حاصل کر لیتے ہیں بلکہ بولنے اور تحریری علامتوں کے ساتھ الفاظ کو منسوب کرنے میں بھی۔

کلارک اسکول کے استادوں کو بعض اوقات عجیب و غریب تدبیروں سے کام لینا پڑتا ہے مثلاً ایک بچہ "ک" کی آواز پیدا کرنے سے قاصر ثابت ہوا۔ وہ "ٹ" کی آواز بخوبی پیدا کرتا تھا، استانی نے ایک بڑی کھانڈ کی ٹکیہ لی اور اسے بچے کے منہ میں رکھ دیا، اب اسے کہا گیا کہ بار بار "ٹ" کی آواز پیدا کرے۔ اب گولی زبان کے پچھلے حصے پر اس طرح چپکا دی گئی کہ زبان نیچے دب گئی اور "ٹ" کی بجائے "ک" کی آواز پیدا ہونے لگی۔

یائے معروف کی آواز پیدا کرنا بہرے لوگوں کے لیے عموماً مشکل ہوا کرتا ہے۔ کلارک اسکول کا ایک بچہ "ای" کی آواز نکالنے میں بری طرح ناکام رہا، استانی نے ہر ممکن کوشش کی اور بچے نے بھی اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی مگر کچھ کامیابی نہ ہوئی، آخر سردیوں کے موسم میں ایک روز جب یہ بچہ کھیل کے میدان میں گھوم رہا تھا، استانی کے کان میں دفعتہً "ای ۔۔۔۔ ای ۔۔۔۔ ای" کی آواز آئی۔ اس نے دیکھا کہ بچہ فرطِ مسرت میں یہ آواز نکال رہا ہے، استانی برف میں بھاگی بھاگی بچے کے پاس گئی اور اسے بازوؤں میں پکڑ کر بولی "شاباش، یہ آواز نکالے جاؤ اور اسے مت بھولو" اگلے دن جماعت کے کمرے میں بچے نے یہ آواز آسانی سے پیدا کر لی۔

بولنا سیکھنے میں تقریر کا ترنم ایک اہم درجہ رکھتا ہے، ہر فقرے کا اپنا مخصوص زیر و بم اور طرز ادا ہوتی ہے جس کے بغیر سننے والا فوری طور پر اس کا درست مطلب اخذ نہیں کر سکتا۔ بہرے بچے براہ راست بات چیت کا یہ ترنم نہیں سن سکتے، ہاں برقی آلوں کی مدد سے وہ اس کی مرتعش لہروں کو محسوس کر سکتے ہیں، لیکن اس ارتعاش کو مطالب کا جامہ پہنانا سیکھے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ بچے آنکھوں سے استانی کے ہونٹوں کو ہلتے دیکھتے ہیں اور برقی آلے ان کے کانوں میں آواز کی ایک ہلکی بڑبڑاہٹ کی لہر بھیجتے ہیں۔ آنکھ اور کان کے اس باہم اشتراک عمل کے بعد وہ آواز کی لہروں کے ترنم کو سمجھنے اور اسے خود پیدا کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

بلا ضرورت باتیں

بہرے بچے گویائی سے محرومی کا جو روح کش بوجھ محسوس کرتے ہیں، اس کا کچھ اندازہ اس بے محابا شور و غل سے ہو سکتا ہے جو وہ گویائی سے آشنا ہونے کے بعد مچانے لگتے ہیں۔ کلارک اسکول میں پڑھنے والے بہرے بچے ۹ — ۱۲ سال کی عمر میں اس قابل ہو جاتے ہیں کہ ضروری خیالات کو بلا تکلف لفظوں کا جامہ پہنا دیں۔ اس عمر کے بچوں کو کھانے کے کمرے میں اکٹھے بٹھا دو تو کان پڑی آواز سنائی نہ دے گی، چوں کہ انہیں اپنے اونچی آواز سے بولنے کا احساس ہونا ممکن نہیں۔ اس لیے یہ کہرام ان کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتا۔ ادھر سے نئی سیکھی ہوئی گویائی کا شوق ہر دل میں چٹکیاں لے کر اسے دوسروں سے زیادہ باتیں کرنے پر ابھارتا ہے۔ ایک دوپہر کھانے کے وقت جب یہ بچے یوں شور مچانے میں مصروف تھے، استانی نے ایک ملاقاتی سے بڑے پُرسوز لہجے میں کہا: ہم ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ ان بچوں کو بولنا آ جائے لیکن اس کہرام کو سن کر میرے دل میں بعض اوقات یہ خیال آتا ہے کہ شاید انہیں بولنا نہ سکھانا ہی بہتر تھا۔

شور و غل کا یہ سماں صرف کھانے کے کمرے ہی تک محدود نہیں رہتا، برآمدوں کمروں، اور کھیل کے میدانوں میں غرض جہاں بھی یہ چند بچے اکٹھے ہوتے ہیں اسی جگہ اونچی آواز سے بولنے لگتے ہیں لیکن یہ کیفیت زیادہ عرصہ جاری نہیں رہتی، جوں ہی یہ بچے بارہ تیرہ سال کی عمر سے آگے بڑھتے ہیں

اور ان کا ذہنی شعور وسعت اور گہرائی میں بڑھتا ہے، وہ دفعتہً اس طرح گم گو ہو جاتے ہیں جیسے کسی نے
منہ زور گھوڑے کی باگیں کھینچ لی ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذہنی پختگی کے ساتھ خیالات میں وسعت
اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن زبان ان خیالات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ ناطق بچوں اور نوجوانوں
کی صورت میں معاملہ جداگانہ ہے وہ جوں جوں ذہنی پختگی حاصل کرتے ہیں اس کے ساتھ ہی ساتھ
اردگرد کے ماحول سے ضروری الفاظ و فقرات کا ذخیرہ بھی اخذ کرتے جاتے ہیں، بہرے بچوں کے لیے
اردگرد کا ماحول قبرستان کے سکوت سے کم نہیں، وہ جو الفاظ و محاورات سیکھتے ہیں مصنوعی امداد
کے ذریعہ اور آلات صوت کی کٹھن مشق کے بعد سیکھتے ہیں، جہاں یہ مصنوعی سہارے موجود نہ ہوں
وہاں ان کے لیے بامعنی تقریری اظہار کا حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

بہرے بچوں میں بعض ذہنی طور پر بہت ذہین واقع ہوتے ہیں، اگر ان کی زبان ان کے دل کا ساتھ
دیتی تو وہ علمی اور فنی دنیا میں بڑا درجہ پاتے۔ مگر زبان کا تہیہ از قدم قدم پر ان کے خیالات کے
گھوڑے کی باگیں اس زور سے کھینچتا ہے کہ بے چارے بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں، چناں چہ
جس قدر کوئی بہرا بچہ زیادہ ذہین و فطین ہوگا اسی قدر اس کی بات چیت کم سمجھ میں آئے گی۔ بکلا
اسکول کے بچوں کا ایک گروہ بوسٹن میں بیس بال کا میچ دیکھ کر واپس آیا۔ ان میں سے جارج
نامی ایک لڑکا بھاگا بھاگا استانی کے پاس آیا، اس کا چہرہ اور آنکھیں خوشی سے تمتما رہی تھیں
اس نے فرطِ جوش میں یک دم آوازوں کی ایک بوچھاڑ منہ سے نکالی۔ استانی کے پاس ایک ملا
بھی بیٹھا تھا اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ استانی نے ذرا خفگی کے لہجہ میں کہا: جارج میں جانتی ہوں
کہ تم الفاظ کو بہتر طور پر ادا کر سکتے ہو۔ بولنے میں اس گردن توڑ تیزی سے آخر کیا حاصل؟ اس
جارج ذرا ٹھٹکا اور اس نے ذہن میں اپنے الفاظ کو تولنا شروع کیا۔ اب اس نے آہستہ
کر کہا: "ولیم نے ایسے زور کی ہٹ لگائی کہ گیند میدان سے باہر چلا گیا۔ مگر آخر بوسٹن نے اننگ
اننگ میں فتح حاصل کر لی۔"

جارج کے چلے جانے کے بعد ملاقاتی نے کہا: ۔ یہ لڑکا کوشش کرنے سے صاف بولا

علوم وہ زبان کو بے قابو کیوں ہونے دیتا ہے، انسانی نے کہا کہ اس کی تیزی طبع اس کے لیے
بن رہی ہے۔ اپنے ہم عمروں میں یہ سب سے ذہین بچہ ہے۔ اس کا ذخیرہ الفاظ بھی ان سب سے
دہ ہے۔ مگر خیالات کی برق رفتاری اس کی زبان کو بے قابو بنا دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ
ں کی سماعت پورے طور پر زائل ہو چکی ہے۔ اگر اس نے اس جگہ زبان پر قابو پانا اور الفاظ کو
ف طور پر ادا کرنا نہ سیکھا تو یہ ہائی اسکول اور کالج میں تعلیم کس طرح حاصل کرے گا!

خیرہ الفاظ کی تکمیل

اگرچہ اوّل اوّل الفاظ و فقرات کا ذخیرہ کلی طور پر انسانی کے ہونٹوں کی حرکات پڑھ کر اخذ کیا جاتا
، لیکن یہ عمل نہ صرف حد درجہ تھکا دینے والا ہے، بلکہ اکیلے اس پر سہارا کرنے سے ذخیرہ
رہ الفاظ ہاتھ نہیں لگ سکتا، اس لیے ہر استانی کوشش کرتی ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو بچے
پنے طور پر بھی چھپے ہوئے الفاظ اور تصویروں کی مدد سے نئے الفاظ اور فقرے اخذ کرنے لگیں
ل اول یہ زائد مطالعہ تصویری کہانیوں کی شکل میں ہوتا ہے، بعد میں رفتہ رفتہ ہر طرح کی کتابیں اور
لے پڑھے جانے لگتے ہیں، بہرے بچے کمرۂ جماعت کی پڑھائی کے علاوہ جو الفاظ و فقرات
ھتے ہیں وہ انہی ذریعوں سے سیکھتے ہیں۔ ایک سمجھ دار استاد بچے کے مخصوص رجحانات
نپ کر ایسی کتابیں اور رسالے اس کے ہاتھ میں دیتا ہے جو اس کے حسب حال ذخیرہ الفاظ
بھرپور ہوں۔

استاد یہ بھی جانتے ہیں کہ ہونٹوں کی حرکات پر مسلسل توجہ لگائے رکھنے سے کتنی جلدی ذہنی
ن پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد قصے سنانے اور ہنسی
ں کا کوئی موقع پیدا کر دیتے ہیں۔ جونہی انسانی نے دیکھا کہ بچوں کے چہروں پر بے کیفی کے آثار
ہو رہے ہیں، اس نے فوراً ایک قہقہہ کا سامان پیدا کر دیا۔ بچے کھل کھلا کر ہنسے۔ چند ادھر
ر کی باتیں ہوئیں اور پھر نئے سرے سے ہونٹوں کی حرکات کا مطالعہ شروع ہو گیا۔
ی افق کی تدریجی توسیع :۔ کلارک اسکول اپنے طریقہ تدریس کی بنیاد بڑی سختی سے

اس تعلیمی اصول پر رکھنا ہے کہ معلوم سے نامعلوم کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے۔ بچوں کو پہلے ان چیزوں کے نام سے واقف کرایا جاتا ہے جو وہ دن رات گھر میں دیکھتے ہیں، پھر ان چیزوں کی باری آتی ہے جو گھر کے ارد گرد ہوں۔ یہ دائرہ یوں ہی رفتہ رفتہ وسیع ہوتا جاتا ہے، بچے اپنے شہر کے متعلق سب کچھ جان چکتے ہیں تو اپنی ریاست کا مطالعہ شروع کرتے ہیں پھر اپنے ملک کا اور آخر میں دنیا کا۔ کلارک اسکول مطالعۂ عالم پر بہت زور دیتا ہے۔ یہ مطالعہ نہ صرف کتابوں، تصویروں، فلموں، رنگین سلائڈوں اور لیکچروں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ سیر و سیاحت کے ذریعہ بھی۔ کلارک اسکول کوشش کرتا ہے کہ اس کا ہر طالب علم سیاح بن جائے۔

اس مطلب کے لیے فلموں اور رنگین سلائڈوں سے بہت کام لیا جاتا ہے، جو لوگ بیرونی ممالک سے آئیں اور وہ ان ملکوں کی زندگی کے متعلق رنگین سلائڈیں بھی ہمراہ رکھتے ہوں، ان سے لیکچر کرنے کی درخواست کی جاتی ہے۔ مثلاً ایک صاحب سوئٹزرلینڈ کی سیاحت سے واپس آئے تھے انہوں نے اس خوب صورت پہاڑی ملک کی رنگین سلائڈیں بھی تیار کی تھیں۔ انہیں سوئٹزرلینڈ کے حالات بتانے کی درخواست کی گئی۔ آواز کے بارے میں انہیں کہا گیا کہ بلند آواز سے بولنا کچھ فائدہ نہ دے گا کیوں کہ امدادی آلوں کے باوجود بچے آواز کی بھنبھناہٹ کے سوا کچھ نہ سن پائیں گے، یہ بھنبھناہٹ انہیں فقروں کے مخصوص اتار چڑھاؤ کی خبر دے گی، وہ الفاظ ہونٹوں کی حرکات سے اخذ کریں گے اس لیے اہم بات آواز کی بلندی نہیں بلکہ الفاظ کی وضاحت اور ان کی درست طبعی ادائیگی ہے۔

مقرر استاد کی ڈیسک کے سامنے جا بیٹھا۔ مائیکروفون عین اس کے سر پر لٹک رہا تھا۔ بچوں نے اپنے اپنے ایرفون درست کیے اور مقرر کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں، یہ ان کی قوت سماعت کا امتحان تھا۔ وہ ایک اجنبی آواز کو سننے والے تھے۔ ان کی نگاہ اور سماعت کو مل کر اس کے الفاظ کو سمجھنا تھا آخر لیکچر شروع ہوا۔ پُر توجہ سامعین نے تقریر کو غیر متوقع طور پر پُر تاثیر بنا دیا، بچوں کے چہروں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ سوئٹزرلینڈ کے ہوش ربا قدرتی مناظر کی کہانی بڑی لذت کے ساتھ سن رہے ہیں، جب لیکچر ختم ہوا تو ایک لڑکی نے بڑے پُر اشتیاق لہجہ میں پوچھا کیا آپ میٹر ہارن چوٹی پر

جڑے تھے۔

نصاب کا تنوع

کلارک اسکول میں صرف بولنا اور لکھنا پڑھنا ہی نہیں سکھایا جاتا بلکہ دوسرے امریکی مدرسوں کی طرح اس کے نصاب میں رنگارنگ مضامین شامل ہیں، ان کے علاوہ آرٹ، دست کاری، ہسکاؤٹنگ خانہ داری اور طرح طرح کی کھیلوں کا اہتمام بھی ہے، یہ مختلف مضامین اور سرگرمیاں نہ صرف ذخیرہ الفاظ اور فقرات میں اضافہ کا موجب ہوتی ہیں۔ بلکہ ابہر کی زندگی میں بھی مفید ثابت ہوتی ہیں، اس میں کلام نہیں کہ مدرسہ چھوڑنے کے بعد کلارک اسکول کے طلبا کو کچھ عرصہ تک دقت کا سامنا ہوتا ہے، کیوں کہ وہ مدرسے کے منضبط ماحول سے نکل کر یک دم کشاکش حیات کے بھنور سے دوچار ہوتے ہیں لیکن وہ عموماً جلد حالات سے نباہ کرنا سیکھ جاتے ہیں، کچھ سال ہوئے فارغ التحصیل طلبا کے نام ایک سوال نامہ جاری کیا گیا تھا۔ اس کے جواب میں کئی طلبا نے کہا کہ کھیلوں کی مہارت ان کے لیے بڑی مفید ثابت ہوئی، اس کی بدولت ان کی بہت سی دوستیاں پیدا ہوئیں بعض طلبا نے کہا کہ کیا اچھا ہوتا اگر مدرسہ انہیں کار چلانا اور ناچنا بھی سکھا دیتا، چنانچہ کلارک اسکول میں اب کار چلانا بھی داخل نصاب ہے اور ہر سال کئی بہرے بچے کمال احتیاط کے ساتھ کار چلانے کا فن سیکھ رہے ہیں، اس طرح ناچ بھی اب داخل نصاب ہے اور ہر طرح کے ناچ سکھائے جاتے ہیں۔

استاد ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ بہرے بچے کسی ایسے لفظ سے بے خبر نہ رہیں جو روزمرہ کی زندگی میں ناگزیر ہو، اس کے باوجود بعض اوقات اچانک معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہت عام لفظ نگاہ سے چھپا رہا مثلاً پچھلے سال آخری جماعت کے طلبا میں سے کسی کو بھی صابن کے ریزوں کا نام معلوم نہ تھا۔ چونکہ گونگے بچے بچپن کے آغاز میں اشاروں سے باتیں کرنا سیکھ جاتے ہیں اس لیے بولنا سکھانے اور اس کی مشق کرنے کی ایک شرط یہ ہے کہ اشاروں سے کام لینا یکسر بند کر دیا جائے۔ کلارک اسکول کے طلبا کو سختی سے ہدایت ہے کہ جماعت کے کمرہ میں اور اس سے باہر بات کرتے وقت ہاتھ پتلون کی جیبوں میں رکھیں یا نیچے لٹکائے رکھیں، تاکہ اشارہ کرنے کی اکساہٹ ختم ہو جائے۔

پیچھے کہا جا چکا ہے کہ بہرے بچے آنکھ اور کان کے تعاون کے ساتھ ہی الفاظ کو درست طور پر سمجھ اور ادا کر سکتے ہیں۔ سننے کی قوت خواہ کتنی ہی تباہ کیوں نہ ہو چکی ہو پھر بھی اس کے اتنے آثار ضرور باقی رہتے ہیں کہ سمعی آلوں کی مدد سے آوازوں کی بھنبھناہٹ کان میں پہونچ جائے۔ یہ بھنبھناہٹ جو آواز کے اتار چڑھاؤ کی خبر دیتی ہے الفاظ کی درست ادائگی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ ایک روز کلارک اسکول کا ایک لڑکا جو انجینئرنگ ڈرائنگ کا طالب علم تھا کھیل کے میدان میں ٹہل رہا تھا۔ اس وقت اس نے سمعی امداد کا آلہ اتار رکھا تھا، اتفاقاً ایک واقف کار سے ملاقات ہو گئی، یہ شخص لڑکے کی کوئی بات نہ سمجھ سکا، کیوں کہ اس کے نقطے بالکل غیر متوازن اور بے تشکل تھے۔ جونہی اسے اس بات کا احساس ہوا اس نے جھٹ ایک چھوٹا سا آلہ جیب سے نکال کر کانوں پر چسپاں کیا۔ اب فوراً اس کے الفاظ ہموار اور بامعنی ہو گئے، اس سے پہلے وہ خود اپنی آواز کے اتار چڑھاؤ سے بے خبر تھا۔ اس لیے الفاظ کو صحیح صوتی قالب نہ دے سکتا تھا۔

کام کی مشکل نوعیت

بہروں کو بولنا سکھانا کوئی آسان کام نہیں۔ کلارک اسکول اس حقیقت کو ہر وقت پیش نگاہ رکھتا ہے۔ مدرسے کا سارا لائحہ عمل اس مفروضہ پر تیار کیا گیا ہے کہ گونگوں کو گویائی عطا کرنا اس صورت میں ممکن ہے جب وہ صرف جماعت کے کمرہ ہی میں نہیں بلکہ اٹھتے بیٹھتے ہر وقت بولنے کی مشق کریں۔ مدرسے کی اعزازی فہرست میں نام درج کرانے کے لیے ہر طالب علم کو اس اصول کی کڑی پابندی کرنا پڑتی ہے۔ اعزازی فہرست میں نام کا رہنا ایک ایسا امتیاز ہے جو ہر طالب کو عزیز ہے، اسے عزیز تر بنانے کے لیے ہفتہ میں ایک بار مدرسے کے تمام طلبا اور اساتذہ کی موجودگی میں پرنسپل ان طلبا کے نام پڑھ کر سناتا ہے جنہوں نے مدرسے میں قدم رکھنے کے بعد ایک مرتبہ بھی اشارے سے کام نہیں لیا۔ اگر کسی لڑکے کے متعلق کوئی استاد رپورٹ کر دے کہ اس نے یہ فروگذاشت کی ہے تو اس کا نام اسی وقت اعزازی فہرست سے کاٹ دیا جاتا ہے۔ یہ اعزازی فہرست گویا ہفتہ وار بدلتی رہتی ہے۔ ہفتہ بھر جو طالب علم اشارے سے متعلق کام نہ لے اس کا نام اس میں درج ہو جاتا ہے۔

اور جو ایک بار بھی چوک جائے اس کا نام خارج ہو جاتا ہے۔

اسکول کے فارغ شدہ طلبا نے سوالنامے کے جو جواب دیے ان میں دو باتوں کا بار بار ذکر تھا۔ پہلی یہ کہ ایک بہرہ آدمی دنیا میں اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتا ہے دوسری یہ کہ اس اکیلے پن کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑی ہمت چاہیے، اکثر سابق طلبا نے بعد میں آنے والوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ طالب علمی کے زمانے میں کانوں والے لوگوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مراسم پیدا کریں، تاکہ انہیں مختلف لوگوں کے ہونٹ پڑھنے کی مشق ہو جائے۔ اور یوں وہ پوری خود اعتمادی کے ساتھ زندگی میں قدم رکھ سکیں۔ اسکول کے ایک پرانے شاگرد نے جو کیمسٹری میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کر کے اب ایک صنعتی کمپنی کی لیبارٹری میں ملازم ہے موجودہ طلبا کو یہ مشورہ دیا: ۔جو بہرہ شخص دوسرے سننے والے لوگوں سے کنارہ کش رہے گا وہ زندگی میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ خواہ اس نے گویائی اور لب خوانی میں کتنی ہی مہارت کیوں نہ پیدا کر لی ہو۔ ایک اور نئے گریجوایٹ نے جس نے امتیاز کے ساتھ ڈگری حاصل کی تھی اپنے مدرسے کے طلبا کو مشورہ دیا کہ جتنے لوگوں سے مراسم قائم کیے جا سکیں ضرور قائم کرو۔ تمہیں اس طرح بے شمار لوگ ملیں گے جو کسی نہ کسی رنگ میں مدد کریں گے۔

اس قسم کے مشوروں کی روشنی میں کلارک اسکول کے پرنسپل کی بیوی نے اب یہ طریق اختیار کیا ہے کہ وہ بہرے بچوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں اور اپنے بیٹے کے ہم مدرسہ بچوں کی ٹولیوں کو باہم چائے پر بلاتی رہتی ہیں، اس سے بہرے بچوں کو کانوں والے ہم عمروں کے ساتھ مل بیٹھنے اور دوستی پیدا کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اسی طرح پرنسپل اور انتظامیہ کونسل کے اراکین بھی ان بچوں کو مجلسی تقریبوں پر بلانے لگے ہیں، اساتذہ بچوں کی اس بات کے لیے بھی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ وہ فراغت کے اوقات میں باہر گھومنے نکل جائیں اور ہمدرد طبع لوگوں سے بات چیت کریں پچھلے سال اسی طرح کچھ بچے تفریح کی باغ میں نکل گئے اور دیکھا کہ کچھ سرخ ہندی اپنے قومی لباس کا ٹھاٹھ جمائے بیٹھے ہیں، بہرے بچوں نے آگے بڑھ کر ایک نیک مزاج ہندی سے بات چیت شروع کی

معلوم ہوا کہ شہر اپنی سہ صد سالہ جوبلی منا رہا ہے اور سرخ جھنڈیوں کا یہ دستہ اسی تیاری کا پیش خیمہ ہے
واپسی پر طلبا نے پرنسپل سے درخواست کی کہ ان کے نئے دوست کو کھانے پر بلایا جائے۔ مگر اس کا نام
اور پتہ کیا ہے؟ پرنسپل نے پوچھا۔ طلبا نے نہ صرف اس کا نام و پتہ لکھ رکھا تھا بلکہ اس کا فوٹو بھی لیا تھا۔
نام اور پتہ دیکھ کر پرنسپل نے کہا:- اوہو۔ یہ تو نارتھمپٹن کے میئر ہیں، چناں چہ وہ کھانے پر آئے
اور جب سال کے خاتمہ پر طلبا کو سندیں ملیں اس وقت بھی صدارت کے لیے تشریف لائے۔

ایک عظیم المرتبت سابق معلمہ

دنیا کے گوشے گوشے سے لوگ کلارک اسکول کو دیکھنے آتے رہتے ہیں، لیکن ان میں سب سے
باقاعدہ تعلق رکھنے والی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سابق صدر کی بیوی مسز کالون کولج ہیں، کوئی
نصف صدی گذری یہ کلارک اسکول میں پڑھاتی تھیں، انہی دنوں ان کی ملاقات مسٹر کولج سے ہوئی
جو ایک نوجوان وکیل تھے اور قریب کے مکان میں رہتے تھے۔ کلارک اسکول کے بچوں نے اپنی استانی
کے معاشقہ اور پھر اس کی شادی کو بڑی دل چسپی سے دیکھا، بعد میں جب مسٹر کولج اور ان کی بیوی
کو سیاسی عظمت نصیب ہوئی تو بھی مدرسے کے بچوں نے اس دل چسپی کو برقرار رکھا۔ مسز کولج نے بھی
گذشتہ پچاس سال میں کلارک اسکول کے ساتھ برابر رشتہ قائم رکھا۔ وہ کئی سالوں تک اس کے
انتظامی بورڈ کی صدر رہیں اور آج بھی اعزازی صدر ہیں۔

مسز کولج کو کلارک اسکول کے معاملات کے ساتھ گہری دل چسپی ہے اور کوئی معاملہ ان کے
مشورہ کے بغیر طے نہیں پاتا۔ ایک روز وہ کسی باہر کے آدمی سے مدرسہ کے متعلق بات چیت کر رہی
تھیں۔ اس نے پوچھا آپ کی رائے میں کس قسم کے استاد اس مدرسہ میں پڑھانے کے لیے موزوں
ہیں؟ مسز کولج نے بلا تکلف جواب دیا:- ایسے استاد جو اس بات میں ایمان رکھتے ہوں کہ ہر بہرہ
گویائی حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بڑے جذبے کے
ساتھ کام کرے۔ ملاقاتی نے کہا: مگر میں نے استانیوں کو پڑھاتے ہوئے دیکھا ہے، یہ بڑا کٹھن کام
کیا وہ تھک ہار کر بددل نہیں ہو جاتیں؟ ہرگز نہیں، مسز کولج نے جواب دیا۔ ان استانیوں کے

قدم قدم پر فتح کا انعام موجود ہے، جونہی کوئی بچہ ایک مشکل آواز یا ایک ٹیڑھے لفظ کو ادا کرنا سیکھ جاتا ہے استانی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے ایک نئی دنیا فتح کر لی، یہ احساس ہر قسم کی بدنی اور ذہنی کوفت کو دور کرنے کے لیے کافی ہے۔

ملاقاتی نے پوچھا:- آپ کے خیال میں مجھے اس مدرسے سے کیا پیغام لے کر جانا چاہیے۔ مسز کولج نے جواب دیا لوگوں کو اس مدرسہ کی تاریخ سے آگاہ کیجیے۔ اس مدرسہ کی تاریخ دراصل تقریری طریقہ تدریس کی تاریخ ہے۔ دنیا کو یہ بھی بتایئے کہ ہم نے سمعی امدادوں کے ذریعہ کس طرح کم زور سے کم زور سماعت والے بچوں کو بھی بولنا سکھایا ہے۔ ان طریقوں کو جاننے والے استادوں کی جو ضرورت ہے لوگوں کو اس سے آگاہ کیجیے۔ نیم ناشنیدہ سماعت کے بچے کھچے ریزوں کی تربیت کرنے کا طریقہ جو ہم نے ایجاد کیا ہے نیا ہے لیکن سائنس دان دیر سے اس حقیقت سے باخبر تھے کہ سماعت کی کلی ناشنوائی نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ لیکن ان بچے کھچے ریزوں کو پہلے بے کار سمجھا جاتا تھا۔ ہم نے ان سے کام لینا سیکھا ہے، ڈاکٹروں اور سائنس دانوں کو یہ بکثرت عرصہ سے معلوم تھا کہ جو لوگ گویائی سے محروم رہتے ہیں ان کے آلات صوت اکثر حالتوں میں بالکل درست ہوتے ہیں، وہ بولنا اس لیے نہیں سیکھ سکتے کہ ان کے کان ان کے ذہنوں تک کسی انسانی آواز کو نہیں پہنچاتے، جدید ذہنی آزمائشیں جو لسانی ضرورتوں سے مبرا ہیں، یہ ثابت کر چکی ہیں کہ گونگے لوگ ذہانت کے معاملہ میں ناطق لوگوں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ صدیوں تک یہ سیاہ بخت لوگ تعلیمی سہولتوں سے محروم رہے۔ حتیٰ کہ سائنسی تحقیق نے انہیں کم و بیش دوسرے انسانوں کی سی سہولتیں بہم پہنچائیں۔

ابتدائی کوششیں

یورپ میں بہروں کو پڑھانے کی سب سے پہلے کوششیں فرانس کے پادریوں کی طرف سے شروع ہوئیں، ایک پادری نے ایک اشاراتی زبان جاری کی۔ انگلی کا ہر مخصوص اشارہ کسی خیال یا لفظ کو ظاہر کرتا تھا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بہروں کے لیے سب سے پہلا مدرسہ ۱۸۱۷ء میں ریاست کنیٹی کٹ کے صدر مقام ہارٹ فورڈ میں جاری کیا گیا، اس مدرسہ میں فرانسیسی اشاراتی زبان اور

انگشتی ابجد سے کام لیا جاتا تھا۔ اگلے پچاس برس تک امریکہ میں صرف یہی طریقہ تدریس جاری رہا۔

تقریری طریق تدریس جس میں لب خوانی اور گویائی سے سارا کام لیا جاتا ہے پچھلے تیس برس کی پیداوار ہے، یہ طریقہ طرح طرح کے عجیب و غریب آلوں سے کام لیتا ہے، امریکہ کی شہرہ آفاق بیل ٹیلیفون کمپنی نے ایک برقی مقیاس السّماعت ایجاد کیا ہے جس کی مدد سے بالکل صحیح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بہرے بچے کی سماعت کو کس قدر نقصان پہونچا ہے، اس طرح بچوں کو تین گروہوں میں بانٹا جاتا ہے۔ یعنی :-

(۱) اونچا سننے والے (۲) نیم بہرے اور (۳) بہت زیادہ بہرے

اول الذکر بچے معمولی سمعی امدادوں کے استعمال سے عام مدرسوں میں تعلیم حاصل کر سکتے ہیں جبکہ دوسرے دونوں گروہوں کے بچے مخصوص مدرسوں میں بھیجے جاتے ہیں۔

سمعی ریڈیوں کی افادیت

مقیاس السماعت اگرچہ نقل سماعت کے لحاظ سے درجہ بندی کر دیتا ہے لیکن وہ اس بات کی خبر نہیں دیتا کہ سماعت کے بچے کھچے ریزے کس قدر افادیت رکھتے ہیں۔ یا ان سے کیا اور کس طرح کام لیا جا سکتا ہے، یہ کام استاد کی ذاتی کاوش اور محنت سے کرنے کا ہے، اس کی مثال تقریباً وہی ہے جو ایک سراغرساں کے کام کی سراغ رساں معمولی کھوج کو دیکھ کر قیاس اور قیافہ کی مدد سے ایک پوری کہانی وضع کرتا ہے اور اسے واقعات کی کسوٹی پر پرکھتا ہے، بالکل اسی طرح بہروں کو پڑھانے والا استاد ہر بچے کے متعلق حسب حال طریقہ اختیار کرتا ہے تاآں کہ وہ گویائی کی نعمت حاصل کر لیتا ہے۔

کلارک اسکول میں کئی ایسی مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں جہاں غیر معمولی طور پر مایوس کن طلبا نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کر لی۔ مگر ایسی مثالیں بھی ساتھ ہی موجود ہیں جہاں بظاہر امید افزا حالتوں میں معمولی کامیابی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ مثلاً جان نامی ایک لڑکا اس مدرسے میں آیا۔ اس کی سماعت چھ سات برس کی عمر میں ضائع ہوئی تھی۔ لگاتار کئی سالوں تک استانی اس کی آنکھ اور کان کو ایک ساتھ کام کرنے کی تربیت دیتی رہی، آخر کار وہ اس درجہ تک پہونچ گیا گویا وہ اونچا سننے والوں میں سے ہے اور پبلک اسکول میں داخل ہو گیا اس کے برعکس ایک اور خوش شکل بچہ

مقیاس السماعت کی رو سے اس بچے کی سماعت جان کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ اس کی آواز رسیلی اور اس کے جملوں کا اتار چڑھاؤ بالکل قدرتی تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ جہاں جان ابتدائی بچپن میں ندرت سماعت رکھتا تھا، اس بچے کو یہ بات کبھی بھی نصیب نہ ہوئی تھی، چنانچہ یہ لڑکا جان کی سی قوت گویائی حاصل نہ کر سکا۔

کلارک اسکول میں سمعی امدادوں کے متعلق تحقیقی کام لگاتار جاری ہے تحقیقی کام زیادہ تر دو سمتوں میں پیش قدمی کر رہا ہے۔ اول یہ کہ کوئی بچہ زیادہ سے زیادہ کس حد تک بہرہ ہو سکتا ہے، دوسرے یہ کہ انتہائی بہرہ پن کے باوجود وہ سمعی آلوں سے کیا فائدہ حاصل کر سکتا ہے، حال ہی میں جو سمعی آلے ایجاد کیے گئے ہیں وہ ہر قسم کی آواز کو اس حد تک بلند کر دیتے ہیں جو بچوں کے کانوں کو گو نہ پہونچائے بغیر صاف اور واضح گونج پیدا کر دے۔ کلارک اسکول کے بیس کمرہ ہائے جماعت میں اب پرانے آلوں کی کی بجائے یہ نئے آلے نصب کیے جا چکے ہیں۔

کلارک اسکول میں ہر طبقہ کے بچے داخل ہونے آتے ہیں، داخلہ کی شرائط بالکل سادہ ہیں، بچے کی عام صحت اچھی ہونی چاہیے، اس کی عمر اتنی ضرور ہونی چاہیے کہ وہ مدرسے جانے کے قابل ہو اور اس کا بہرہ پن اس حد تک بڑھا ہونا چاہیے کہ کلارک اسکول میں داخلہ کے سوا اسے چارہ نہ ہو۔ ریاست ماساچوسٹس کے بچوں کو دوسروں پر ترجیح دی جاتی ہے، ان بچوں سے کوئی فیس وصول نہیں کی جاتی، کیونکہ ان کی فیس ریاست اپنے خزانے سے ادا کرتی ہے۔

ریاست ہائے متحدہ میں عام انسانی صحت نے جو ترقی کی ہے اس کا اثر کلارک اسکول کے اعداد و شمار پر بھی پڑا ہے۔ اس وقت جو بچے یہاں داخل ہیں ان میں سے صرف پندرہ فی صد ایسے ہیں جن کی سماعت کسی بیماری کے باعث دفعتہً زائل ہو گئی، ایک پشت پہلے ایسے بچوں کا تناسب بچیس فی صد ہوا کرتا تھا۔ اب نئی دواؤں کی ایجاد اور حفظان صحت کی تدبیروں کی ترقی نے قرمزی بخار اور اس طرح کی دوسری بیماریوں کی تباہ کاریوں کو کم کر دیا ہے، جوں جوں بچوں کی دشمن بیماریاں کم ہوتی جا رہی ہیں اسی قدر کلارک اسکول اپنے اصل مقصد سے زیادہ دوچار ہوا جاتا ہے، یعنی ان بدنصیب بچوں کی کس طرح مدد

کی جائے جو پیدائشی بہرے ہیں۔ جو لوگ باہر سے اس مدرسے کو دیکھنے آتے ہیں وہ اس بے پناہ جذبہ ہمدردی اور جوشِ تحقیق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے، جو اس مدرسے کی ساری فضا میں رچا بسا نظر آتا ہے۔ یہ مدرسہ مایوس ماں باپ کو امید کا پیغام دیتا ہے اور سینکڑوں محروموں کو گویائی عطا کر کے ان کی تیرہ بختی کے بوجھ کا بڑی حد تک خاتمہ کر دیتا ہے۔

غرض کلارک اسکول ہر اس شخص کے لیے ایک مثال ہے جو غیر متزلزل ایمان اور بے پناہ ہمدردی اور جاں سوزی کے ساتھ دنیا کے محروموں اور سیاہ بختوں کو رحمت، امید اور روشنی کا پیغام پہونچانا چاہتا ہو۔ کیا رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام لینے والے اس مثال سے سبق لیں گے؟

جمہوریت اور مدرسہ

محمد عبدالعزیز مسلسل نمبر۳

اسلامی مزاج

پاکستان کے قیام میں چوں کہ دین کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اس لیے اس کے ہر شہری میں اسلامی تمدن کی جلوہ نمائی بھی ضروری ہے لیکن اس سے پہلے کہ پاکستان کے ایک عام شہری کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی تقاضوں کا جائزہ لیا جائے ایک غلط فہمی جس کا ہم میں سے ہر شخص بڑی آسانی سے شکار ہو جاتا ہے، ازالہ ضروری ہے۔ اسلامی تمدن اپنے اصول و فروع میں مغربی تمدن سے بالکل مختلف ہے، مغرب میں جن عوامل کو تقویم حیات کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اسلام کے بنیادی اصولوں سے ٹکرا جاتے ہیں، اس لیے ان سے اپنا دامن بچانا ضروری ہے

مغربی تمدن کی ظاہری چمک دمک سے ایک مرتبہ ہر نوجوان کی نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں حتیٰ کہ نیویارک، لندن، پیرس اور ماسکو اس کے توقعات کی آخری منزل بن جاتے ہیں، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مغرب اپنی مستعمرات میں ایک ایسا طبقہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جو مغرب ہی کو فلاحِ دارین کا قبلہ سمجھتا ہے اور وہ بھول جاتے ہیں کہ ان میں سے بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو مشرقی ماحول میں بے دقیع ہی نہیں تباہ کن بھی ہیں، اسلام مسیحیت کی طرح انفرادی نہیں اجتماعی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہو گا کہ انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی، جہاں فرد و جماعت کے دینی اتباع کے بغیر اسلامی معاشرے کی تشکیل ناممکن ہے۔ اس لیے مغرب کی دریوزہ گری سے کہیں زیادہ کارآمد اور مفید باتیں ہمیں خود اس صحیفۂ آسمانی میں مل جائیں گی جسے قدرت نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے رسول عربیؐ پر نازل کیا۔ اس کلام الہٰی کی تدریس ہی سے بچوں میں اسلامی شعور اور اسلامی مزاج پیدا ہو سکتا ہے اور اگر صحیح طور پر انہیں اس کا درس دیا جائے تو

تو کوئی وجہ نہیں کہ انہی بچوں میں جنہیں علامہ اقبال نے "ممولوں" سے موسوم کیا ہے "شاہین کا
اور "عقاب کی نگاہیں" پیدا ہو جائیں۔

آج کل مدرسوں میں دینیات کی تعلیم دی جاتی ہے، لیکن یہ دینیات کی تعلیم رسمی اور مختصر
ہے، پچھلے سال تک تو یہ مڈل میں ایک لازمی مضمون تھا لیکن اس سال سے یہ قید بھی اڑا دی گئی
ہے، اس لیے اب دینیات کی حیثیت مڈل اسکولوں میں بھی وہی ہے جو اس سے پہلے ہائی
اسکولوں میں تھی، صبح کے وقت اسمبلی میں کھڑے ہو کر کسی خوش الحان بچے کا چند آیات قرآنی کا
پڑھ دینا نہ تو بچوں میں کوئی وجدانی کیفیت پیدا کر سکتا ہے اور نہ انہیں سرگرم عمل بنا سکتا ہے
یا اگر دس یا پندرہ منٹ دینیات کے لیے مدرسہ شروع ہونے سے پہلے ہی مخصوص کر دیے گئے
تو اس سے بھی بچوں کو کوئی ایسا فائدہ نہیں پہونچتا، بعض کیا بیشتر اساتذہ اس تھوڑے سے
وقت کو حاضری یا اور دوسرے چھوٹے موٹے کاموں میں صرف کر دیتے ہیں اور جو بفضل خدا زیادہ
مہذب ہوتے ہیں وہ اسے مولویوں کی میراث سمجھ کر اس وقت کو انگریزی یا دوسرے مضامین کی تدر
میں صرف کرتے ہیں، نقصان دونوں صورتوں میں طلبا کا ہوتا ہے اور اس طرح من حیث المجمو
پوری قوم اس سے متاثر ہوتی ہے، اندریں حالات یہ ضروری ہے کہ ارباب تعلیم دینیات کی تدری
کو نصاب کا ایک لازمی جزو قرار دے کر صرف کلام اللہ کے باقاعدہ پڑھانے کا ہر مدرسے میں
اچھے اور موزوں انتظام کی کوشش کریں، یہ ایک ایسا اہم فرض ہے جس کی طرف توجہ دینا
ضروری ہے، ورنہ قوم کی ہمہ اخلاقی، سماجی، سیاسی اور معاشی کمزوری کا عذاب ان کی گردن
جو بچوں کی تعلیم و تدریس کے براہ راست ذمے دار ہیں، میں نے اپنی اس تجویز میں جو یقیناً نئی
ہے۔ بلکہ اس کی آواز مختلف گوشوں سے اٹھتی رہتی ہے صرف کلام اللہ ہی کی تدریس پر اس
زیادہ زور دیا ہے کہ اگر ایک بچہ شروع ہی سے اس کتاب مقدس کے مندرجات سے آگاہ
تو اس میں وہ تمام خوبیاں پیدا ہو جائیں گی جو ایک صحیح اسلامی معاشرے کے لیے ضروری ہیں
نہ تو کوئی فرقہ غیر متفق ہوگا اور نہ کسی کے احساسات و جذبات کو ٹھیس لگے گی اور ہماری بنیادی

.ری ہو جائیں گی۔

اسلامی مزاج پیدا کرنے کی ایک اور صورت جو تدریس کلام اللہ کی صحیح تفسیر کا کام دے سکتی
ہے ہر مدرسے میں ایک ایسے ماحول کا پیدا کرنا ہے، جہاں جھوٹ، مکر و فریب، کینہ، بغض و حسد
لڑائی جھگڑے اور گروہی یا نجی مناز عات کی ہلکی سی پرچھائیں تک نظر نہ آئے، بچہ وہی سیکھتا ہے
جو اپنے بڑوں کو کہتے سنتا ہے اور کرتے دیکھتا ہے، ہم اُس سے، اس سے زیادہ توقع نہیں
رکھ سکتے اور ہمیں اس سے زیادہ توقع کرنی بھی نہیں چاہیے، میرے ایک دوست قصباتی مدرسے
میں کام کرتے ہیں، خاصے پڑھے لکھے آدمی ہیں، لیکن ان کا سب سے بڑا نقص بقول رئیس مدرسہ
یہ ہے کہ خاں صاحب تو ایسے مسلمات ہیں جن کی اس دور میں ضرورت نہیں، آخر ہم بھی تو مسلمان
ہی ہیں۔ مگر ان کے اس ریمارک کے باوجود خاں صاحب مجاہدہ کرتے رہتے ہیں اور اس ماحول میں
بچوں کو یہ بھی بتاتے رہتے ہیں کہ اسلام کا صحیح مفہوم کیا ہے اور یہ کہ اگر قرآن و سنت نبوی کی پیروی
کی جائے تو ہم اپنی موجودہ دشواریوں کو بڑی آسانی سے حل کر سکتے ہیں، لیکن ان کا یہ طریق عمل
ہیڈ ماسٹر کو کبھی نہ بھایا، اس لیے وہ حسب موقع زیر لب اس کی شکایت بھی کر دیا کرتے تھے۔
ابھی کوئی مہینے ڈیڑھ مہینے کی بات ہے کہ عمائدین شہر کے گروہی جھگڑوں اور مجلس انتظامیہ کی
باہمی کشمکش نے ارباب مدرسہ کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا، اس سے ایک ناخوشگوار فضا
پیدا ہو گئی، اور چند حضرات نے مل کر ایک اور مدرسے کی بنیاد ڈالی، اگرچہ اس دوسرے مدرسے کی
بنیاد کسی قومی خدمت کے جذبے کی رہین منت نہ تھی، بلکہ گروہی اختلافات کا نتیجہ تھی، لیکن حب علی
نہ سہی بغض معاویہؓ ہی میں اگر کوئی بہتر کام ہو جائے تو کیا خرابی، میرے دوست خاں صاحب
جیسے لوگوں نے تو اس اقدام کو بھی مذموم نہ سمجھا اور اس خیال سے کہ شاید اس طرح کچھ حالات
اور بہتر ہو جائیں اس تحریک کا مواخذہ نہ کیا۔

ادھر ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسے اپنی "خدمات" پر ایک ڈاکہ سمجھا، حتیٰ کہ انہوں نے اُس مدرسے
میں پڑھنے اور پڑھانے والوں کو "کافر" تو نہیں کہا، لیکن ان کی مخالفت میں گفتنی ناگفتنی سب کچھ

کہہ ڈالا، اب اسکول میں درس و تدریس کی بجائے "اس دشمن" کی بیخ کنی کے منصوبے باندھے جانے لگے، صبح کے اجتماع میں اس کی تنقیص میں دھواں دھار تقریریں ہوئیں، کیوں کہ ایسے وقت میں جب کہ مدرسے کی عزت و ناموس کا سوال پیدا ہو جائے، درس و تدریس سے کہیں زیادہ اہم کام تخریبی منصوبے ہی ہو سکتے ہیں، اس بیچ تم ان دشمنان ملت کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دو" اس پر مستزاد یہ کہ اساتذہ کو یہ ہدایت کی گئی کہ دو دو کے گروہ میں وہ خود شہر والوں سے رابطہ پیدا کر کے انہیں اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کریں، اتفاق سے خان صاحب اس میٹنگ میں موجود نہ تھے اس لیے ان کا نام فہرست میں شامل نہ ہوا۔ بعد میں انہوں نے اپنے ایک ہم کار سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس عظیم ذمہ داری میں فی الحال آپ کو شریک نہیں کیا گیا۔ لیکن خان صاحب تو اس کار خیر میں حصہ لے کر اپنے مدرسی فرائض سے سبک دوش ہونا چاہتے تھے، اس لیے انہوں نے یہ تجویز فرمائی کہ میں ہر طرح آپ لوگوں کے ساتھ ہوں، دو دو کے مختلف گروہ بن چکے ہیں، اب ایک گروہ میرا اور ہیڈ ماسٹر صاحب کا بنا دیا جائے، ہم بھی اس سعادت سے کیوں محروم رہیں" ——— اس کا اثر یہ ہوا کہ یہ تجویز ہی سرے سے مسترد قرار دے دی گئی اور اساتذہ کو اس غیر اسلامی اور غیر انسانی مہم سے نجات مل گئی۔

ہمارے ہر مدرسے میں کم و بیش اس قسم کے واقعات روزانہ ہوتے رہتے ہیں۔ مگر یا تو ہم ان واقعات کی پرواہ نہیں کرتے یا ہم اس قدر بے حس ہو چکے ہیں کہ ان کا ہمارے دل پر برا یا بھلا کوئی اثر ہی نہیں پڑتا، اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض چابک دست اور زیرک و فہیم اساتذہ بھی ہیں جو صبح و شام اسلام اسلام رٹتے رہتے ہیں مگر ان کا کردار اور ان کا عمل اس کے بالکل منافی ہے اور وہ اپنے تقدس کی اس مصنوعی چادر سے اپنی ریاکاریوں کو ڈھانپ دینا چاہتے ہیں جس میں انہیں اکثر کامیابی بھی ہو جاتی ہے، کیا ان حالات میں ہم ایک اسلامی معاشرے کی تخلیق میں کامیاب ہو سکتے ہیں، یا ہم بچوں میں اسلامی شعور اور اسلامی مزاج پیدا کر سکتے ہیں بظاہر حالات تو حوصلہ شکن ہیں لیکن ہمیں اپنی کوتاہیوں کا جائزہ لے کر ایک مرتبہ ان سماجی بیماریوں کے دور کرنے کا عز

ہونا چاہیے، خدا نے چاہا تو یہ کوہ آسا دشواریاں ایک ایک کر کے ختم ہو جائیں گی اور ہم بآسانی زندگی کی ان قدروں کو اپنا سکیں گے جن کے لیے ہم نے اتنی بھاگ دوڑ کی ہے۔ زندہ قومیں پریشانیوں سے گھبرایا نہیں کرتیں، بلکہ راہ کی ہر سختی انہیں اور باحوصلہ بنا دیتی ہے۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی ✽ اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

تقسیم کے بعد برصغیر کے مختلف علاقوں کے مسلمان اپنے قدیم گھر چھوڑ کر اس نئے ملک میں آباد ہو گئے ہیں، اس لیے ان میں کسی حد تک معاشرتی اور لسانی اختلاف کا ہونا ضروری ہے، لیکن اگر امریکہ مختلف اقوام و ملل کو ایک قوم بنا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ رسول عربی ؐ کے پیرو "اسلام" کو اپنی فلاح و بقا کی بنیاد سمجھ کر ان سب کی شیرازہ بندی نہ کر سکیں اور اس میں یقیناً ہمارے مدرسے گراں قدر خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

سماجی یک جہتی سماجی یک جہتی چوتھی اور آخری خدمت ہے جو ہمارے مدرسے پاکستان میں اسلامی جمہوریت کی بقا اور اس کے استحکام کے لیے کر سکتے ہیں۔ کسی معاشرے کی ترقی کے لیے سماجی یک جہتی کا ہونا ضروری ہے، اگر فرد و جماعت میں ایک ہمہ گیر ہم آہنگی اور مطابقت نہ ہوئی تو اس کی تباہی یقینی بلکہ ناگزیر ہو جاتی ہے، ہم بھی اس کلیے سے کسی طرح مستثنیٰ نہیں ہو سکتے کیوں کہ فطرت کا قانون ابدی ہوتا ہے۔ بقول کورے گر۔

"وہ سماج جو اپنے ترکے سے منہ پھیر لیتا ہے، اس میں دراصل کسی مفید اور کارآمد سائنس کام کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی اور ایک ایسا سماج جو اپنے بنیادی اصولوں سے چشم پوشی کر کے سطحی اور زوال پذیر اصولوں کی آڑ میں پناہ لیتا ہے وہ اپنے مدارس کو اخلاقی اقدار سے وابستہ رکھنے کی کیوں کر ہدایت دے سکتا ہے؟"

معاشرہ تو قوم کا دل ہوتا ہے اور جس طرح دل کی حرکت بند ہو جانے سے جسم میں زندگی کی حرارت باقی نہیں رہتی بعینہٖ اسی طرح معاشرے کی زندگی یا قومی ترقی کا انحصار ہوتا ہے اور یہ زندگی معاشرے کی یک جہتی ہی سے عبارت ہوتی ہے، جسے ہم دوسرے الفاظ میں فرد و جماعت کے

باہمی روابط سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ افراد کی ہمہ گیر نشو و نما اور ان کا جماعت کے تابع ہونا سماجی یک جہتی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ اگر مختلف الخیال، مختلف اللون اور مختلف اللسان افراد ایک ایسی جماعت کی تشکیل میں کامیاب ہو جائیں جو ان کے دینی اور ثقافتی سرمائے کی سب سے بڑی امین ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ ایسے سماجی ماحول میں مطابقت اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ہم نے ان اصولوں کو ہی بھلا دیا جن کی بنیاد پر ہم نے حصول پاکستان کی دستوری جنگ کے لیے ہاتھ پاؤں مارے تھے بقول سلیری مدیر "ایوننگ ٹائمز کراچی" اب ہم پاکستان کی خاطر نہیں صوبستان کے لیے لڑنے میں ہیں ــ دراصل اگر غور کیا جائے تو سلیری کے یہ الفاظ ہماری کج روی اور کوتاہ اندیشی کے ترجمان ہیں اور اس ذہنی اور سماجی انتشار کی غمازی کرتے ہیں جو ان دنوں ہماری معاشرتی زندگی کو گھن کی طرح کھا رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج ساری فضا اس طرح مکدر ہو چکی ہے جیسے چراگاہوں سے واپسی کے وقت مویشیوں کے جھنڈ شام کی بھیگی بھیگی فضا کو گرد آلود بنا دیتے ہیں، لیکن یہ غبار تو فضائے بسیط میں پھیل کر تھوڑی دیر بعد غائب ہو جاتا ہے اور خنک خنک ہوائیں ظلم کی اس کثافت کو مانجھ دھو کر صاف ستھری بنا دیتی ہیں مگر انسانی کوششوں سے جو گرد و غبار ہم نے پھیلایا ہے وہ روزانہ کثیف سے کثیف تر ہوتا جاتا ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے ہم نے ایک خدا، ایک قرآن، ایک رسول، ایک تمدن، ایک دین، ایک زبان اور ایک ملک کا نعرہ لگایا تھا اور ایک ایسا نعرہ جس نے ارباب وطن کے لیے صور اسرافیل کا کام کیا۔ جو آواز ایک رہنما کے منہ سے نکلی اس کی صدائے بازگشت سرحد کے فلک بوس پہاڑوں میں بھی گونجتی اور گنگا سندھ کے سرسبز میدانوں میں بھی، کشمیر کی دل فریب وادی میں بھی اور دکن کے ناہموار ٹیلوں میں بھی، جہاں جہاں اس ذہنی یک جہتی کا نتیجہ ہماری وہ سیاسی جیت ہے جو انگریزوں اور ہندوؤں کی مشترکہ مخالفت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ہمیں عنایت کی۔ کیا ہم نے کبھی یہ سوچا کہ اس جیت کی وجہ کیا تھی آخر اس وقت ہم اتنے قوی دشمنوں سے کس طرح جنگ آزما ہوئے۔ اس وقت تو ہمارے پاس سلطنت نہ تھی۔ مال و زر کا بھی کال تھا تیغ و تفنگ اور لاؤ لشکر کا تو تصور بھی ذہن میں نہیں آ سکتا تھا، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ہمیں سب کچھ دیا، سلطنت بھی بخشی، مال و زر بھی۔ فطری وسائل بھی اور لاؤ لشکر بھی

اس جیت کی صرف ایک ہی وجہ تھی کہ اُس وقت ہماری صفوں میں انتشار نہ تھا۔ اور اس وقت ہم بنگالی پنجابی یا سندھی نہ تھے، بلکہ مسلمان تھے۔ اور ہمارا موقف دین اللہ کی روشنی میں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو از سر نو تعمیر کرنا تھا۔ لیکن آٹھ سال کی اس مختصر سی مدت میں ہم نے سیکڑوں قلابازیاں کھائیں۔ اور کچھ اس طرح کہ دین کی تھوڑی بہت پرچھائیں جو ہماری معاشرتی زندگی میں کہیں کہیں نظر آجاتی تھی وہ بھی غائب ہو گئی۔

نظری تنازعے | پچھلے دنوں پاک دستوریہ کا اجلاس "مری" میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں خواص کے نام نہاد نئے نمائندے دستور سازی کے لیے مری کی دل خوش کن فضا میں جمع ہوئے۔ لیکن دستور سازی سے پہلے اپنا اپنا اقتدار قائم کرنے کے لیے اراکین مجلس آپس ہی میں غرض کرتے رہے اور دو چار ابتدائی نشستوں کے بعد اجلاس میں تحریک التوا پیش ہوئی۔ بڑی رد و کد کے بعد اب ۲۲ اگست کو مری میں نہیں کراچی میں جمع ہونے کا فیصلہ ہوا۔ اس سلسلے میں بعض ارباب فکر نے جو بیانات دیے ہیں یا جو تقریریں انہوں نے مجلس دستور ساز میں کیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے۔ مولوی ابو القاسم فضل الحق صاحب جو کسی زمانے میں شیر بنگال کہلاتے تھے اور جنہوں نے ۱۹۴۰ء میں کل ہند مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں وہ قرارداد پیش کی جس کی بنیاد پر ملک تقسیم ہوا، انہوں نے اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے فرمایا:۔

— "ہندو اور مسلمان سے قطع نظر بنگال سے ہم ایک ٹھوس چٹان کی حیثیت سے آئے ہیں"۔ مگر اس کے باوجود حصول اقتدار کے لیے خود وہ اور ان کی جماعت جس طرح سودا بازی کر رہی ہے اس سے ان کی اصول پرستی کے کھوکھلے پن کی وضاحت ہو جاتی ہے اور جب فضل الحق جیسے چابک دست سیاستدان ذاتی اور گروہی مفاد کے پیش نظر اپنے اصولوں کو قربان کر دیتے ہیں تو عوام کی ذہنی سطح تو اتنی بلند نہیں کہ وہ ان نظری آندھیوں کو روک سکیں، جو وقتاً فوقتاً ان کے ایوان فکر کو ڈھانے کے لیے مختلف اطراف سے چلتی رہتی ہیں۔ بہر صورت ان حالات میں مشرق کے اس دانشور کے رشحات فیض سے فائدہ پہونچے یا نہ پہونچے اس سے ایک زہرناک فضا تو قائم ہو ہی گئی جس کے نتائج قوم و ملک کے لیے بہت مہلک ہو سکتے ہیں اور اگر پاک دستوریہ میں ایک فضل الحق ہو تو اس کی کوتاہ اندیشیوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے مگر وہاں تو اس قسم کے چند اور سر پھرے

موجود ہیں۔ ایک اور رکن مجلس نے اخباری نمائندوں کو بیان دیتے ہوئے فرمایا:۔
"جہاں تک مشرقی پاکستان عوامی لیگ کا تعلق ہے وہ اپنے امکانات پر کسی قسم کا سمجھوتا نہیں کرے گی۔ بنگلہ کا قومی زبان قرار دینا۔ علاقائی خود مختاری مشترکہ انتخابات بغیر مقدمہ چلائے کسی کو گرفتار نہ کرنا، ان میں سے چند ایک ہیں" (پاکستان ٹائمز، ۱۷ جولائی ۱۹۵۶ء)
اس بیان میں موخر الذکر مطالبہ سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، نجی آزادی کا احترام ہر شخص اور ہر حکومت کا فرض ہے اس لیے محض حکام کی خوشنودی کے واسطے کسی کو محبوس کرنا انسانیت اور انصاف نہیں۔ لیکن پہلی تین شرطیں تو پاکستان کے بنیادی تصور ہی کے منافی ہیں اور ان پر قائم رہنا ایک زمانے میں تو قوم و ملت سے غداری کے مترادف تھا۔ حتیٰ کہ جب آج سے کوئی بیس برس پہلے مولانا حسین احمد صاحب مدنی جیسے جید عالم نے ہندوستان میں وطنیت کو قوم کی اساس قرار دیا تو مسلمانوں نے چاروں طرف سے احتجاج کیا۔ علامہ اقبال کی سی حساس طبیعت بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، انہوں نے اپنے تاثرات کو ان الفاظ میں پیش کیا۔

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں، ورنہ — ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

دو قومی زبانیں۔ علاقائی خود مختاری اور مشترکہ انتخابات ان تینوں اصولوں کے تسلیم کرنے میں دو قباحتیں ہیں، اول تو یہ کہ جن اصولوں کی بنیاد پر پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا اس سے وہ اصول کم نذر حوادث ہو جاتے ہیں اور دوسرے یہ کہ سماجی یک جہتی قائم نہیں رہتی اور آج ہماری قومی زندگی سب سے اہم مقصد یہی ہے کہ لوگوں میں اخلاقی اور ذہنی بلندی اور ان کے اقوال و افعال میں ایسی ہم آہنگی پیدا ہو جائے کہ انہیں ایک دوسرے سے علاحدہ نہ کیا جا سکے، دو قومی زبانیں۔ علاقائی خود مختاری اور مشترکہ انتخابات کا مطالبہ محض ایک فروعی مسئلہ نہیں اس کی تہ میں گروہی اور علاقائی نفرت کی دہکتی ہوئی آگ ہے جو ہماری ہئیت اجتماعیہ کو کسی وقت جلا کر راکھ کر سکتی ہے

تقسیم ملک سے پہلے ہمیں اپنے تمدن و ثقافت کے بچانے کی ضرورت تھی، اس لیے ہم ایک باوقار زندگی
بسر کرنے کے لیے انگریزوں اور ہندوؤں سے جنگ آزما ہوئے۔ ہندو تقسیم ملک پر رضامند نہ تھے ہمیں
اصرار تھا کہ جن علاقوں میں ہماری عددی اکثریت ہے وہاں ہمیں بھی ایک آزاد حکومت کے قیام کا
موقع دیا جائے۔ ہندو مشترکہ انتخابات کو جملہ سیاسی بیماریوں کے لیے اکسیر اعظم سمجھتے تھے لیکن ہماری
نگاہوں میں ان کا یہ نظریہ اقلیت کے حق خود اختیاری پر ڈاکہ تھا۔ ہندو دیوناگری خط میں ہندی کو
قومی زبان قرار دینے پر مصر تھے اور ہم اردو کو اس ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ ترکہ تصور کرتے
تھے لیکن آج پاک دستوریہ کے ایک ذمہ دار رکن کے منہ سے اس قسم کی باتیں سن کر تعجب
بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی۔ تعجب اس لیے کہ اگر تقسیم کے بعد ہمیں انہی نظریات کو اپنی زندگی کا
اوڑھنا بچھونا بنانا تھا تو پھر ہمیں ہندو کے اکھنڈ بھارت کے تسلیم کرنے میں کیا قباحت تھی، اس سے
کم از کم ایک فائدہ تو یہ ہوتا کہ نواکھالی۔ بہار۔ گڑھ مکتیسر اور مشرقی پنجاب میں انسانی قتل و غارتگری
کے یہ دل دوز واقعات تو پیش نہ آتے اور افسوس اس لیے کہ خدائے واحد کی پرستار رسول عربی کی یہ
قوم اپنا ملی شعور اور اپنی اخلاقی بلندی کھو چکی ہے۔ کیا ان حالات میں یہ ممکن ہے کہ ملک کے مختلف
عناصر کو ایک مرکز پر جمع کیا جا سکے؟

ایک واقعہ | مجھے اچھی طرح یاد ہے یہ زمانہ دوسری عالمگیر لڑائی کے شباب کا زمانہ تھا، جاپان
کلکتہ اور چٹاگانگ پر بم باری کر رہا تھا۔ اسٹالن گراڈ میں روس اور جرمن دونوں اپنی اپنی صولت و جبروت
کے مظاہرے دکھا رہے تھے۔ روس کو بچانے کے لیے اتحادی فوجیں ایران پر قابض ہو چکی تھیں
رضا شاہ کے بعد ملک میں جو نئی حکومت نئے شاہ کی نگرانی میں قائم ہوئی، اس کا مقصد دراصل
اتحادیوں کے سیاسی استحکام کے لیے چوبے کارے کا کام دینا تھا۔ اس زمانے میں مشرق وسطی اور مشرق
بعید میں ایک عام سیاسی انتشار اور مالی بحران کا دور دورہ تھا اور جنگ کی یہ غیر متوازن حالت عوام کے لیے
پریشان کن ثابت ہو رہی تھی کیوں کہ مشرق بعید کی سیاسی اور عسکری شکست کے بعد انگریز ہندوستان اور
مشرق وسطی میں اپنا سیاسی اقتدار اور اپنی عسکری برتری کی بحالی کی کوششیں کر رہا تھا۔ چناں چہ اس

آموزش

حکمت کی سرکردگی میں خیر سگالی کا ایک وفد ایران سے ہندوستان
مقصد کے پیش نظر آقائے اصغر حکمت کی سرکردگی میں خیر سگالی کا ایک وفد ایران سے ہندوستان
آیا۔ اس وفد میں آقائے رشید یاسمی اور پور داؤد بھی شامل تھے۔ پور داؤد اور وفد کے دوسرے
اراکین نے ہندوستان میں قدم گذار ہوتے ہی علامہ اقبال کو فرقہ پرست اور محدود النظر قرار دیا حتیٰ
کہ انہیں ان کے ہندوستان گیر شاعر ہونے پر بھی کلام تھا۔ اس کے برعکس انہوں نے اسی سانس
میں ڈاکٹر ٹیگور کو عالمی شہرت کی جو سند عطا کی اس سے یہی سمجھا گیا کہ یا تو وفد کے اراکین نے اپنی عدم
معلومات کی بنا پر اس قسم کی باتیں کی ہیں۔ یا انہوں نے عمداً اس بات کو اس رنگ میں پیش کیا ہے کم فہمی
اور عدم معلومات کا نظریہ تو یوں ختم ہو جاتا ہے کہ وفد میں پور داؤد جیسے نکتہ داں بھی موجود تھے جو فارسی
کے مسلم الثبوت شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ شانتی نکیتن اور بمبئی میں برسوں مقیم رہے۔ اس لیے مسلمانوں
نے ان کی اس تنقید کو تنقیص ہی سمجھا اور حق یہ ہے کہ وہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب بھی تھے چنانچہ
مسلمان بہت برہم ہوئے۔ ملک کے گوشے گوشے میں احتجاجی جلسے ہوئے اور تازہ وارد ایرانیوں کو
اقبال کے موقف کو سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ علی گڑھ میں استاذی المحترم ڈاکٹر ہادی حسن نے وفد کا خیر مقدم
کرتے ہوئے ہندوستان میں فارسی علم و ادب کی خدمات کو گناتے ہوئے ابوالفضل، عرفی اور مسعود سعد سلمان سے
شروع کر کے اپنی تان اقبال پر توڑی جس میں انہوں نے اقبال کے فلسفۂ حیات کی اور ہندی مسلمانوں کے
نظریۂ قومیت کی واضح تشریح بھی کی تھی اور یہی نہیں بلکہ تاریخی شواہد کی روشنی میں انہوں نے نہایت
اچھے مگر بے باکانہ انداز میں یہ بھی کہہ دیا کہ فارسی علم و ادب کی خدمت میں ہندوستان ایران سے کسی طرح
پیچھے نہیں ہے۔ ان کی اس تقریر کا اثر آقائے رشید یاسمی پر بہت خوشگوار ہوا، چنانچہ دوسرے دن
انہوں نے یونین ہال میں ایک نظم سنائی جو فی الواقع امتنان و تشکر کے جذبات سے بھرپور تھی۔
اس وفد کا یونین ہال میں استقبال کرتے ہوئے یونین کے بنگالی نائب صدر نے یہ اعلان کیا
کہ اس ملک میں مغربی اقوام کے نظریۂ قومیت سے قطع نظر ہم مسلمان پہلے ہیں اور ہندوستانی بعد میں لیکن
افسوس ہے کہ اس قلیل مدت میں اس بنگالی نوجوان نے اپنے نظریات کو تبدیل کر کے مسلمانوں کو جغرافیائی
وحدت میں محدود کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ صاحب موصوف اس وقت بنگال میں ایک عہدے پر متمکن

میرے ایک دوست ایک سرکاری کانفرنس کے سلسلے میں ڈھاکہ تشریف لے گئے، اس موقع سے فائدہ اٹھاکر وہ اپنے اس بنگالی دوست سے ملنے چلے گئے. ملاقات ہوئی لیکن باتیں نہ ہوئیں، ادھر شوق ملاقات کا یہ عالم تھا کہ کھینچ کر لے گیا اور ادھر ایسا تناؤ کہ خیال التفات ہی نہیں۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں چند بے تکلف کلمات بھی کہے۔ مگر ان کا یہ حربہ بھی اسے لب کشائی پر مجبور نہ کر سکا۔ بالآخر بولتے بولتے دو چار حرف منہ سے نکلے تو ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ یہ کبھی اردو اور کبھی انگریزی میں اسے برا بھلا کہتے رہے مگر وہاں ایک طویل خاموشی تھی۔ انہوں نے جب بہت اصرار کیا کہ "تمہیں کیا ہو گیا ہے، عقل ماری گئی ہے پاگل ہو گئے ہو وغیرہ وغیرہ،" اس کے جواب میں انہوں نے ایک لمبی تقریر کی جو کم از کم ان کی سمجھ میں تو نہ آئی ہاں اتنا ضرور سمجھ میں آیا کہ اس توضیحی تقریر میں "بنگلہ راشٹر یہ بھاشا" کی بار بار تکرار ہوتی رہی۔ یہ بیچارے اپنا سر پیٹ کر واپس آئے انہیں اپنے دوست کی اس کج خلقی اور اس تنگ نظری پہ غصہ بھی آیا اور بقول خود رحم بھی "کیوں کہ مجھے یہ توقع نہ تھی کہ ایسا ہمہ دان نوجوان بھی بنگلہ تحریک کی رو میں اپنے قدیم تمدنی اور ثقافتی سرمائے کو تعصب کے اس تند و تیز دھارے میں بہادے گا"

یہ تو ایک نجی اور ذاتی مثال ہے جو میں نے زرہ امتثال امر بیان کر دی۔ ہماری معاشرتی زندگی میں اس قسم کی سیکڑوں مثالیں روزانہ ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ لیکن ہم ان سے اغماض برتتے ہیں، ان کے عواقب سے اپنی آنکھیں موند لیتے ہیں۔ مغربی پاکستان میں بھی اس قسم کے ایک نہیں بیسیوں واقعات ہوتے رہتے ہیں، یہ تو سب کو معلوم ہے کہ چند ماہ ہوئے حکومت پاکستان مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں کو ایک انتظامی واحدے میں مدغم کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے، مختلف صوبوں کی مجالس قانون ساز نے بھی حکومت کے اس فیصلے کو متفقہ طور پر تسلیم کر لیا، حکومت کے اس اقدام کو ہر شخص نے سراہا، کہیں کہیں سے اکا دکا مخالفت کی آوازیں بھی آئیں۔ مگر ایسی کہ انہیں اتنا اہم نہ سمجھا گیا۔ اس لیے حکومت اپنے پروگرام کے مطابق مصروف کار ہے۔ لیکن ۷ جولائی کو جب پاک دستور یہ کا اجلاس مری میں ہوا تو حکومت سرحد کے وزیر اعلیٰ نے دستور یہ اور مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے اجلاس میں اس کی شدید مخالفت کی۔ اس مخالفت کی ظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی اور بالخصوص اس وقت جب یہ الفاظ اس شخص کے منہ سے نکلیں جس نے

آموزش

سرحد اسمبلی میں مغربی پاکستان کو ایک واحدہ بنانے کی تحریک پیش کی ہو۔ مخالفت کی آواز بعض اور دوستوں سے بھی سنی جا رہی ہے، جس میں خان عبدالغفار خان پیش پیش ہیں، خان صاحب اس برصغیر کے ان سیاسی رہنماؤں میں سے ہیں جو اکھنڈ بھارت کے حامی تھے لیکن آج انہیں مغربی پاکستان کے ایک واحدے میں نقصان ہی نقصان نظر آتا ہے، چناں چہ اپنے نظریے کی تبلیغ میں وہ ہر مجلس میں یہی کہتے ہیں کہ "اس سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچے گا۔"

ہمارے زعما کی ان باتوں کا عوام پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔ ان کا نقطہ نگاہ اپنے رہنماؤں اور بزرگوں کا نقطہ نگاہ ہوتا ہے۔ اگر زعمائے قوم کی نگاہیں بالیدہ، ذہن صاف اور خیالات متنوع ہیں تو یقیناً ان کے پیرو بھی بھاری بھرکم شخصیت کے مالک بن جائیں لیکن اگر ان میں قیادت کے یہ اوصاف نہ ہوں گے تو ان کی رہنمائی ساری قوم کی تباہی کا موجب بن سکتی ہے، اس وقت پاکستان کو سب سے زیادہ ضرورت سماجی یک جہتی کی ہے یعنی ہمارے اس معاشرے کا ایک ایک فرد ایک ہی زاویہ نگاہ سے دیکھے اور ایک ہی انداز فکر سے سوچے، حتیٰ کہ ان کی ایک ایک بات میں قولاً اور عملاً ہم آہنگی اور مطابقت ہو۔ لیکن کیا ان حالات میں اب اس وقت کوئی سماجی ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے؟

ملک کی اس سیاسی اور ذہنی پس ماندگی میں بظاہر اس کے امکانات تو کم ہی نظر آتے ہیں۔ مگر حالات سے مایوس ہو کر دامن ہمت چھوڑ دینا دانش مندی نہیں۔ اگر برطانوی جنرل کا یہ قول کہ واٹرلو کی لڑائی ایٹن کے میدانوں میں جیتی گئی تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے مدارس ملک کی فلاح و بہبود کے پیش نظر ایک ایسی سماجی یک جہتی کی طرح ڈالیں کہ آج کے بچے کل کو جوان ہو کر اپنی صلاحیتوں کو آپس کی کش مکش یا جنگ زرگری یا اقتدار کی رسا کشی میں برباد نہ کر دیں۔ بلکہ متحد و متفق ہو کر ملک و ملت کی صحیح خدمت کر سکیں۔ اور اگر اہل مدرسہ اپنے اس فرض کو ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں تو ان کی اس غفلت کو آنے والی نسلیں کبھی معاف نہیں کر سکیں گی۔

ایک ایسی سماجی یک جہتی کا پیدا کرنا جو ہماری قومی اور ملی روایات کی آئینہ دار ہو، کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے اور اگر بالفرض یہ کام مشکل بھی تسلیم کر لیا جائے تو ہمیں اس سے بہر طور عہدہ برآ ہونے کی

کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن یاد رہے کہ اس مقدس کام کی تکمیل کے لیے ہمیں یورپ کے رنگ و حشت کی بجائے قرآن و سنن نبوی پر ہی اپنی اس عمارت کی بنیاد رکھنی ہوگی، یہ گروہی اور قبائلی جھگڑے یہ لسانی اور وفی تنازعے اسلامی جمہوریت کے آوردہ نہیں خود اپنے پیدا کردہ ہیں۔ جنہیں مغربی استعماریت نے اپنی سان پر چڑھا کر اور چمکا دیا ہے، اگرچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم فکری اور ذہنی طور پر یہ محسوس کریں کہ ہم ایک ہیں۔ ہماری ہست و بود، ہمارا تہذیب و تمدن بلکہ ہماری زندگی کا دھارا ہی ایک سرچشمے سے پھوٹتا ہے۔

مدرسہ سماجی زندگی کی سب سے بڑی تربیت گاہ ہوتا ہے۔ یہاں مختلف ماحول کے بچے ایک نئے مگر ہم آہنگ ماحول میں زندگی کا سانس لیتے ہیں اور ان اوقات میں وہ اپنے گھریلو معاشرے اور گھریلو ماحول کو بھول کر مدرسے کی سماجی زندگی کا ایک جزو بن جاتے ہیں۔ بلکہ رفتہ رفتہ ان میں ایک ایسا شعور اور ایک ایسی زندگی پیدا ہو جاتی ہے جو انہیں اتحاد و اتفاق اور اشتراک و ارتباط کا خوگر بنا دیتی ہے ہم بچوں کے اس فطری جذبے سے فائدہ اٹھا کر ان میں انسانی ہمدردی اور تعاون کا ایسا شدید احساس پیدا کر سکتے ہیں کہ وہ اسے اپنی زندگی کا عظیم ترین مقصد خیال کرنے لگیں۔

مشرقی پاکستان کی ایک جھلک

ادریس احمد

کچھ روز ہوئے راقم کے پاس برازیل ایک دوست کا خط آیا جس میں انہوں نے لکھا کہ :-
عید کے موقع پر آپ نے جو خوب صورت خط بھیجا اس کے لیے بہت شکر گذار ہوں۔ کاش میں اس کی دیدہ زیب سنہری عبارت کو پڑھ سکتا۔ ازراہ کرم مجھے اپنے ملک کے متعلق کچھ معلوماتی لٹریچر بھیجیے۔ میں اس ملک کے متعلق اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ دنیا بھر میں صرف یہی ایک ملک ہے جو دو الگ الگ ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے۔

غیر ملکیوں کو یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک قوم دو ایسی سرزمینوں میں بس رہی ہو جن کا باہمی فاصلہ ایک ہزار میل سے اوپر ہو اور یہ فاصلہ ایک حریف ملک کی سرزمین پر مشتمل ہو۔ راقم نے امریکہ میں بہت سے لوگوں کو پاکستان کے متعلق یہی سوال پوچھتے سنا لیکن جب جواب میں یہ کہا جاتا کہ آخر الاسکا بھی تو اب ریاست ہائے متحدہ کا حصہ ہے کیا ان دونوں کے درمیان ایسا بعد نہیں ہے۔ اور اب تو جزائر ہوائی کو بھی ریاست ہائے متحدہ کا جزو بنا دیا گیا ہے۔ کیا ان جزائر کو ہزاروں میل چوڑا سمندر امریکہ سے علیحدہ نہیں کرتا ؛ تو پھر ان کی سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے کہ فی الواقع اپنے جغرافیائی بُعد کے باوجود مغربی اور مشرقی پاکستان ایک ہی ملک کے دو حصے ہیں اور ان میں بسنے والے لوگ ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔

تاہم اس میں کلام نہیں کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کا جغرافیائی بعد ملک کے ان دونوں ٹکڑوں کے درمیان آمد و رفت اور میل جول کی بڑی دشواریاں پیدا کرتا ہے، اسی وجہ سے یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ پاکستان کے ان دونوں بازوؤں میں بسنے والے لوگ ایک دوسرے کے حالات سے زیادہ سے زیادہ باخبر رہیں تاکہ ذہنی قرب جغرافیائی بُعد کے اثرات کو زائل کرتا رہے۔ یہ مضمون

اسی مقصد کو سامنے رکھ کر لکھا جا رہا ہے۔

بیسویں صدی میں اسے اسلام کا معجزہ کہنا چاہیے کہ اس نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے لوگوں کو ایک ہی قومیت کے رشتے میں باندھ رکھا ہے، حالاں کہ ان دونوں میں زبان۔ لباس اور بود و باش کے لحاظ سے کوئی چیز مشترک نہیں۔ مشرقی پاکستان رقبہ کے اعتبار سے مغربی پاکستان کا کوئی چھٹا حصہ ہے لیکن اس کے ۵۴۲۵۰ مربع میل رقبہ کو قدرت نے وہ بے مثال زرخیزی دی ہے کہ یہاں پاکستان کی آدھی سے زیادہ آبادی سمٹی ہوئی ہے اس صورت حال نے طرح طرح کی سیاسی اور دستوری گتھیاں پیدا کر رکھی ہیں، ان گتھیوں کے تسلی بخش حل کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ پاکستان کے دونوں بازو اپنی واحد قدر مشترک یعنی اسلام کو مضبوطی سے پکڑے رہیں، اگر حبل اللہ کا اعتصام ذرا بھی ڈھیلا پڑ گیا تو پھر ملکی سالمیت کو خطرہ لاحق ہوگا۔

مشرقی پاکستان کی فوجی اہمیت بہت بڑی ہے جس طرح مغربی پاکستان فاتحین کے صدیوں کے راندے ہوئے راستوں کی پاسبانی کر رہا ہے اسی طرح مشرقی پاکستان عہد جدید کے متوقع حملہ آوروں کی راہ میں واقع ہے۔ اگر اشتراکی چین تبت کی راہ سے جنوب کی طرف بڑھے یا برما کی راہ سے مغرب کی طرف تو مشرقی پاکستان دونوں صورتوں میں اس کا راستہ روکے گا۔

اہم خصوصیات

مشرقی بنگال پاکستان کی معاشی مضبوطی کے لیے بہت اہم ہے یہ وہ سرزمین ہے جہاں دنیا کی ستّر فی صد پٹ سن پیدا ہوتی ہے۔ اس سنہرے ریشے کی بدولت پاکستان اپنا آدھا غیر ملکی زرمبادلہ کماتا ہے مگر سیاسی اور معاشی امور سے قطع نظر مشرقی پاکستان میں کئی ایک اور رنگینیاں ہیں جو اپنی خاص جاذبیت رکھتی ہیں۔ ساگوان کے گھنے جنگلوں میں بعض ایسے قبیلے آباد ہیں جن کے متعلق ابھی علم الانسان کے عالموں کو کچھ معلوم نہیں، وحشی ہاتھی۔ شیر۔ چیتے

اور دوسرے وحشی جانور گھنے جنگلوں میں سینہ تانے گھومتے پھرتے ہیں۔ ملک کے جنوب مشرقی کنارے پر جہاں برما سے سرحد ملتی ہے قدیم اور کافی تہذیب کے کھنڈر بکھرے پڑے ہیں چٹاگانگ کے پہاڑی علاقہ میں وحشی ہاتھی پکڑے جاتے ہیں اور یہ منظر بے حد قابل دید ہوتا ہے۔ ہاتھی پکڑنے کا موسم صرف سردیوں کے مہینے ہیں۔ گرمیوں میں مون سون ہوائیں یہاں چار ماہ کے اندر اندر متواتر پانی برسا دیتی ہیں اور جنگل کے تنگ راستوں میں آنا جانا ناممکن ہو جاتا ہے۔

آزادی ملنے کے بعد مشرقی پاکستان نے نمایاں ترقی کی ہے۔ ایک غیر ملکی سیاح ہاتھی پر سوار ساگوان کے جنگل میں سے جا رہا تھا پیچھے سے جیپ کار آئی۔ ہاتھی چیخے سے جھومتا ہوا ایک طرف ہو گیا۔ ہاتھی کے بنگالی مہاوت نے مسکرا کر کہا "آج مشرقی پاکستان میں جو سماجی انقلاب تیزی سے پیدا ہو رہا ہے اس کی نوعیت بھی بالکل یہی ہے، ہاتھی ہر جگہ جیپ کے سامنے ہتھیار ڈالتا نظر آتا ہے ہماری بانسوں کی جھونپڑیاں جدید وضع کے مکانوں میں بدل رہی ہیں معلوم ہوتا ہے ہم ایک ہی جست میں دنیا تو سی جنگلی زندگی سے چھلانگ لگا کر متمدن زندگی میں قدم رکھنے والے ہیں" اگرچہ ان الفاظ میں بہت کچھ مبالغہ موجود ہے۔ پھر بھی یہ فقرے جدید رجحانات کی نشاندہی ضرور کرتے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں دریاؤں اور ندی نالوں نے ہر جگہ ایک جال سا تان رکھا ہے۔ کہیں جاؤ جگہ جگہ لرزتے ہوئے لکڑی کے پلوں یا کشتیوں کے ذریعہ ندی نالوں کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ ان آبی شاہراہوں میں جگہ جگہ کشتیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے نظر آتے ہیں۔

وحشی ہاتھیوں کی تربیت

وحشی ہاتھیوں کے شکاری چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں کا رخ کرتے ہیں چٹاگانگ سے یوں جوں شمال مشرق کو بڑھیں ساگوان کا جنگل گھنے سے گھنا ہوتا جاتا ہے اور پہاڑیاں اونچی سے اونچی ہوتی جاتی ہیں، جون سے ستمبر تک یہ پہاڑی راستہ پانی اور کیچڑ کے باعث ناقابل گذر ہوتا ہے۔ لیکن جنوری کے مہینہ میں یہاں خاک اڑتی ہے اور سرخ گرد کی تہ چلنے والوں کے جسم اور کپڑوں کو

بیٹھ جاتی ہے۔ اس علاقے میں چکمہ قبیلہ کے لوگ آباد ہیں جو برمی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، یہ چھوٹے قد عمدہ جسم اور نازک نقوش رکھتے ہیں۔ عورتیں ہاتھ سے بنے ہوئے کپڑے کی ساڑھیوں میں لپٹی اور چاندی کے زیور پہنے نظر آتی ہیں۔ ان لوگوں کے گاؤں بانس کی صرف چند جھونپڑیوں پر مشتمل ہوتے ہیں یہ جھونپڑیاں بانس کے کھمبوں کے ذریعہ سطح زمین سے اونچی رکھی جاتی ہیں۔

سانگوان کے اس گھنے جنگل میں صرف تنگ راستے گزرتے ہیں جوں جوں ایک راستہ پر آگے بڑھیں جنگل زیادہ پُرہیبت ہوتا جاتا ہے۔ تاہم راستے کے اردگرد دھان اور تورسیے کے کھیت، بانسوں کے جھنڈ اور جنگل کی لکڑیاں لگاتار ایک دوسرے سے ملتی چلی جاتی ہیں۔

چٹاگانگ کے علاقہ کی سب سے قیمتی پیداوار عمارتی لکڑی ہے۔ ہاتھی اس پیداوار کے جمع کرنے اور اسے منڈیوں تک پہونچانے کا واحد ذریعہ ہے، کیونکہ دشوار گذار جنگلی مقامات پر مشینی ذرائع حمل و نقل بہم پہونچانا ممکن ہے۔ ہر موسم سرما میں اس علاقے سے کوئی سالم وحشی ہاتھی پکڑے جاتے ہیں، یہ ہاتھی دراصل اس علاقے میں پیدا نہیں ہوتے بلکہ سرحد پار کے اونچے پہاڑی برمی علاقوں سے بانس کے پودوں اور ہاتھی گھاس کی تلاش میں آتے ہیں، جو پرائیویٹ ٹھیکہ دار وحشی ہاتھی پکڑتے ہیں انہیں ہر شکار میں سے ایک ہاتھی حکومت کو بطور ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ ایک مضبوط نر ہاتھی کی قیمت کوئی تین ہزار سے ساڑھے پانچ ہزار تک ہے۔

ہاتھی پکڑنے کے لیے ایک گول شکل کا جنگلہ تیار کیا جاتا ہے جس کا قطر بیس گز اور جس کی دیواریں بارہ سے پندرہ فٹ اونچی ہوتی ہیں، یہ دیواریں مضبوط لکڑی کے موٹے کھمبوں سے تیار کی جاتی ہیں۔ اس میں داخل ہونے کے لیے لکڑی کے شہتیروں سے ایک پھاٹک تیار کیا جاتا ہے۔ اس پھاٹک سے آگے کوئی دو سو گز لمبی ایک تیف نما گلی تیار کی جاتی ہے جو آگے کی طرف چوڑی ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ نقطۂ آغاز پر اس کی چوڑائی پچاس گز ہو جاتی ہے، یہ وہ پھندا ہے جو وحشی ہاتھیوں کو پکڑنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ اب اس تمام رقبے کو سبز بیلوں اور درختوں کے پتوں سے ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ اس کام میں کافی جلدی کرنی پڑتی ہے، کیونکہ اگر یہ پتے ذرا بھی مرجھا جائیں تو ہاتھی کو جھٹ

دھوکے کا شبہ ہوتا ہے اور وہ قریب نہیں پھٹکتا۔

وحشی ہاتھی دس دس پندرہ پندرہ کی ٹولیوں میں اکٹھے گھومتے ہیں۔ جہاں ان کی کوئی ٹولی شکارگاہ کے قریب آئی کئی سو آدمی ہاتھیوں کے پیچھے قطار بنا کر انہیں "کیدہ" (چوبی احاطہ) کی طرف دھکیلنے لگتے ہیں، دن کا وقت ہو تو یہ لوگ شور مچا مچا کر اور ڈھول بجا بجا کر ہاتھیوں کو ڈراتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ تیار کردہ گلی کے منہ تک آجاتے ہیں۔ رات کے وقت یہ لوگ آگ جلا کر ہاتھیوں کو خائف کرتے ہیں۔ ان ساری تدبیروں کے باوجود کامیابی یقینی نہیں بعض اوقات ان کو چوبی احاطہ کی طرف دھکیلنے میں کئی دن صرف ہو جاتے ہیں۔

شکار کا پرہنگامہ دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب وحشی ہاتھیوں کا غول چوبی احاطے کی گلی میں داخل ہوتا ہے، غصے سے بے قابو ہو کر وہ پوری قوت کے ساتھ کودنے اور چیخنے لگتے ہیں۔ گلی کی اونچی دیواروں سے ٹکراتے اور بے تحاشہ چکر کاٹتے ہیں لیکن نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، یہ کیفیت پورے دو دن تک جاری رہتی ہے، اس اثنا میں انہیں کھانے پینے کو کچھ نہیں دیا جاتا تاکہ ان کی طاقت کم ہو جائے۔ تیسرے دن دو چابک دست مہاوت سدھائے ہوئے ہاتھیوں پر سوار ہو کر اس قیدی غول کے درمیان جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے ہوتے ہیں۔ سدھائے ہوئے ہاتھی جوڑ توڑ کر کے ایک وحشی ہاتھی کو اپنے درمیان لے کر چوبی احاطے کے دروازے کی طرف چلتے ہیں یہ راستہ تینوں ہاتھیوں کے ایک ساتھ چلنے کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ اس کھینچا کھینچی میں ایک مہاوت تیزی سے نیچے اتر آتا ہے اور ہاتھیوں کے پاؤں میں رینگتا ہوا وحشی ہاتھی کے پاؤں میں رسہ ڈال دیتا ہے، یہ رسہ چوبی احاطہ میں مضبوطی کے ساتھ ایک کھونٹے سے باندھ دیا جاتا ہے، اب دوسرے ایک پھندا اس قیدی ہاتھی کی گردن میں ڈالا جاتا ہے اور یہ رسہ بھی ایک مضبوط کھونٹے سے باندھ دیا جاتا ہے۔ اب قیدی ہاتھی پوری طرح قابو میں آجاتا ہے اور اس کے سامنے چارہ اور پانی لایا جاتا ہے، وحشی ہاتھی کا ردعمل فوراً شروع ہو جاتا ہے، وہ دوسرے ہی دن آدمی

دشمن کی بجائے دوست خیال کرنے لگتا ہے اور ایک ہفتہ بعد پوری اطاعت سے سدھائے ہوئے ہاتھیوں کی قطار میں چلنے لگتا ہے۔ اب وہ اس قابل ہوتا ہے کہ اسے سدھا کر مفید خدمت کے لائق بنا دیا جائے۔

سدھایا ہوا ہاتھی جس احتیاط اور سوجھ بوجھ کے ساتھ آقا کی خدمت کرتا ہے وہ بہت حیران کن ہے۔ پچھلے سال ایک امریکی اور ان کی اہلیہ ہاتھیوں پر سوار ہو کر چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے کا دورہ کر رہے تھے۔ ان کے لیے ہاتھی پر سواری کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اکثر اوقات راستہ میں ہاتھی گھاس نے ناقابل گذر دیوار حائل کر دیتی ہوئی۔ اسکی زیادہ تر لمبائی بارہ فٹ اور اس کا تنا بہت سخت قسم کا تھا۔ مگر ہاتھی کمال صفائی کے ساتھ اپنے سونڈ سے اس کو راستے سے اس طرح ہٹاتا جاتا کہ گھاس کے تنے سواروں کو چھونے نہ پاتے۔ ایک ندی کا کنارہ اس قدر بے ڈھب طور پر پھیلتا تھا کہ اس میں اترنا ممکن نظر نہ آتا تھا۔ ہاتھی کنارے پر بیٹھ گئے اور راتوں کے بوجھ پر پھسل کر پانی میں اتر گئے۔ اس طرح یہ بکھری ندی پار کر لی گئی۔ جہاں کہیں دلدل آتی ہاتھی پاؤں دھرنے سے پہلے اچھی طرح یقین کر لیتے کہ زمین اتنی مضبوط ہے کہ ان کا بوجھ سہار لے گی۔ غرض ہاتھیوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ سواروں کو ہرگز کوئی گزند نہ پہنچے۔ مہاوت کے محض اشارہ کرنے پر ہاتھی ہر حکم بجا لاتا تھا۔ اس سارے سفر میں صرف ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ امریکی خاتون مادہ ہاتھی پر سوار تھیں۔ ایک موقع پر مہاوت نے مادہ ہاتھی کو بلا وجہ درشتی کے ساتھ ڈانٹا اس پر وہ بگڑ گئی اور چیخ مار کر سر زمین پر رکھ دیا اور پچھلی ٹانگیں اوپر اٹھا کر سر کے بل کھڑی ہو گئی۔ امریکی خاتون کو جان کے لالے پڑ گئے۔ مگر مہاوت نے اپنے اوسان بحال رکھے۔ اس نے مادہ ہاتھی کو شدت سے سرزنش کر کے اسے اپنا فرض یاد دلایا۔ اس احساس کے پیدا ہوتے ہی اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور وہ دوبارہ پوری فرماں برداری سے کام کرنے لگی۔ اس کے بعد سارے سفر میں اس نے بدمزاجی کا اور کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔

ہاتھی پکڑنا:۔ ہاتھی جیسے مضبوط جانور کو پھندے میں پھانسا اور پھر اس کی بے پناہ جسمانی

آموزش

توت کو بے بس بنانا بہت پرہنگامہ منظر پیش کرتا ہے۔ ذیل میں اس منظر کا ایک لفظی خاکہ پیش کیا جاتا ہے، وحشی ہاتھیوں کا یہ شکار اس موسم سرما سے تعلق رکھتا ہے، جب ملک فیروز خاں نون مشرقی بنگال کے گورنر تھے۔ اس موقع پر بیگم وقارالنسا نون اپنے غیر ملکی مہمانوں کے ہمراہ موجود تھیں، یہ تمام تماشائی چوبی احاطے سے کوئی سو گز دور ایک اونچے درختوں پر بنائے گئے مچان پر بیٹھے تھے۔

یہ لوگ دوپہر کے بعد مچان پر جا بیٹھے۔ شکاری پچھلے دو دنوں سے ہاتھیوں کی ایک ٹولی کو چوبی احاطے کی طرف دھکیلے لا رہے تھے، اطلاع موصول ہوئی کہ اب وہ صرف چند میل کے فاصلہ پر ہیں، انتظار کرتے کرتے شام ہو گئی، شکاریوں کی آوازیں اور ان کے ڈھولوں کی بھاری آوازیں مسلسل کانوں میں آ رہی تھیں۔ آخر چاند نکل آیا لیکن ابھی انتظار جاری تھا۔

رات کے دس بج گئے، جنگل میں شور و غل بدستور جاری تھا، گیدڑ چاروں طرف چیخ رہے تھے، اب ہاتھی مچان سے دور نہ تھے، کیوں کہ ان کے چرنے کی آواز صاف آ رہی تھی۔ چاند آسمان میں کافی اونچا ہو چکا تھا، اس کی روشنی بالکل صاف تھی، دفعتہً جنگل کے اندھیرے میں سے ایک لمبے دانتوں والا ہاتھی چاندنی کی ایک ٹکڑی میں داخل ہوا، وہ بڑی جاہ و عظمت کے ساتھ جھومتا ہوا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اب وہ بانس کے ایک نرم شگوفے کو کھانے کے لیے رک گیا۔ اس کے پیچھے ایک اور ہاتھی روشنی کی ٹکڑی میں دکھائی دیا۔ اس کے بعد ایک اور۔ ایسا معلوم ہونے لگا گویا جنگل کے اندھیرے میں سے بے ڈول دیووں کی ایک قطار نکلنے لگی ہے۔

یہ قطار آہستہ آہستہ قیف نما گلی کی طرف بڑھنے لگی، ہاتھی بڑے مزے سے چرتے ہوئے خراماں خراماں بڑھ رہے تھے جنگل میں شکاریوں کا شور بدستور جاری تھا، اسی طرح آدھا گھنٹہ گذر گیا۔ اب ہاتھیوں کا ہر قدم پھندے کی طرف اٹھ رہا تھا۔ ان میں سے نصف درجن پہلے ہی قیف نما گلی میں داخل ہو چکے تھے۔

دیو ہیکل ہاتھیوں کا یہ جلوس اسی طرح قدم قدم بڑھتا جا رہا تھا کہ سب سے آگے چلنے والا

ہاتھی کو گلی سے باہر چند گز پر ایک نرم و نازک بانس کے شگوفے نے اپنی طرف کھینچا۔ ابھی گلی کا کنارہ زیادہ اونچا نہ تھا۔ وہ کود کر اس بانس کی طرف لپکا۔ اس کے پیچھے تین مادہ ہاتھی بھی ہو گئے اور یہ چاروں گلی سے باہر مگر اس کے متوازی آگے بڑھنے لگے۔ ابھی کچھ بگڑا نہ تھا۔ باقی ٹولی درست میں چلی جا رہی تھی۔ اغلب تھا کہ چار بھٹکے ہوئے ہاتھی بھی جلدی باقی گروہ میں آشامل ہوتے صرف چند منٹ کی اور کسر تھی۔ جوں ہی ہاتھیوں کی ٹولی مقررہ حد سے آگے نکل جاتی پیچھے سے دفعتہً آگ روشن کر کے اور دھماکے دار پٹاخے چلا کر انہیں پھندے میں دھکیل دیا جاتا۔

مگر جلد بازی اور بے صبری نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا، بھٹکے ہوئے چار ہاتھی ابھی چند قدم آگے بڑھے تھے کہ ایک شکاری کود کر ان کے سامنے چند گز کے فاصلہ پر آکھڑا ہوا اور زور سے چیخ چیخ کر اور بازو گھما گھما کر انہیں گلی کی طرف موڑنا چاہا۔ اس شور و غل کو دوسرے شکاریوں نے اس بات کی علامت خیال کیا کہ ہاتھیوں کی ٹولی مقررہ حد سے آگے نکل چکی ہے، چنانچہ دفعتہً آگ کے شعلوں سے سارا جنگل روشن ہو گیا اور دھماکے دار پٹاخوں سے دھرتی کانپنے لگی۔ کر چاروں بھٹکے ہوئے ہاتھی چنگھاڑتے ہوئے پیچھے مڑے۔ باقی ساری ٹولی بھی گھونگٹ کھا کر ملبے ور گلی کے چھپے ہوئے کناروں سے ٹکراتی ان چاروں کے پیچھے ہو لی۔ ان کے بھاری بھرکم ٹاپوں سے مین ہلنے لگی اور ان کی چنگھاڑوں سے معورا سرافیل کا گمان ہونے لگا۔

کچھ دیر بعد شعلے بجھ گئے اور شور و غل نسبتاً کم ہوا، شکاریوں کی چیخ پکار ابھی جاری تھی ن میں سے ہر ایک دوسروں کو قصوروار ٹھہرا رہا تھا، ناچار سب کو مایوس لوٹنا پڑا۔ اگلی صبح اطلاع ئی کہ ہاتھی شمال کی طرف دس میل دور نکل گئے ہیں اور ابھی لگاتار بھاگے جا رہے ہیں سی دنوں تک انہیں واپس لوٹانے کی قطعاً امید نہ تھی۔ لہٰذا شکاریوں اور تماشائیوں کو حلِ ناخواستہ بستر بوریا اٹھانا پڑا۔

بائلی زندگی

چیانگ تانگ کے قبائلیوں کی زندگی دنیا کی گہما گہمی سے بالکل الگ تھلگ کٹتی ہے۔ کاسالنگ

اور کرنافلی اس علاقہ کی بڑی آبی شاہراہیں ہیں۔ تمام آمدورفت اور تجارت انہی دریاؤں کے واسطے ہوتی ہے۔ لیکن ان دریاؤں کے کنارے واقع دیہات کا یہ حال ہے کہ ان میں کوئی دوکان نہیں۔ کاروباری لوگ اشیائے تجارت کشتیوں میں لادکر دریا کے کنارے انتہائی شمالی قصبہ تک پہونچ جاتے ہیں۔ یہاں وہ اپنا مال مقامی منڈی میں جا رکھتے ہیں اور ایک دو دن کے لیے کاروباری گہما گہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اردگرد کے علاقہ سے لوگ لمبی راہیں طے کرکے اپنی پیداوار بیچنے اور ضروری چیزیں خریدنے کے لیے یہاں جمع ہوتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ پھر یہ بازار ایک مہینے بعد لگے گا۔ یہ لوگ یہاں تمباکو تل۔ کپاس اور کیلے فروخت کرتے ہیں۔ اور کپڑا، برتن چاندی اور چاندی کے زیور خرید لے جاتے ہیں، جب یہ بازار ختم ہو جاتا ہے تاجر لوگ اپنی چیزیں کشتیوں پر لادکر راتوں رات اگلے گاؤں میں جا پہونچتے ہیں۔ اور وہاں بازار لگ جاتا ہے۔

دریائے کاسالنگ کے کنارے میانی مکھ ایک اہم قصبہ ہے، یہ قبائلی تجارت کا بڑا مرکز ہے۔ یہاں منڈی میں طرح طرح کے قبائلی جمع نظر آتے ہیں۔ ان میں ایک ایسا گروہ بھی نظر آتا ہے جن میں سے کوئی شخص بھی پانچ فٹ سے زیادہ اونچا نہیں۔ یہ لوگ سمٹ کر ایک ساتھ رہتے ہیں یہ ریانگ قبیلے کے لوگ ہیں جو چٹاگانگ کی پہاڑیوں کے انتہائی شمالی سرے سے بانس کے گٹھوں دریا میں تیراکر لائے ہیں، انہیں یہاں آنے میں چھ دن لگے اور پیدل واپس جانے میں کوئی بیس دن لگیں گے۔ یہ قبائلی سال میں صرف ایک بار گھر سے باہر نکلتے ہیں۔

ریانگ قبیلہ کے لوگ بڑے منکسر مزاج واقع ہوئے ہیں۔ اگر کوئی اجنبی مل جائے تو آپ محبت سے سلام کرتے ہیں، ان کے سلام کرنے کا طریقہ بھی عجیب وغریب ہے، ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو ایک جا کرکے اس طرح سینے کے برابر لائیں گے کہ انگلیوں کے سرے اوپر کی طرف ہوں، تب سر کو ہلاکر ہاتھ کو یہاں تک اٹھاتے ہیں کہ انگلیوں کے سرے ماتھے کو چھوئیں، ان کے معذرت کا طریقہ بھی نرالا ہے۔ اگر کوئی ریانگ اتفاقی طور پر آپ سے ٹکرا جائے تو فوراً آپ کی طرف مڑکر زبان دکھا دے گا۔ یہ اعتذار لفظوں میں یہ معنی رکھتا ہے کہ میری زبان اظہار افسوس کے لیے کافی الفاظ

شام کو جب میانی مکھ کا بازار ختم ہوتا ہے اور دوکان دار اپنی اپنی دوکانیں لپیٹ کر دریا کا رخ کرتے ہیں. قبائلی اسی جگہ آگ روشن کرکے کھانا پکانے بیٹھ جاتے ہیں، کھانے سے فارغ ہو کر ناچ شروع ہوتا ہے، قبائلی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں دائرے بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں. ڈھول بجتا ہے اور بانسری کی پرسوز لے بلند ہوتی ہے. اس کے ساتھ ساتھ قبائلی کودتے اور اچھلتے نظر آتے ہیں ناچ کی یہ منڈلیاں منڈی سے لے کر دریا کے کنارے تک پھیل جاتی ہیں، یہ ناچ گھنٹوں جاری رہتا ہے، آخر جب دل لگی کا جذبہ پوری طرح تسلی پا جاتا ہے تو یہ لوگ اپنا مختصر رخت کندھوں پر اٹھا سال بھر کے لیے پھر جنگل کے سائے میں گم ہو جاتے ہیں۔

میانی مکھ سے کشتی میں بیٹھ کر دریا کے نیچے رنگا متی کو آؤ تو جگہ جگہ بانسوں کے پشتے تیرتے نظر آئیں گے، ۲۰ فٹ لمبے ۲۰۰ بانسوں کو اکٹھا باندھ کر ایک گٹھا تیار کیا جاتا ہے۔ ایسے کئی گٹھوں کو یکجا کرکے ایک پشتہ تیار کیا جاتا ہے. بعض اوقات ان پشتوں کی لمبائی آدھ میل تک ہو جاتی ہے. کشتی بان لمبے بانس پکڑے ان پشتوں کو کھینتے ہوئے نیچے لیے آتے ہیں، ایسے مقامات سے جہاں دریا تیزی سے مڑتا ہو پشتوں کو گذارنے کے لیے بڑی مہارت درکار ہے. دریا میں جو کشتیاں چلتی ہیں وہ عموماً لکڑی کے ایک ہی سوچے کو کھو کھلا کرکے تیار کی جاتی ہیں. جہاں جہاں ان کی لمبائی گو بیس پچیس فٹ تک ہوتی ہے، چوڑائی عموماً پانچ چھے فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی. کشتی کے دونوں تو کیلے کناروں پر بانسوں پر چٹائیاں ڈال کر سایہ کیا جاتا ہے. مسافر اسی سائے کے نیچے بیٹھتے ہیں. لیکن اس چھت کے نیچے سیدھے کھڑے ہونا ممکن نہیں، کشتی کے عین وسط میں کچھ کھلی جگہ چھوڑی جاتی ہے، جہاں کھانا پکایا جا سکتا ہے، بانسوں کے پشتے بار بار کشتیوں کا راستہ روکتے ہیں بعض اوقات پشتوں کی ایک لمبی قطار کشتی کو دیر تک روکے رکھتی ہے اور آخر کار بانس کے کچھ گٹھوں کو کھول کر کشتی کے لیے راستہ بنایا جاتا ہے۔

آئیے اب دریا کے کنارے چکمہ قبیلے کے ایک گاؤں کو دیکھیں. گاؤں میں پھوس کی کوئی بیس جھونپڑیاں ہیں جن میں کوئی دو سو نفوس بستے ہیں. گاؤں کا نمبردار آپ سے ملتا ہے، اس کا

نام ہندوانہ ہے .... اندرو داس چکمہ۔ قبیلہ کے ہر فرد کے نام کے آخر میں قبیلے کا نام چکمہ ضرور آئے گا۔ اس گاؤں کے باشندے چاول۔ خربوزے۔ کیلے اور سرسوں کی کاشت کرتے ہیں، بانس اور سرسوں نقدی کی فصلیں ہیں، سچ پوچھو تو بانس ان لوگوں کی زندگی کا بڑا سہارا ہے جھونپڑیاں بانس سے بنی ہیں۔ اس کے نرم شگوفے پکا کر کھائے جاتے ہیں خشک بانس آمدنی کا بڑا ذریعہ ہیں، بانس کی سبز کھوکھلی پوروں میں چاول پکائے جاتے ہیں۔ بانس کی بندوقوں سے شکار کھیلا جاتا ہے کھیتوں اور گھروں کے جنگلے بانس سے بنتے ہیں۔ کرسیاں اور چٹائیاں بھی اسی کی بنائی جاتی ہیں۔ لوگ بانس کے بنے ہوئے حقے پیتے ہیں اور بانس ہی کے کشتوں پر بیٹھ کر دریا میں آتے جاتے ہیں۔ الغرض بانس کے بغیر اس علاقے کے لوگوں کی زندگی ممکن نہیں۔

چکمہ لوگ گو ہندوانہ نام رکھتے ہیں۔ لیکن وہ مذہبًا ہندو نہیں۔ وہ اپنے آپ کو بدھ مت کے پیرو کہتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت ان کا مذہب بدھ مت اور مظاہر قدرت کی پوجا کی ایک آمیزش ہے۔ ایک سے زیادہ شادیوں کا رواج نہیں۔ اور شادی عمومًا سولہ برس کی عمر سے پہلے نہیں کی جاتی کھیتی باڑی کا کام زیادہ تر عورتیں کرتی ہیں۔ آبائی جائداد بیٹوں اور بیٹیوں میں برابر بانٹی جاتی ہے۔

ہر قبیلہ کے لوگ عمومًا ایک مخصوص رنگ کا لباس پہنتے ہیں۔ مثلاً سرخ زمین اور سیاہ دھاری چکمہ کا مخصوص رنگ ہے۔ کھیتی باڑی کی طرح کاتنے اور بننے کا کام بھی عورتیں ہی کرتی ہیں۔ ہر جھونپڑی کے سامنے ایک چبوترا بنا نظر آتا ہے، گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر عورتیں بچوں سمیت یہاں آ بیٹھتی ہیں اور کاتنا شروع کر دیتی ہیں۔ بہت سی عورتیں کمر سے اوپر ننگی نظر آتی ہیں، کسی اجنبی مرد کا گذر انہیں کپڑے اوڑھنے پر ہرگز مجبور نہیں کرتا، البتہ اگر کوئی اجنبی عورت ادھر آنکلے تو یہ فوراً دوپٹے سے اپنے کندھے ڈھانپ لیں گی۔

کپڑا بننے کی کھڈی نہایت مختصر اور ہلکی پھلکی ہے، اسے دو بانسوں کے ساتھ اٹکایا جا سکتا ہے چکمہ عورتیں اسے اپنے چبوتروں پر نصب کر کے کپڑا بننے لگتی ہیں، کھیتی باڑی کی دیکھ بھال کے لیے جانا ہو تو اس کھڈی کو آسانی سے ساتھ اٹھا لے جاتی ہیں، وہاں کسی صاف جگہ میں اسے کسی درخت کے

ساتھ ٹکایا اور کپڑا بننے لگیں۔

چکمہ لوگوں کا بیان ہے کہ ہزاروں برس گزرے ان کے باپ دادا برما سے چٹاگانگ کی پہاڑیوں میں نکل آئے تھے اور اسی جگہ کے ہو رہے۔ ان لوگوں کے بعض رسم و رواج بہت عجیب قسم کے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً یہاں تاڑیلین کا رواج پشتوں سے چلا آتا ہے۔ جب گاؤں میں چیچک یا اس طرح کی کسی اور خبیث کی بیماری کا حملہ ہو جائے تو ایک رسی گاؤں کے اردگرد بانس کے کھمبوں پر باندھ دی جاتی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ کسی شخص کو باہر سے گاؤں میں آنے کی اجازت نہیں اور نہ ہی گاؤں میں سے کسی کو باہر جانے کی۔ یہ حالت اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک بیماری دور نہ ہو جائے۔

چٹاگانگ کے پہاڑی خطے میں رہنے والے قبائلی مقامی جڑی بوٹیوں، درختوں کی چھال اور پتوں اور دوسری مقامی چیزوں سے اکثر بیماریوں کا علاج کر لیتے ہیں۔ مثلاً سانپ کے ڈسے کے لیے وہ ایک کڑوا عرق تیار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر سانپ کا ڈسا فوراً اس عرق کو پی لے تو اسے شفا ہو جاتی ہے۔ سینے کی مختلف بیماریوں کے لیے اژدھا کے جگر کا سفوف پانی میں گھول کر دیا جاتا ہے کیونکہ اس جگہ ڈاکٹر کی نسبت اژدھا زیادہ آسانی سے مل جاتا ہے۔

علم کی روشنی

آزادی کے ساتھ ان جنگلی دیہات میں علم کی روشنی بھی آنی شروع ہوئی ہے۔ حکومت نے پہلے دو سالوں میں اس علاقے میں کوئی دو سو نئے مدرسے کھولے ہیں۔ قبائلی اپنے بچوں کو شوق سے ان مدرسوں میں بھیجنے لگے ہیں۔ رنگامتی کے اردگرد موگھ قبیلہ آباد ہے۔ یہ لوگ بڑے ہی خوش الطبع اور دیانت دار ہیں، وہ زندگی کے ہر رنگ کو مسکراہٹ کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور اکثر دوسروں کی نسبت اس سے زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس علاقے میں بہت سے مدرسے کھولے گئے ہیں۔ اس قبیلہ نے تعلیمی افسروں کے ساتھ بڑا تعاون کیا ہے۔

موگھ قبیلہ کے کسی گاؤں میں نکل جاؤ تو وہاں مختلف طور طریقے دیکھنے میں آئیں گے۔ مثلاً

جو شخص آپ سے ملاقات کرنے آئے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت آپ کو بازوؤں میں لے کر خوب بھینچے گا، اس کے بعد وہ دونوں ہاتھوں سے آپ کا ہاتھ اس وقت تھامے رکھے گا جب تک آپ اس سے بات چیت میں لگے رہیں۔ یہ ان لوگوں کے نزدیک تعظیم اور محبت کے اظہار کا طریقہ ہے۔

گائے کی تعظیم

کسی موگھ کے گھر میں داخل ہو کر دیکھیں تو دیوار کے ساتھ چند ٹوکریاں لٹکی نظر آئیں گی جن میں اکثر اوقات مرغیاں انڈے دینے بیٹھتی ہوں گی، یہ اس لیے کہ زمین پر انڈے دینے سے یہ ڈر ہے کہ سانپ انڈے کھا جائیں گے۔ اگرچہ ہر موگھ کی جھونپڑی ایک اونچی ٹیکری پر بنی ہوتی ہے، پھر بھی سانپوں کا خطرہ ہر وقت لگا رہتا ہے۔

چٹا گانگ کے خطے میں یہی وہ علاقہ ہے جہاں گائیں چرتی نظر آتی ہیں، موگھ لوگ نہ اس کا گوشت کھاتے ہیں نہ دودھ پیتے ہیں اور نہ ہی چمڑا استعمال کرتے ہیں، بدھ مت کے پیرو ہونے کے باعث وہ گائے کی پوجا نہیں کرتے ہیں۔ اس کے باوجود گائیوں کا رکھنا بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں گائے کا رکھنا خوش حالی کی علامت سمجھا جاتا ہے، یہ لوگ صدیوں تک ہندوؤں کے پڑوس میں رہے ہیں۔ ہندو مالدار تھے اور گائیں رکھتے تھے۔ موگھ نسبتاً نادار تھے، ان میں سے جو آدمی ذرا آسودہ ہو جاتا وہ گائے رکھ لیتا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ مالدار اور ہندوؤں کا ہم پلہ ہے یہ روایت ایسی جڑ پکڑ گئی ہے کہ اب تک چلی آتی ہے۔

عجیب و غریب طریق کاشت

موگھ گاؤں کے اردگرد کھیتی باڑی کو دیکھو تو یقین نہیں آتا کہ اتنا مختصر سا مزارعہ زقبہ سارے گاؤں کی غذائی ضرورتوں کے لیے کفایت کر سکتا ہے۔ فی الواقع گاؤں والے صرف اسی پر کفایت نہیں کرتے۔ اس باقاعدہ کاشت کے علاوہ وہ "جھوم" کاشت پر بھی مدار رکھتے ہیں "جھوم" جنگل کے کسی صاف کردہ علاقہ میں کی گئی کاشت کو کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ فروری کے مہینے

سی دو ذسب گاؤں والے جنگل میں نکل جاتے ہیں اور کسی پہاڑی ڈھلان پر موزوں جگہ تلاش
کے یہاں سے بانس اور گھاس کاٹ کر سوکھنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں، جب برسات کا موسم قریبا
تا ہے ان سوکھے ہوئے بانسوں اور گھاس کو جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے، اس طرح راکھ کی کوئی ایک فٹ
دبی تہ زمین کے اس قطعہ پر بیٹھ جاتی ہے، جب پہلی بارش ہوتی ہے یہاں بیج بو دیا جاتا ہے۔
س کی صورت بھی بڑی دلچسپ ہے، ہر موگھ اپنے کندھے پر گھر کے تیار کردہ کپڑے کا ایک تھیلا
لٹکاتا ہے۔ اس میں کپاس، تل، مکئی، چاول، سرسوں اور خربوزے وغیرہ کے بیج باہم ملے
ہوتے ہیں، "جھوم" کھیت میں پہنچ کر وہ راکھ میں ایک چوڑا سوراخ سطح زمین تک کھودتا
ہے اور بیجوں کی ایک مٹھی اس میں پھینک دیتا ہے۔ سوراخ راکھ سے ڈھانپ دیا جاتا ہے اور اس سے
قریبًا چھ فٹ آگے اسی طرح کا ایک اور سوراخ کھود کر بیج بوئے جاتے ہیں۔

اب مداری کے پٹارے کی طرح ان سوراخوں میں سے یکے بعد دیگرے رنگارنگ فصلیں نکلنا
روع ہوتی ہیں، سب سے پہلے مکئی اگتی ہے جو جولائی تک تیار ہو جاتی ہے، اس کے بعد خربوزہ
باری آتی ہے، پھر طرح طرح کی سبزیاں جن کے بیج راکھ کے سوراخوں میں پھینکے گئے تھے، اگ
ہیں۔ پھر چاول اور دوسرے اناجوں کی باری آتی ہے، سب سے آخر میں کپاس کی باری آتی ہے۔
کتوبر میں تیار ہونے لگتی ہے، اس طور پر ایک ہی قطعہ زمین موگھوں کو ہر قسم کی فصل عطا کر دیتا ہے۔
ن کے ارد گرد کے کھیتوں میں یہ لوگ انناس، گنے اور دھان کی کاشت کرتے ہیں، لیکن ان کی
کا بڑا حصہ "جھوم" کی فصل سے حاصل ہوتا ہے، کاشت کا یہ عجیب و غریب طریقہ غالبًا اتنا ہی
ہے جتنا جنگل۔

اس میں شک نہیں کہ "جھوم" کے طریق کاشت سے مٹی کی ساری طاقت ایک ہی سال میں ختم
باتی ہے لیکن اگلے سال کاشت کے لیے جنگل کا کوئی نیا ٹکڑا چن لیا جاتا ہے اور چند سال بعد
کاشت شدہ قطعہ بھی دوبارہ زرخیزی حاصل کر لیتا ہے، پہاڑی علاقے کی اکثر زمین حکومت کی
ت ہے، ہر موگھ "جھوم" کے لیے حکومت کو سالانہ کچھ روپے بطور حق مالکانہ ادا کرتا ہے۔

موگھ قبائیلیوں کی عام ذہنی حالت کے متعلق ایک دل چسپ واقعہ نقل کرنا بے محل نہ ہوگا جو حال ہی میں ایک سیاح نے کیا بیان ہے یہ صاحب ایک موگھ گاؤں میں نکل گئے۔ نمبردار نے جس کا نام چینچو رو تھا انہیں گاؤں دکھایا۔ بعد میں انہیں اپنے گھر لے گئے۔ ان کی بیوی کا نام چنیلا تھا مہمان کو دیوار پر دھوئیں سے زرد ہوئی ایک تصویر لٹکی ہوئی نظر آئی۔ اس نے بڑھ کر غور سے دیکھ تو ایک کم عمر جوڑا کھڑا نظر آیا۔ چنیلا نے مسکرا کہا یہ ہم میاں بیوی کا فوٹو ہے جو پچاس برس گذرا شادی کے موقعہ پر لیا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے آج تک فوٹو نہیں کھچوایا۔ یہ سن کر سیاح میاں بیوی کو اکٹھے کھڑا کر کے ایک منٹی کیمرے سے فوٹو تیار کر دیا، یہ فوٹو اچھا خاصہ تھا لیکن چنیلا پر اس کا بہت غیر متوقع اثر ہوا۔ اس نے بڑے افسوس کے ساتھ تصویر کو دیکھا۔ پھر وہ بیٹھ کر سر گھٹنوں پر رکھ لیا، آنکھیں بند کر لیں اور سر ہلا ہلا کر چیخنے لگی ہائے ہائے اتنی بوڑھی ..... ہائے اتنی بوڑھی!!

چٹاگانگ

قبائلی علاقہ میں گھوم کر چٹاگانگ آؤ تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے قدیم زمانوں سے جست لگا کر کوئی شخص یک دم جدید سائنسی دور میں آ پہنچا ہو۔ یہ شہر جو مشرقی پاکستان کا دوسرا ہے پچھلے چند سالوں میں کئی گنا پھیل چکا ہے۔ مشرقی پاکستان کے لیے یہ بندرگاہ شاہ رگ کا درجہ رکھتی ہے، اس لیے حکومت نے اس کی ترقی پر بڑی توجہ صرف کی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان وجود میں آیا چٹاگانگ ایک چھوٹی سی بارونق بندرگاہ تھی۔ مشرقی پاکستان کی ساری پٹ سن سا میل لمبے آبی رستے طے کرتی ہوئی کلکتہ پہونچا کرتی تھی۔ اب یہ صورت حال باقی نہ رہ سکتی تھی بلکہ چٹاگانگ میں اس تجارت سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس کی آبی گذرگاہوں کو گہرا کرنا باقی تھا۔ جہازوں کے ٹھہرنے کے لیے ڈوک اور مال کے ذخیرے کے لیے گودام بنانے باقی تھے لادنے اتارنے کے لیے کرین اور گاڑیوں کی آمدورفت کے لیے ریل کی پٹریاں درکار تھیں۔ لیکن تمام ضرورتوں کے لیے نہ سامان تھا اور نہ کافی روپیہ۔ آخر محنت اور عزم ان رکاوٹوں پر غالب آ

۱۹۴۹-۵۰ء میں اس بندرگاہ سے صرف ۵۵۰۰ ٹن پٹ سن باہر بھیجی گئی تھی۔ لیکن ۱۹۵۰-۵۱ء میں یہ مقدار ۳۰۰۰۰ ٹن کو پہونچ چکی تھی۔

چٹاگانگ کے شمال میں ایک عجیب و غریب زیارت ہے جسے کچھوؤں کی زیارت کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑا جوہڑ ہے جس میں سیکڑوں عظیم الجثہ کچھوے گردنیں نکالے تیرتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ خوش عقیدہ مسلمان عورتیں یہاں ہر وقت جمع رہتی ہیں۔ کناروں پر جگہ جگہ گوشت فروش کچا گوشت لیے بیٹھے ہیں۔ عورتیں گوشت خرید کر کچھوؤں کے سامنے نذر پیش کرتی ہیں۔ بعض عورتیں سب سے بڑے کچھوے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر یہ ہاتھ اپنے ماتھے پر پھیرتی ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ ایسا کرنے سے نرینہ اولاد پیدا ہوتی ہے۔

کاکس بازار

مشرقی بنگال کے انتہائی جنوبی سرے پر کاکس بازار کا قصبہ ہے، چٹاگانگ سے یہاں پہونچنے کے لیے دخانی جہاز میں سفر کرنا پڑتا ہے، آنے جانے والوں کی عموماً اتنی بھیڑ رہتی ہے کہ عرشہ جہاز پر تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ کاکس بازار مچھیروں اور جولاہوں کی بستی ہے۔ یہ لوگ مگ قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور مدتیں گذریں برما سے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ یہ بدھ مت کے پیرو ہیں۔ لوگوں کے مکان زمین سے اوپر بانسوں کے کھمبوں پر بنے ہوئے ہیں، چونکہ سمندری طوفان اکثر آتے رہتے ہیں، اس لیے ان جھونپڑیوں کو مضبوط رسیوں سے سہارا دیا جاتا ہے۔ ہر گھر میں کھڈیاں لگی ہیں اور ہر عمر کی عورتیں تنبا کو پیتی اور گہرے گلابی رنگ کا کپڑا تیار کرتی نظر آتی ہیں۔ کاکس بازار کے اردگرد جنگل کے کناروں پر پرانے وقتوں کے بدھ مندروں کے کھنڈر بکھرے پڑے ہیں۔

مشرقی پاکستان کا بہت بڑا حصہ ہتھیلی کا سا ہموار میدان ہے، سلہٹ اور چٹاگانگ کے علاقے میں پہاڑیاں ہیں، لیکن ان میں چٹانی پتھر نہیں ملتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعمیری ضرورتوں کے لیے سمندر کے راستے درآمد کرنا پڑتا ہے، یہ صورت حال تسلی بخش نہیں۔ چنانچہ علم الارض کے ماہر آجکل کاکس بازار اور دوسرے پہاڑی علاقوں میں پتھریلی چٹانوں کی تلاش کر رہے ہیں۔

سلہٹ

چٹاگانگ سے کشتیوں اور ریل کے ذریعہ شمال کو سفر کرتے ہوئے سلہٹ کا مشہور شہر آتا ہے یہ چائے کی پیداوار کا مرکز ہے۔ مشرقی پاکستان کی اشیائے برآمد میں چائے کا دوسرا درجہ ہے ۱۹۵۲ء میں چٹاگانگ کی بندرگاہ سے پچیس ہزار ٹن چائے باہر بھیجی گئی تھی۔ چائے کے اکثر باغ برطانوی سرمایہ داروں کی ملکیت ہیں۔ ہر باغ نے بہت بڑا رقبہ گھیر رکھا ہے۔ مثلاً خادم ٹی اسٹیٹ کا رقبہ ۱۷۰۰ ایکڑ ہے میلوں تک پہاڑیوں کا سرسبز دامن چائے کی جھاڑیوں سے ڈھکا نظر آتا ہے۔ تجارت کے لیے چائے کے جو مرکب تیار کیے جاتے ہیں ان میں سے اکثر کا بڑا جزو سلہٹ کی چائے بعض دوسرے مقامات پر زیادہ خوشبودار چائے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن مقدار کے لحاظ سے کوئی اور مقام سلہٹ کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ چناں چہ زیادہ خوشبودار پتیوں کو سلہٹ کی چائے کے ساتھ ملا کر مرکب تیار کیے جاتے ہیں۔ چائے کی جھاڑی کے تمام پتے نہیں بلکہ ہر شاخ کی آخری دو نرم پتیاں اور اس کا پھول توڑا جاتا ہے۔ توڑنے کے تین دن بعد ان کو چھانٹ کر آگ پر تیار کیا جاتا ہے اور ڈبوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔

باریسال اور کھلنا

ڈھاکہ سے دریا کے ذریعہ جنوب کو دخانی جہاز چلتا ہے جو باریسال اور کھلنا کو لے جاتا ہے یہ جہاز گدلے دریا میں سفر کرتا اور کنارے کے شہروں پر ٹھہرتا ہوا باریسال پہنچتا ہے، باریسال سے دریائی ڈیلٹا کے کنارے کنارے سفر کریں تو دریائے گنگا اور برہم پتر کے کئی دہانے راستے میں ملتے ہیں جنوب کو بڑھتے بڑھتے سندربن کا مشہور جنگل آتا ہے، یہ جنگل جس کی لمبائی کوئی دو سو میل ہے خلیج بنگال کے ساحل پر واقع ہے بعض مقامات پر دریا کا پاٹ میل بھر ہے، دریائی دہانوں کے درمیانی جزیروں پر سندربن کے جنگل ہیں جنگل کے تقریباً سب درخت ایک سی بلندی اور ایک ہی جسامت رکھتے ہیں۔ ان کی چوٹیوں پر نگاہ ڈالو تو ایسی ہموار زمردیں چادر پھیلی نظر آتی ہے جیسے کہ وسیع میدان کے سبزے کو مشین سے کاٹ کر ہموار کر دیا گیا ہو، زمردیں چوٹی سے نیچے نگاہ ڈالو تو یہ

ت چکنے ۔چمکیلے کیچڑ میں گھڑے نظر آتے ہیں۔ جزیروں کے کناروں پر جانوروں کے پاؤں کے
ن صاف نظر آتے ہیں۔

سندربن میں مشہور شیر بنگال بھی ملتا ہے۔ بلی کی قسم کے جانوروں میں سے صرف بنگالی شیر
ہے جو بے جھجک پانی میں چلتا پھرتا ہے۔ اگر آپ دخانی جہاز میں سندربن کے جزیروں کے
رد گھوم رہے ہیں تو عین ممکن ہے کہ شیر بنگال بھی آپ کو کہیں دریا عبور کرتا ہوا نظر آ جائے
لبہ مرغابیاں اور دوسرے آبی پرندوں کے غول بھی اڑتے نظر آئیں گے۔

گنگا اور برہم پتر کی ان ڈیلٹائی شاخوں میں رنگا رنگ کشتیوں اور جہازوں کا تانتا بندھا
ہے بعض اوقات اتنی بھیڑ ہو جاتی ہے کہ راستہ رک جاتا ہے۔ مشرقی بنگال کی ساری تجارت اور
مد و رفت آبی راستوں ہی سے ہوتی ہے۔ ملک کی گھنی آبادی کی ساری ضرورتوں کے لیے یہ آبی
ز کافی نہیں لیکن ریلوں اور سڑکوں کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی یہی آبی راستے
شرقی پاکستان کو چند در چند مسائل کا سامنا ہے ان میں سے ذرائع آمد و رفت کا مسئلہ
ٹیڑھا ہے۔

رقی پاکستان کے دوسرے مسائل

ذرائع آمد و رفت کے علاوہ مشرقی پاکستان کو کئی دوسرے اہم مسائل کا بھی سامنا ہے۔
یہ حصہ باقی ملک سے اس قدر دور اور الگ تھلگ ہے کہ خطرے کی صورت میں یہاں آسانی
نہیں پہونچائی جا سکتی۔ مگر ملک کی آبادی کا آدھے سے زیادہ حصہ مشرقی پاکستان میں
ہے۔ ملکی آبادی کی بڑی اکثریت کا یوں الگ تھلگ واقع ہونا ایک صورت حال ہے
ی مثال دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں ملتی۔ مشرقی پاکستان میں خواندگی کا تناسب
ہت کم ہے۔ اسی طرح عام صحت کا معیار بھی تسلی بخش نہیں۔ گھنی آبادی ناخواندگی۔
غذا اور پست معیار صحت نے ملک کے اس حصے کو قومی تعمیر کے کام میں پورا حصہ لینے سے
رکھا ہے۔

ان تمام مسائل کے حل زیادہ تر مشرقی پاکستان کے لوگوں کی اپنی کوششوں سے ڈھونڈے جا سکیں گے۔ متحدہ ہندوستان میں بنگالیوں کی ذہانت اور محنت کی ملک بھر میں دھاک تھی۔ لیکن یہ بنگالی مغربی بنگال کے ہندو بنگالی تھے۔ برطانوی حکمرانوں نے مسلمان بنگالیوں کو دانستہ طور پر پسماندہ رکھا۔ یہ افسوس ناک صورت حال کم و بیش دو سو سال تک جاری رہی۔ اس کا نتیجہ آج ایک عام بددلی کی شکل میں نظر آ رہا ہے۔ مشرقی بنگال کا مسلمان آزاد ہونے کے بعد بھی کام کاج میں خاص سرگرمی کا اظہار نہیں کرتا۔ ڈھاکہ امریکی قونصل خانہ کے ایک افسر نے حال میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا۔ قونصل خانہ میں رات کو پہرہ دینے کے لیے ایک چوکیدار ملازم تھا۔ قونصل خانہ میں ایک نیا کلاک منگوایا گیا جسے ہر گھنٹہ کے بعد چابی دینا ضروری تھا۔ چوکیدار نے یہ کہہ کر نوکری چھوڑ دی کہ وہ اس گھڑی کو ہر گھنٹہ بعد چابی دینے کی خاطر ساری رات کی نیند کیوں حرام کرے؟ محنت اور کام کے متعلق اکثر بنگالیوں کا طرز عمل یہی ہے تاہم اس امر کی صاف علامتیں موجود ہیں کہ بددلی کا یہ بادل آہستہ آہستہ چھٹتا جا رہا ہے۔ نئی پود جو روز بروز زندگی کی ذمہ داریاں سنبھال رہی ہے نئی نگاہ اور نئے ارادے لے کر آ رہی ہے۔ ایک انگریز جو عمر کا بڑا حصہ بنگال میں گذار چکا ہے اس بارے میں اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

اس ملک کو جدید بننے میں ابھی وقت لگے گا۔ لیکن آج سے دس سال پہلے اس کی جو حالت تھی اس کے مقابلہ میں اب یہ ناقابل یقین حد تک ترقی کر چکا ہے۔ اگر اور دس سال تک ترقی کی یہی رفتار رہی تو ملک کے سب مسائل حل ہو جائیں گے ؎

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

استانیوں کی تنخواہ

انگلستان جیسے مساوات پسند ملک میں بھی اب تک استانیوں کو استادوں کے برابر تنخواہ نہیں دی جاتی۔ ہر چند کہ دونوں کا کام بالکل ایک ہے، دونوں کے معاوضہ میں کافی فرق ہے۔ یہی حال دوسرے سرکاری محکموں میں کام کرنے والی عورتوں کا تھا۔ عورتوں نے کئی سال سے اس صورت حال کے خلاف مہم جاری کر رکھی تھی، وہ شد و مد سے یہ دلیل پیش کرتی تھیں کہ یکساں کام کی اجرت بھی یکساں ہونی چاہیے ادھر مخالفوں کی طرف سے یہ دلیل دی جاتی تھی کہ مرد کو کنبے کی تمام ذمہ داریاں سنبھالنا ہوتی ہیں جب کہ عورت کے کندھوں پر یہ بوجھ نہیں ہے۔

تاہم عورتوں نے یکساں تنخواہ کی مہم تقریباً اسی جذبے کے ساتھ جاری رکھی جس جذبے کے ساتھ انہوں نے حق رائے دہی کے لیے جہاد کیا تھا، آخر اس مہم میں بھی ان کی فتح ہو گئی، انگلستان میں یہ اصول بنا لیا گیا ہے کہ سرکاری ملازمتوں میں عورتوں اور مردوں کی تنخواہ بالکل برابر ہوگی اس فیصلے کا سب سے زیادہ فائدہ استانیوں کو پہونچے گا کیوں کہ معلمی وہ پیشہ ہے جس میں عورتوں کی تعداد باقی تمام پیشوں کی نسبت زیادہ ہے۔

بعض استادوں نے اس فیصلہ کو بے انصافی کا نام دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ذرا اس استاد کا ذکر کرو جو کنبے کی ذمے داریوں کے بوجھ تلے پس رہا ہے، اب اس کے مقابلے میں اس استانی کا ذکر کرو جو عیال داری کے جھمیلوں سے آزاد ہے، ٹھاٹھ سے رہتی ہے اور جب گرمیوں کی چھٹیاں ہوتی ہیں تو کا ریسٹ رودبار انگلستان کو عبور کرکے سیر گشت کے لیے فرانس پہونچ جاتی ہے۔ اس کے جواب میں استانیوں کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ بیوی بچوں میں زندگی گذارنے کی مسرت سیر و سیاحت کی لذت سے کچھ کم نہیں، اس لیے بے انصافی کا ہر گز کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا

تاہم استادوں کی طرف سے اب یہ مطالبہ ہوا ہے کہ انہیں بچوں کی تعداد کے لحاظ سے الاؤنس ملنا چاہیے: تاکہ عیال داری کا بوجھ سہولت سے اٹھایا جا سکے۔ لیکن یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا تعلق صرف استادوں سے نہیں بلکہ تمام سرکاری ملازموں سے ہے، لہٰذا اس سلسلہ میں جو قدم بھی اٹھایا جائے گا قومی سطح پر اٹھایا جائے گا۔

بعض لوگ حیران ہیں کہ اب ان تنظیموں کا کیا بنے گا جو استادوں۔ استانیوں کی یکساں تنخواہ کی حمایت یا مخالفت کرنے کے لیے قائم کی گئی تھیں؟ بے شک دونوں جنسوں کے بعض مسائل اب بھی مددگار نہ رہیں گے۔ لیکن ان کی اہمیت ایسی نہیں کہ وہ کسی تنظیم کو زندہ رکھ سکیں۔

عالمی زبان

انگلستان کی جدید زبانوں کی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے ایک مقرر نے عالمی زبان کی ضرورت پر زور دیا۔ اس نے کہا موجودہ ایٹمی زمانے میں جب فاصلے کا سوال تقریباً ختم ہو چکا ہے قوموں کے درمیان افہام وتفہیم کی ضرورت بے حد بڑھ گئی ہے، یہ ضرورت ایک عالمی زبان کے بغیر شافی طور پر پوری نہیں ہو سکتی، یہ درست ہے کہ جدید قومی زبانیں بہت سے ثقافتی فوائد کی حامل ہیں۔ لیکن ان کی کمی بالکل واضح ہے۔ مثلاً فرانسیسی زبان میں بڑی روانی سہی لیکن یہ ایک دورافتادہ جرمن گاؤں میں کیا کام دے سکتی ہے؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کی کس زبان کو عالمی زبان کا درجہ دیا جائے۔ اس حیثیت کے لیے بہت سے دعویدار پیدا ہوں گے اور ہر دعوے دار اپنی فوقیت کے لیے دلائل بھی پیدا کرلے گا۔ لیکن مروجہ زبانوں میں سے کسی کو عالمی زبان کا درجہ دینا حسد ورقابت کی آگ بھڑکا دے گا۔ اس دشواری کا ایک ہی علاج ہے وہ یہ کہ اسپرانٹو کو عالمی زبان بنا دیا جائے مقرر نے کہا کہ اسپرانٹو بھی کمیوں سے خالی نہیں۔ پھر اس کے مقابلے پر اور مصنوعی زبانیں بھی ہیں۔ لیکن اسپرانٹو کے حق میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ پہلے ہی وسیع طور پر متعارف ہو چکی ہے اور تمام مصنوعی زبانوں میں سے صرف یہی ایک زبان ہے جس کے زندہ رہنے کی امید کی جا سکتی ہے۔

اب مقرر نے ان اعتراضوں کے جواب دیے جو اسپرانٹو پر وارد کیے جاتے ہیں۔ بڑا اعتراض یہ ہے کہ ہر مصنوعی زبان بے کردار ہوتی ہے، اس لیے اس میں سائنسی اور ٹیکنیکل مباحث کے ادا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس کے جواب میں مقرر نے ان علمی و سائنسی مقالوں سے اقتباس پیش کیے جو پچھلے سال ہالینڈ میں منعقد ہونے والی عالمی اسپرانٹو کانفرنس میں پڑھے گئے۔ بے کرداری کے جواب میں اس نے کہا کہ یہ اعتراض صرف مصنوعی زبان تک ہی محدود نہیں بلکہ ہر زبان پر وارد ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر انگریزی، فرانسیسی جرمن زبان کو بھونڈے لب و لہجہ کے ساتھ بولا جائے تو یہ زبانیں بھی بے کردار بن جائیں گی

مقرر نے تقریر کے خاتمہ پر امید ظاہر کی جدید زبانوں کی کانفرنس بی۔بی۔سی پر زور ڈالے کہ اس کی نشریات میں اسپرانٹو کے اسباق بھی شامل ہوا کریں۔ تقریر کے خاتمہ پر جو بحث ہوئی اس میں یہ انکشاف ہوا کہ اس وقت برطانیہ میں بیس مدرسے ایسے ہیں جن کے نصاب میں اسپرانٹو بھی شامل ہے۔

روسی اسناد

لندن کے روسی سفارت خانہ کے اول سیکرٹری مسٹر کنڈراشیف نے جو پہلے ایک معلم تھے، رسکن کالج آکسفورڈ میں روسی تعلیم پر ایک لیکچر دیا اور اس کے خاتمہ پر طلبا کے کئی سوالوں کے جواب دیے۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا کہ انقلاب کے بعد سے روس کے سامنے یہ مقصد رہا ہے کہ تمام طبقوں میں سے ایک نیا روشن خیال طبقہ پیدا کیا جائے۔ اس وقت روس کے اعلیٰ مدرسوں میں اسی ہزار اسناد ہیں۔ یہ تعداد قبل از انقلاب زمانے کے مقابلہ میں دگنا ہے۔ تعلیمی اداروں کی مالی امداد اور انتظامات بہبود کے بارے میں بڑی دریا دلی سے کام لیا جا رہا ہے، اور طالب علموں کی ایک بڑی تعداد تحقیقی کام میں لگی ہے، جو طلبا اس کام میں ممتاز درجہ حاصل کر لیتے ہیں ان کی مالی مدد بقدر ایک چوتھائی بڑھ جاتی ہے

مسٹر کنڈراشیف سے پوچھا گیا کہ تعلیمی پالیسی کو پارٹی پروگرام کے ساتھ ملحق نہیں رکھا جاتا؟

اس کے جواب میں مقرر نے کہا کہ روسیوں کے خیال میں ملک کا بہترین مفاد اسی میں ہے کہ تعلیمی پالیسی اور پارٹی پروگرام میں یکسانیت رہے۔ تمام پروفیسروں کے لیے لازمی ہے کہ مارکس کے فلسفہ میں یقین رکھیں۔ لیکن اس نظری چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے اختلاف رائے کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ مثلاً علم الالسنہ کے مسئلہ پر اختلاف رائے پیدا ہوا۔

جب یہ پوچھا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ جدید روس نے انیسویں صدی کے روسی ادیبوں کے پایہ کا کوئی آدمی پیدا نہیں کیا تو مقرر نے اس مفروضہ کو درست تسلیم کرنے سے انکار کیا البتہ اس قدر ضرور مانا کہ روس ابھی دوسرا ٹالسٹائی پیدا نہیں کر سکا۔ آخر میں مقرر نے امید ظاہر کی کہ تبادلہ طلبا کے تحت دونوں ملکوں کے طلبا کے لیے ممکن ہو گا کہ ایک دوسرے کے ملک کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ مالی مجبوریوں کے باعث طلبا انفرادی طور پر ایسا نہیں کر سکتے۔ اس لیے بہتر ہے کہ یونیورسٹیاں اس کام کی ذمہ داری اٹھائیں۔

افسانوں سے گریز

بچوں کے لیے کہانی اور افسانے کی کشش ضرب المثل بن چکی ہے لیکن انگلستان کی ایک تازہ اطلاع سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ دور کے بچے افسانے پر سائنس اور فطرت کے ہوش ربا حقائق کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ ایک مشہور برطانوی مدرسے میں فارغ التحصیل طلبا کو جو انعامات دیے گئے۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ طلبا افسانوں کی بجائے ایسی کتابیں پسند کرنے لگے ہیں جن میں جدید سائنس کے کرشموں اور پُرخطر سیاحتوں کا ذکر ہو۔ زیادہ حیرانی اس بات پر ہے کہ بعض صورتوں میں نعت کو افسانے پر ترجیح دی گئی ہے۔ یہ اعداد و شمار صرف ایک مدرسے کے متعلق ہیں، اور وہاں بھی یہ صرف فارغ التحصیل طلبا نے طلبا کی پسند کا آئینہ ہیں، ان باتوں کے پیش نظر ان اعداد و شمار کی بنا پر کوئی ہمہ گیر نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں، تاہم یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے معجزوں نے افسانے کی رنگینی کو بڑی حد تک مات کر دیا ہے۔ نظام شمسی جن ہوش ربا اسرار کا مجموعہ نظر آنے لگا ہے ان کے سامنے ہوش ربا افسانوں کا جادو اتری بھی پھیکی نظر آنے لگی ہے۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ھے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ھے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ھے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر
پنجاب ایجوکیشنل جرنل
اموزش
۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

اره ۵] لاهور [۱ اگست ۹۵۵

اس شمارہ میں

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش (لاہور)

اگست ۱۹۵۵ء

جلد ۸

شمارہ ۵

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

اداریہ

ثانوی تعلیم کی تشکیل نو

کچھ دن ہوئے بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے صدر پروفیسر سراج الدین کی طرف سے ایک اخباری بیان میں یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ ثانوی تعلیم کی تشکیل نو کا جامع منصوبہ بہت جلد منظر عام پر آنے والا ہے، اس سلسلہ میں ایک قدم یہ اٹھایا گیا ہے کہ اس سال میٹرک کے امتحان میں جن مدرسوں کے امتحان کے نتیجے بہت خراب رہے ہیں ان کے متعلق یہ تحقیقات کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ ان میں پڑھانے والے استادوں کی تعلیمی قابلیت کا کیا حال ہے؟ ان کی عمارت، سائنس سامان کتب خانہ اور دوسرے تدریسی لوازمات کس معیار کے ہیں۔

یہ اقدام بے حد پسندیدہ ہے۔ ثانوی تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد اس تیزی سے بڑھ ہی ہے اور موجودہ مدرسے اس تعداد سے عہدہ برا ہونے سے اس قدر عاجز ہیں کہ طلبہ اور ان کے الدین ہر اس کاروباری ادارے پر بھروسہ کرنے کے لیے مجبور ہیں جو اپنے نام کے ساتھ اسکول یا کالج دہ چلا چسپاں کرے تعلیمی معیاروں کے گرانے میں ایسے نام نہاد پرائیویٹ مدرسوں کا بڑا ہاتھ ہے جو سی تعلیمی خدمت کے خیال سے نہیں بلکہ محض روپیہ کمانے کی غرض سے درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیے ٹھے ہیں، یہ مدرسے معیاری فیس وصول کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات ان کی فیس اور چندے مل ملا کر سرکاری رس فیس سے بھی بڑھ جاتے ہیں لیکن عموماً نہ ان کے استاد تربیت یافتہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کا عام ل تعلیمی اعتبار سے پسندیدہ۔ تعلیمی معیاروں کو اونچا کرنے کے لیے صرف نصاب کی تشکیل نو کافی نہیں ہوگی اس کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ مدرسوں کے ساز و سامان اور ان کے اساتذہ کی قابلیت کے معیاروں ڑا احتساب قائم کیا جائے۔ نصاب بذات خود لاکھ اچھا ہو۔ اگر پڑھانے والے اچھے تدریسی فنوں سے کام لینا نہیں جانتے اور مدرسہ معمولی تدریسی سہولتوں اور پسندیدہ ماحول سے عاری ہے

تو نصاب از خود کوئی معجزہ پیدا نہ کر سکے گا۔

بورڈ آف سکینڈری ایجوکیشن نے اس سال پہلی بار میٹرک کا امتحان لیا ہے اس میں کامیاب ہونے والے امیدواروں کا تناسب پچھلے سالوں کے مقابلہ میں بھی کم ہے، پرائیویٹ امیدواروں کی صورت میں یہ تناسب بے حد مایوس کن ہے بعض لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ بورڈ نے تعلیمی معیاروں میں کیا بلندی پیدا کر دی؟ نتیجہ سخت نکالنے سے کیا ہوتا ہے؟ یہ استدلال بڑی بے خبری کی دلیل ہے۔ بورڈ نے نتیجہ کے معاملہ میں کسی غیر معمولی سختی سے کام نہیں لیا ہاں اس نے یہ ضرور کیا کہ ان خرابیوں کو کچلنے کے لیے سخت اور مؤثر ذرائع اختیار کیے جو کئی سال سے نظام امتحان کے لیے بدنامی کا باعث بنی رہی تھیں، ان خرابیوں کے دور ہونے سے نتیجہ اور نیچے گرنا ناگزیر تھا۔

اب اگلا قدم تدریسی سازوسامان کی کمی اور ناقص تدریسی طریقوں کے تدارک کا ہے، اس سمت میں یقیناً پہلا قدم یہی ہونا چاہیے تھا کہ ان کوتاہیوں کی کیفیت اور کمیت کے متعلق صحیح اعداد و شمار حاصل کیے جائیں۔ یہ غالباً موزوں تھا کہ پہلے ان مدرسوں کے متعلق کوائف جمع کیے جائیں جن کے نتائج سخت ناتسلی بخش ہیں لیکن ہم یہ گذارش کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ محض نتائج کو مدرسے کی خوبی کا معیار قرار نہیں دیا جا سکتا، اچھا نتیجہ دکھانے والے مدرسوں میں بھی بعض ایسے ہو سکتے ہیں جنہوں نے یہ نتیجہ ناقص اور ناپسندیدہ طریقہ ہائے تدریس کی بدولت دکھایا۔ اس لیے اب اگلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ تسلی بخش نتیجہ دکھانے والے مدرسوں کے طریقہ ہائے تدریس کا جائزہ لیا جائے بورڈ کو چاہیے کہ وہ نہ صرف تدریسی سازوسامان پر احتساب قائم کرے بلکہ تدریسی طریقوں پر بھی۔ یہ دونوں احتساب اس بات کے ضامن ہوں گے کہ ترمیم شدہ نصاب اپنے اصل مقاصد کو حاصل کرے۔

گھوڑا گلی میں دو ہفتے

فضل احمد

گھوڑا گلی کی ورکشاپ کو شروع ہوئے دوسرا دن تھا۔ میں استادوں کی جماعت کے ساتھ وحدتی طریق تدریس کی تفصیلوں کے متعلق بات چیت کر رہا تھا۔ اچانک جماعت کے آخری حصہ سے آواز آئی: "میرے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وحدتی طریق پر پڑھانے کے لیے مدرسے میں ایک کتب خانہ ہونا چاہیے جس میں آسان پیرائے میں لکھی ہوئی کتابیں کافی ہوں۔ مدرسے میں دو ایک اخبار اور کچھ رسالوں کا آنا بھی ضروری ہے"۔

یہ سوال ڈاکٹر غلام یسین خان نیازی انسپکٹر ٹریننگ مدارس نے کیا تھا جو محکمہ کی طرف سے بطور مبصر ورکشاپ میں تشریف لائے تھے۔ ورکشاپ کے خاتمہ سے دو ایک دن پہلے استادوں کی جماعت کی طرف سے اصرار کیا گیا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف بھی انہیں اپنے خیالات سے آگاہ کریں۔ اس پر انہوں نے فرمایا: — میں نے اس ورکشاپ میں بطور انسپکٹر نہیں بلکہ بطور ایک طالب علم کے شرکت کی ہے۔ اس کے قیام کا حسن کہ مجھے خیال پیدا ہوا کہ اس تعلیمی اجتماع اور اس کے نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ وحدتی طریق تدریس کے متعلق مجھے اول اول زیادہ خوش فہمی نہ تھی اور نہ ہی ورکشاپ کے نتائج کے متعلق بہت زیادہ توقعات تھیں لیکن پچھلے دس بارہ دنوں میں آپ حضرات کے نقطۂ نگاہ میں آہستہ آہستہ جو تبدیلی ہوئی ہے اس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وحدتی طریق تدریس کو پاکستانی مدرسوں میں رائج کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ حضرات اس نئے طریقے کو اپنے مخصوص حالات کے مطابق ڈھالیں۔ اپنے اپنے مدرسوں میں جا کر آپ اس تعلیمی تجربے کو آزمائیں۔ کوشش کی جائے گی کہ چند ماہ بعد آپ حضرات دوبارہ یکجا ہو کر اپنے تجربوں کے نتائج پر تبادلہ خیالات کر سکیں۔ اس ورکشاپ نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ گرمائی نصاب ہمارے استادوں کے لیے کس قدر مفید ہو سکتے ہیں اور ان کی کتنی شدید ضرورت ہے۔ میں محکمہ سے درخواست کرنے والا ہوں کہ گرمائی نصابوں کا کوئی مستقل بندوبست کیا جائے۔

تجدید نصاب کے لیے جو ورک شاپ گھوڑا گلی میں ۲ جولائی سے ۱۶ جولائی تک جاری رہی یہ اس کی کارکردگی کے متعلق سرکاری مبصر کا بے لاگ تبصرہ تھا۔ اس تعلیمی افادیت کے ساتھ ہی یہ دو ہفتے بڑی دلچسپ جامعتی زندگی سے بھرپور رہے۔ نیچے کی سطروں میں ان طرح طرح کی دلچسپیوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

لاہور سے گھوڑا گلی

ابتدائی تجویز یہ تھی کہ گھوڑا گلی کی ورک شاپ جون کے مہینے میں ہو۔ مگر بعض مجبوریوں کے باعث اسے جولائی کے پہلے ہفتے تک ملتوی کرنا پڑا۔ ایک اعتبار سے یہ التوا اچھا ثابت ہوا کیونکہ جولائی کے آغاز ہی میں دستور ساز اسمبلی مری میں اپنا اجلاس منعقد کر رہی تھی۔

ورک شاپ کا اہتمام سنٹرل ٹریننگ کالج اور واشنگٹن سٹیٹ یونیورسٹی (امریکہ) کی طرف سے کیا گیا تھا۔ امریکی طرف سے ڈاکٹر اوبسی بشوائزتاگ اور ڈاکٹر آلیمن پڑھانے والے اساتذہ میں شامل تھے اور ٹریننگ کالج کے پروفیسروں میں سے فرحت اللہ خاں، شیخ عبدالحق، انیس الدین انصاری، شیخ معزالدین، فضل احمد اور فضل محمد خاں اس خدمت پر مامور کیے گئے تھے۔ ورک شاپ کے تمام انتظامات پروفیسر فضل محمد خاں صاحب کے ذمہ تھے۔ اس لیے وہ باقی رفقاء سے دو ایک دن پہلے روانہ ہو چکے تھے۔ باقی اصحاب ۲ جولائی کی صبح کو پنجاب ٹرانسپورٹ کی پانچ بجے والی بس سے روانہ ہوئے۔

لاہور میں کئی دنوں سے سخت گرمی پڑ رہی تھی مگر ۲ جولائی کو علی الصبح اٹھے تو مطلع ابر آلود تھا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور بادل لگاتار اڈے سے چلے آ رہے تھے۔ لاہور سے جہلم تک تقریباً یہی کیفیت رہی۔ بعد ازاں بادل اونچے ہو گئے۔ لیکن موسم زیادہ شدید نہ ہونے پایا۔ ہماری بس کو سیدھا مری جانا تھا۔ ورک شاپ میں شرکت کرنے والے کچھ اساتذہ لاہور ہی سے ہمارے ہم سفر تھے۔ کچھ اساتذہ راولپنڈی سے شریک ہو گئے۔ شیخ معزالدین صاحب راولپنڈی ہی سے ہمارے ساتھ ملے یہ ایبٹ آباد سے آئے تھے جہاں وہ گرمی کی چھٹیاں گذار رہے تھے۔

راولپنڈی میں بس کوئی آدھ گھنٹہ ٹھہری۔ سب نے جلدی میں دوپہر کا مختصر کھانا کھایا اور آگے چل دیے۔ سترہویں میل پر جہاں پہلے ہر مسافر سے محصول وصول کیا جایا کرتا تھا۔ اب محض

فوجی پولیس کی پڑتالی چوکی رہ گئی ہے۔ اس سے کافی دور آگے نکل جانے پر بھی ابھی ہوا میں خنکی
محسوس نہ ہوتی تھی جتنی کہ زیٹ سے دو ایک میل آگے زیادہ گہری چڑھائی شروع ہوئی جو گھوڑا گلی
تک تقریباً بدستور چلی گئی اب پہاڑوں پر چیڑ کے درخت دکھائی دینے لگے اور ہوا قدم بقدم
ٹھنڈی محسوس ہونے لگی۔ کوئی دو بجے بعد دوپہر ہم سکاؤٹ ہیڈ کوارٹر کے بالمقابل مری بروری کے
شاپ پر آن پہونچے۔

قیام گاہ

پنجاب بوائے سکاؤٹس کا گرمائی صدر مقام اب جس رقبے میں ہے وہ تقسیم سے پہلے مری بروری۔
(جو کہ شراب کا کارخانہ) کی ملکیت تھی۔ یہ ایک سرسبز پہاڑی ہے جس کی جنوبی حد محکمہ جنگلات
کے رقبے اور شمالی حد لارنس کالج کے رقبے سے ملی ہوئی ہے۔ اس کے سنگلاخ قدم ایک برساتی پہاڑی
لہ میں گڑے ہیں اور اس کی چوٹی پر بوائے سکاؤٹس کا گرمائی کیمپ ہے۔ راولپنڈی سے مری
جانے والی سڑک اس پہاڑی کے تقریباً وسط میں سے گذرتی ہے۔ سڑک سے نچلا حصہ زیادہ تر
رہنہ اور سنگلاخ ہے لیکن سڑک سے اوپر کا حصہ درختوں سے ڈھکا ہوا اور دل فریب ہے
ریباً قریباً یہی حال آس پاس کی دوسری پہاڑیوں کا ہے۔

سڑک سے پہاڑ کی چوٹی تک تقریباً چار فرلانگ کا فاصلہ ہے لیکن راستہ میں صرف
یک فرلانگ اوپر مری بروری کا وہ وسیع و عریض ہال ہے جو مارٹ ہاؤس کے نام سے پکارا جاتا ہے
رک شاپ میں شریک ہونے والے اساتذہ کی قیام گاہ یہی ہال تھا۔ اس سے سو گز کے قریب
ائیں ہاتھ کو ایک اور چھوٹی سی عمارت ہے جو ایک کمرے اور برآمدے پر مشتمل ہے۔ نہ معلوم مری بروری
الے اس سے کیا کام لیتے تھے۔ آج کل یہ گرل گائڈز کا گرمائی کیمپ ہے۔ چونکہ ورک شاپ کے
نوں میں گرل گائڈز کی کوئی جماعت گھوڑا گلی نہیں آ رہی تھی اس لیے یہ کمرہ ٹریننگ کالج کے
ونیروں کے حوالے کر دیا گیا۔ فی الحقیقت ان لوگوں کی رہائش کے لیے اس عمارت کے دونوں طرف
ے نصب کیے گئے تھے اور عمارت کو ورک شاپ کے دفتر کے طور پر استعمال ہونا تھا لیکن
لی ہی رات بارش اور آندھی نے وہ سماں باندھا کہ لاہوری زندگی کے عادی لیکچراروں نے
دری پناہگاہوں کی وفاداری پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے اس کمرے میں پناہ لی۔ زاں بعد یہی دستور رہا

کہ دن کے وقت یہ کمرہ دفتر کا کام دیتا اور اس کا برآمدہ کمرہ جماعت کا لیکن دن کا کام ختم ہوتے ہی کمرہ خواب گاہ میں بدل جاتا اور برآمدہ طعام گاہ میں۔

اس میں کلام نہیں کہ ہماری قیام گاہ نہایت پر فضا نواح میں واقع تھی، اس کے مغربی برآمدے میں بیٹھے گھوڑا گلی کی پوری وادی زیر قدم نظر آتی تھی۔ کوئی ایک فرلانگ نیچے سیاہ سانپ کی طرح پیچ و خم کھاتی ہوئی وہ سڑک نظر آتی تھی جو مری کو راولپنڈی سے ملاتی ہے اور پنجاب کے گرمائی صدر مقام کے لیے شاہ رگ کا درجہ رکھتی ہے، جنوب کی طرف یہ سڑک میل سوا میل نیچے گھوڑا گلی کی بستی تک دکھائی دیتی تھی اور شمال میں کم سے کم دو میل اوپر تک۔ اس پر سارا دن کاروں، بسوں، ٹرکوں اور فوجی گاڑیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ سڑک سے یک دم نیچے وہ نیم سنگلاخ بیضوی شکل کی تنگ وادی تھی جس کے مغربی کنارے کے پہاڑ صوبہ سرحد اور پنجاب کی سرحد بناتے ہیں، اس وادی میں جگہ جگہ دہقانوں کے سبز جیبوں کی شکل کے کھیت اور ان کی چپٹی چھتوں کی جھونپڑیاں بکھری ہوئی نظر آتی تھیں، بہت سے مکانات گہری وادی کے ٹھیک اوپر پہاڑیوں کی چوٹیوں پر اس طرح اٹکے نظر آتے تھے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ یہ لوگ زمین و آسمان کے درمیان یوں اٹکے ہوئے اپنی زندگی کی ضرورتیں کس طرح پوری کرتے ہیں۔ غرض ہم اپنے برآمدے میں بیٹھے بیٹھے ایک ایسے دلچسپ اور دل فریب منظر کا مزہ لے سکتے تھے جس کی کشش اور رنگینی بے بہا تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس قیام گاہ کی دعوت نظارہ نے بڑے بڑے ممتاز لوگوں سے خراج تحسین وصول کیا ہے پیرزادہ ایم۔ اے مخدومی گھنٹوں اس برآمدہ میں بیٹھے رہتے اور اس منظر سے لطف اٹھاتے۔

ہماری جائے رہائش سے تقریباً تین فرلانگ اوپر سکاؤٹ کیمپ تھا۔ یہاں سے محکمہ جنگلات کے بنگلہ کے مقابل گھوڑا گلی گاؤں تک جنگل کے بیچوں بیچ پہاڑ کے سینے کو چیرتی ہوئی ایک کشادہ سڑک بنی تھی اس پر گذرنے والے لوگ، گھوڑے گدھے اور اونٹ بھی ہماری جائے رہائش سے نظر آسکتے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ خوب صورت منظر اس رات کا ہوتا جب آسمان صاف ہوتا اور آسمان پر ستارے ٹمٹما رہے ہوتے، سورج غروب ہونے کے بعد جب سیاہی کی چادر بیضوی وادی کو ڈھانپ لیتی تو پہاڑیوں کے سنگلاخ قدموں سے لے کر ان کی چوٹیوں تک جگہ جگہ ٹمٹماتی روشنی کے نقطے ظاہر ہو جاتے، یہ دہقانوں کے گھروں کے چراغ یا جلتی ہوئی آگ تھی لیکن

فضلوں گمان گذرتا جیسے تاروں بھرے آسمان کا ایک حصہ غلاف کی شکل میں ساری وادی پر چھا
گیا ہو، چند مرتبہ بعض دوستوں کو فی الحقیقت یہ معلوم کرنے میں غلطی ہوئی کہ ستارے کس جگہ ختم ہوتے
ہیں اور دیہاتوں کی روشنیاں کس جگہ سے شروع ہوئی ہیں۔

اس سارے قدرتی حسن اور دل فریبی کے ساتھ اس علاقہ کے ارد گرد کچھ ایسے آثار بھی تھے
جو بڑی عبرت کا سامان تھے۔ پیچھے کہا گیا ہے کہ تقسیم سے پہلے یہ جگہ ایک بہت بڑے صنعتی ادارے
کا صدر مقام تھی۔ مری بروری کی تیار کردہ جو کی شراب "مری بیئر" ملک بھر میں شہرت رکھتی تھی۔
تقسیم ملک پر تعصب اور مذہبی جنون کے جو شعلے بھڑکے انہوں نے مری بروری کی عمارتوں کے
ایک بہت بڑے حصے کو بھی خاک سیاہ کر دیا۔ شراب سازی کے خلاف غم و غصہ کے جذبات کو
آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن عمارتوں اور صنعتی ساز و سامان کو جو قیمتی قومی املاک تھیں
کیوں ضائع کیا گیا؟ اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے۔ عالی شان صنعتی عمارتوں کے آہنی
ڈھانچے۔ جو نے پتھر اور شیشے کے ڈھیر آج اٹھارہ سال گذر جانے پر بھی اپنی گذری ہوئی کہانی
سنا رہے ہیں۔ آج ان بچے کھچے کھنڈروں میں راجوری (کشمیر) کے حرماں نصیب مہاجر بستے ہیں
یاس و حسرت کے پیکر ان خطرناک کھنڈروں میں جس غلاظت اور غلاظت کی زندگی گذر رہے
ہیں اسے دیکھ کر شاید درو وحشت بھی سر جھکا لے۔ ان کی ساری پونجی چند دبلی بکریاں اور مریل سی
گائیں ہیں۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے کم عمر بچے جنہیں مدرسے جانے کی تیاری میں مصروف
ہونا چاہیے تھا، اور جھونپڑوں میں مایوس عورتیں جنہیں گھر کی صفائی اور بچوں کی دیکھ بھال
میں لگے ہونا چاہیے تھا، بکریوں اور گائیوں کو جنگل کی طرف ہانکتے نظر آتے تھے۔ جونہی کوئی
لاری سکاؤٹ کیمپ کے سامنے رکتی اور اس میں سے سکاؤٹوں یا سکاؤٹ ماسٹروں کی جماعتیں
اترتیں یہ کم عمر بچے چند آنوں کے لیے بھاری سامان اٹھانے بھاگے آتے۔ جنگل کو جانے کے لیے
ان کا راستہ ہماری قیام گاہ کے آگے سے گذرتا تھا۔ یہاں سے گذرتے وقت یہ لڑکے لڑکیاں
سب سے ہر اس شخص کے سامنے ہاتھ پھیلاتے جو اتفاقاً کمرے سے باہر بیٹھا ہوتا۔ کئی دفعہ
کھانے کے وقت بھی یہ بچے مانگنے کے لیے آموجود ہوتے۔ افسوس کہ انسانی شرف اور ابتدائی انسانی
حقوق کی یہ مٹی ایسے مقام پر پلید ہوتی تھی جو آزاد مملکت پاکستان کی آمد سے پہلے منفعت بخش

صنعتی گہما گہمی کا مرکز تھا۔ یہ روح فرسا منظر ہر صاحب نظر پاکستانی کی اس امر کی تلخ یاد دہانی کے لیے کافی تھا کہ گو ہم نے تعمیر ملت کے میدان میں کافی کچھ کیا ہے، ابھی اس سے کئی گنا کرنا باقی ہے۔ ہمارے بڑے بڑے بارونق شہروں میں امیرانہ ٹھاٹھ اور جدید زندگی کی چکا چوند کے زیر سایہ ابھی ہزاروں ایسے بدنصیب بھی بس رہے ہیں جو مہذب زندگی کی مبادیات سے بھی محروم ہیں، ان لوگوں کو یہ سہولتیں بہم پہونچائے بغیر جمہوریت اور اسلام کا نام لینا ایک بہت بڑے تمسخر کے سوا کچھ نہیں۔

سکاؤٹ کیمپ

سکاؤٹ کیمپ ہماری قیام گاہ سے ٹھیک تین فرلانگ اوپر تھا لیکن گہری چڑھائی پر واقع ہونے کے سبب یہ آدھ میل سے کم راستہ خاصہ مشکل معلوم ہوتا تھا، پہاڑی کی چوٹی پر خاصے چوڑے چند ہموار قطعے ہیں، بس یہی پنجاب سکاؤٹس کا گرمائی صدر مقام ہے۔ یہاں جگہ جگہ خیمے نصب تھے ان دنوں سکاؤٹ ماسٹروں کی ایک جماعت تربیت کے لیے آئی ہوئی تھی، ان کا پندرہ روزہ نصاب ہماری ورک شاپ کے ساتھ ہی شروع ہوا تھا۔ اس کے پہلو بہ پہلو سکاؤٹ لڑکوں کا نصاب بھی جاری تھا۔

سکاؤٹ کیمپ میں کوئی مستقل عمارت موجود نہیں، سوائے اس کے کہ ایک پختہ چبوترے پر ایک چھپّر پڑا ہے، یہ سکاؤٹ کیمپ کی مسجد ہے۔ ہمیں اس مسجد میں صرف ایک جمعہ کی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ نمازیوں کی تعداد کوئی دو درجن سے زیادہ نہ تھی، حالاں کہ اس وقت کیمپ میں کم سے کم اس سے چارگنا تعداد موجود تھی۔ نارتھ ویسٹرن ریلوے سکاؤٹوں کی ایک جماعت اسی روز کیمپ میں پہونچی تھی، یہ لوگ مسجد سے تھوڑی دور ڈیرے ڈالے پڑے تھے، خاص طور پر دعوت دیے جانے پر بھی ان میں سے چند ایک کے سوا کسی نے نماز جمعہ میں شرکت نہ کی۔ نماز کے بعد کیمپ کا چکر لگانے پر کچھ خیموں میں چند فرنچ وضع کی ڈاڑھیوں والے اسکاؤٹ ماسٹر بھی بیٹھے دکھائی دیے لیکن معلوم نہیں یہ لوگ ”اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ“ کے خدائی حکم کی تعمیل سے کیوں قاصر رہے۔ بہرحال احساس فرض کا مثالی نمونہ پیش کرنے کے دعویدار اسکاؤٹوں کا ایک اہم خدائی فرض کی ادائیگی سے یوں تغافل برتنا بے حد حیران کن معلوم ہوتا تھا۔

اسکاؤٹ تنظیم میں شامل ہوتے وقت ہر شخص ایک حلف اٹھاتا ہے جس میں دوسری باتوں کے علاوہ اس بات کا عہد بھی کیا جاتا ہے کہ میں اپنے خدا کی طرف سے عائد ہونے والے فرائض کو پورا کروں گا۔ ایک مسلمان کا خدا اس پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ وہ دن میں پانچ مرتبہ اس کے دربار میں حاضری دے اور سال بعد پورے ایک مہینے کے روزے رکھے، جو شخص سکاؤٹ ہو کر محض تن آسانی کی خاطر ان خدائی فرائض سے منہ موڑے معلوم نہیں اسے سکاؤٹ عہد پر کس طرح قائم سمجھا جا سکتا ہے؟ ہماری ریاستوں میں غالباً پاکستان ہی وہ ریاست ہے جس کا بنیادی تصور ہی مذہبی اقدار کی پیداوار ہے اس لیے اگر اسکاؤٹ تحریک اس ملک میں زندگی کی حقیقی توانائی حاصل کرنا چاہتی ہے تو اسے اسلام کی مذہبی اقدار کو نقطہ مرکز بنانا ہوگا، جب تک ایسا نہیں کیا جاتا اس وقت تک پاکستانی سکاؤٹوں پر وہی الفاظ صادق آئیں گے جو مرحوم لارڈ بیڈن پاول نے ہندوستانی سکاؤٹوں کے متعلق کہے تھے۔

سکاؤٹ کیمپ کی مسجد کے پیچھے ایک چھوٹا سا اور چبوترا ہے جس پر ایک درخت کی گھنی شاخوں نے چھتری تانی ہے، ان شاخوں کے ساتھ جگہ جگہ رنگ برنگی دھاگے لٹکے دکھائی دیے۔ ایک شاخ کے ساتھ ایک سبز جھنڈا بندھا تھا، یہ اس بات کی علامتیں تھیں کہ کوئی زیارت گاہ ہے۔ تاہم یہاں قبر کا کوئی نشان نہ تھا۔ معلوم ہوا یہ وہ جگہ ہے جہاں مشہور صوفی بزرگ حضرت بری امام نے بیٹھ کر کچھ عرصہ ریاضت کی تھی، اس چبوترے سے ذرا نیچے شفاف ٹھنڈے پانی کی ایک دھار گر رہی تھی۔ سکاؤٹ کیمپ میں پینے اور نہانے دھونے کا پانی اسی سے لیا جاتا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ پانی جو اپنی خنکی اور خاصیت میں سری نگر کے مشہور شاہی چشمہ کے پانی سے ملتا جلتا ہے حضرت بری امام کی دعا پر جاری ہوا تھا، اس سے پہلے یہاں پانی نہ تھا۔ پاس ہی چنار کے دو بڑے درخت کھڑے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ درخت بھی حضرت بری امام صاحب ہی کی یادگار ہیں۔ سکاؤٹ کیمپ کے منتظمین نے چبوترے کے پیچھے چند سالوں سے ایک چنار کا پودا لگا رکھا ہے، لیکن چند سال گذر جانے کے بعد بھی یہ اب تک چند فٹ سے زیادہ لمبائی اور انگلی سے زیادہ موٹائی حاصل نہیں کر سکا۔

لارنس کالج

ہماری قیام گاہ سے ٹھیک چھے فرلانگ اوپر پنجاب کا مشہور تعلیمی ادارہ لارنس کالج واقع تھا۔ یہ دراصل ایک مدرسہ ہے جو پنجاب کے انگریز حکمرانوں نے صرف اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے

برطانوی پبلک اسکولوں کے نمونے پر قائم کیا تھا، چوں کہ خود برطانوی پبلک اسکول اعلیٰ طبقے کے بچوں کے لیے مخصوص تھے اور ان مدرسوں کا سب سے بڑا مقصد ہی یہ تھا کہ زیر تربیت بچوں میں حکمرانہ خو بو کو فطرت ثانی بنایا جائے۔ اس لیے لارنس کالج گھوڑا گلی کی ذہنی فضا پہلے دن سے مخصوص استعماری روایات سے لبریز رہی ہے۔

مدرسہ نہایت پُرفضا نواح میں واقع ہے، یہ ایک رہائشی مدرسہ ہے۔ اس لیے طلبہ کی شبانہ روز زندگی کی ساری ضرورتیں نہایت اعلیٰ پیمانے پر پوری کی گئی ہیں۔ پڑھانے والے استادوں کے مکانات بھی کالج کے احاطہ ہی میں واقع ہیں۔ کالج کا کل رقبہ کئی سو ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے، اس رقبے میں نہ صرف کئی عمارتیں، کھیل کے میدان، نہانے کا تالاب، سائنس کی تجربہ گاہیں، ہوسٹل وغیرہ واقع ہیں۔ بلکہ اس کے ایک بڑے حصے کو طرح طرح کے درختوں نے ڈھانپ رکھا ہے، اس رقبہ کی سب سے اونچی چوٹی پر لارنس کالج کا ابتدائی مدرسہ واقع ہے اور اس چوٹی کے سب سے اونچے نقطہ پر کلیسا کی عمارت سر اٹھائے کھڑی ہے۔ آج اگرچہ پڑھنے اور پڑھانے والوں کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے، پھر بھی گرجا مٹھی بھر عیسائیوں کی اتواری ضرورتوں کے لیے وقف ہے۔ نماز پڑھنے والوں کے لیے اسکول کی عمارت کا ایک کمرہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ دریافت کرنے پر بتایا گیا کہ طلبہ کے لیے صرف مغرب کی نماز ادا کرنا لازمی ہے۔

پاکستان کی آمد کے بعد لارنس کالج کی فضا میں بہت کچھ تبدیلی پیدا ہو چکی ہے، پھر بھی اس کی پرانی روایات میں سے بعض بدستور باقی ہیں، یہ مدرسہ آج بھی ایک خاص طبقہ کے بچوں کے لیے مخصوص ہے، نہ صرف یہاں کے اخراجات بھاری ہیں بلکہ داخلہ کے لیے لمبی انتظاری فہرستیں بنی رہتی ہیں، ان حالات میں کسی مفلس لیکن قابل لڑکے کا یہاں داخل ہونا قریباً محال ہے بھاری فیس کے باوجود یہ مدرسہ صوبائی میزانیہ پر بہت بڑا بوجھ ہے۔

ورک شاپ میں شرکت کرنے والے استادوں میں سے بعض نے پرنسپل لارنس کالج سے مدرسہ کو پڑھائی کے وقت دیکھنے کی اجازت چاہی مگر یہ درخواست اس بنا پر منظور نہ کی گئی کہ گرمی میں ممتاز لوگوں کی آمد کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ ان میں سے کئی اس مدرسے کو پڑھائی کے اوقات میں دیکھنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ لیکن یہ امر بچوں کی توجہ کو کام سے ہٹانے کا موجب ہوتا ہے، اس لیے

ں قسم کی درخواستیں اصولی وجوہ کی بنا پر قبول نہیں کی جاتیں۔ تاہم راقم کو مدرسہ کے سینئر طلبہ کو
یب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ شیخ معز الدین صاحب اس مدرسہ کے سابق استاد ہیں
دونوں ایک دن مدرسہ میں جا نکلے، شیخ صاحب کو ایک سابق رفیق کار نے دفتر میں بٹھایا
نے میں چھٹی کی گھنٹی بجی اور طلبہ کے باہر نکلنے کا شور سنائی دیا۔ ہم نے جانا چاہا تو میزبان نے
آ ایسے طلبہ کے ساتھ اوولٹین کا ایک ایک گلاس پی لیجیے۔ یہ تواضع آج اوولٹین کمپنی کی
ف سے مفت کی جا رہی ہے، طلبہ یونی فارم میں ملبوس تھے جو نیلی قمیص اور خاکی پتلون پر مشتمل تھی
ے کی عام قلت کے باعث بعض طلبہ کے کپڑے معیاری رنگ کے نہ تھے، ہم جس میز پر بیٹھے
ں پر چار یا پانچ سیانے لڑکے بھی بیٹھے تھے۔ ہر ایک کے سامنے ایک چھوٹی پلیٹ میں دو دو بسکٹ
رے گئے۔ اتنے میں اوولٹین کمپنی کا ملازم مشروب کے گلاس ٹرے میں لے آیا اور سب کے سامنے
ایک گلاس رکھ کر آگے بڑھتا گیا، استاد صاحب کے خاص اشارے پر وہ ہمارے میز پر دوسرا
ے کر آیا۔ شیخ صاحب اور میں نے شکریہ کے ساتھ یہ پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن
پر بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں نے حریصانہ طور پر ان گلاسوں پر حملہ بول دیا اور چند لمحوں میں
کا صفایا کر دیا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ظاہرداری اور وضع داری دونوں کو ٹھکرا دیا
جاتا ہے، وہاں بیسیوں مدرسوں میں طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کا اتفاق ہوا، ان میں اعلیٰ
ے اور متوسط سبھی طبقوں کے بچے ہوتے تھے، لیکن کسی موقع پر بھی وہ منظر دیکھنے میں نہیں آیا جو
ب کی اس امیر ترین تربیت گاہ میں دیکھا۔

مری بروری سے لارنس کالج تک ایک تنگ پختہ سڑک بنی ہے، دراصل یہ سڑک لارنس
سے آگے مری کو نکل جاتی ہے، یہ سڑک اس زمانے کی یادگار ہے جب مری بروری اپنے
ج پر تھی، یہ سڑک اتنی عمیق ہے کہ اس پر اوپر کو جانا نیچے اترنے کی نسبت سہل معلوم ہوتا ہے
ی میں بعض اوقات قدم سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے چیل کے گھاس جیسے خشک چکنے پتوں نے اس
ک کو اتنا پھسلنا بنا رکھا تھا کہ چند مرتبہ ہمارے ساتھیوں میں سے دو ایک پھسل ہی گئے، اس کے
ہم نے اس سڑک کے استعمال کی ضروری شرط یہ قرار دی کہ ہاتھ میں چھڑی ہو تا کہ پاؤں کے
تے وقت اس کا سہارا لے لیا جا سکے۔

پسوؤں سے جنگ

گھوڑا گلی میں قیام کا غالباً سب سے دل چسپ واقعہ پسوؤں کی یورش ہے، پانچ جولائی کی صبح کو سب لوگ سویرے سویرے بستروں سے اٹھے۔ لیکن شیخ معزالدین صاحب دیر تک پڑے سوتے رہے۔ اس پر بعض دوستوں کو شک گذرا کہ کہیں نصیب اعدا شیخ صاحب کی طبیعت ناساز نہ ہو۔ مگر معلوم ہوا کہ شیخ صاحب کو رات بھر پسوؤں نے جگائے رکھا تھا، سورج نکلنے کے ساتھ یہ اپنی کمین گاہوں میں روپوش ہوئے اور شیخ صاحب ذرا چین سے سوئے۔ سب کو تعجب ہوا کہ آخر ان کم بختوں نے حملے کے لیے شیخ صاحب ہی کو کیوں تاکا؟ بڑی ذہنی کاوش کے باوجود کوئی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔

دن کو شیخ صاحب نے اپنا بستر اور چارپائی دھوپ میں رکھے (اگرچہ دھوپ کا وقفہ برائے نام تھا) رات کو سونے سے پہلے انہوں نے اپنی ستار درست کی اور دیر تک میٹھی سروں میں طرح طرح کے نغمے بجاتے رہے۔ سب کا خیال تھا کہ اگر کوئی سخت جان پسو دھوپ کی گرمی سے بچ رہا ہو تو وہ جادو بھرے سروں سے اس طرح محو خواب ہو جائے گا کہ شیخ صاحب کو رات بھر چین رہے گا لیکن سب کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب ٹھیک آدھی رات کے وقت شیخ صاحب بستر کی ایک ایک چیز کو باری باری جھٹکتے دیکھے گئے، دراصل پسوؤں نے شیخ صاحب کی مدافعتی کارروائیوں سے یقیناً کر اپنی ساری جمعیت محاذ جنگ پر لا جھونکی تھی۔ حملہ اس قدر اچانک اور شدید تھا کہ شیخ صاحب سے اس کا کوئی موثر توڑ نہ ہو سکا اور وہ رات بھر بے بسی کے عالم میں ہاتھ پاؤں مارنے اور برا بھلا کہنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکے۔ بارے خدا خدا کر کے صبح کی سفیدی نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی پسو اپنی کمین گاہوں میں جا چھپے اور شیخ صاحب کو چین کی نیند نصیب ہوئی۔

آج شیخ صاحب پسوؤں کے خلاف انتہائی اقدام کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے، چنانچہ کام سے فارغ ہو کر وہ سیدھے مری پہنچے اور ایک ڈبہ پسو پاؤڈر کا خرید لائے، واپس آکر چارپائی اور بستر پر اس سے خوب ات پت کیا، سونے سے پہلے انہوں نے پھر ستار درست کی اور دوسری سروں کے علاوہ میں بھی بجائی، سب کا خیال تھا کہ پسو مکمل طور پر تہس نہس ہو گئے ہوں گے اول تو یہ پاؤڈر ہی ان کے لیے ایٹم بم سے کم نہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اگر یہ پاؤڈر بستر اور چارپائی کے بعض خورد بینی سوراخوں میں سرایت نہ بھی کر سکا ہو تو بین کی نشیلی آواز جو سانپ تک کو مدہوش

نے کے لیے کافی ہے ان سیاہ بختوں کو موت کی نیند سلانے کے لیے کافی ہوگی۔

یہ سب قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوئیں۔ پسوؤں نے آج رات پھر حملہ کیا۔ البتہ حملے کی
دت پچھلی رات سے کچھ کم تھی، یہ جنگ اسی طرح کئی دنوں تک جاری رہی۔ شیخ صاحب کے
س جارحانہ کارروائی کے صرف تین ہتھیار تھے یعنی دھوپ ستار اور پسو پاؤڈر۔ پہلے سارے ہفتے
ا دھوپ بہت کم نکلی، تاہم وہ دھوپ کے مختصر سے وقفوں سے پورا فائدہ اٹھاتے رہے نوکروں
خت ہدایات تھیں کہ اگر سورج دیوتا پل بھر کے لیے بھی آنکھ کھولے تو چارپائی اور بستر دھوپ
پھیلا دیے جائیں۔ پسو پاؤڈر اور ستار کا استعمال شیخ صاحب کے اپنے اختیار کی بات تھی
اں چہ ان دونوں حربوں سے انہوں نے جی کھول کر کام کیا۔ اس سے اتنا ہوا کہ پسوؤں نے جم کر
ابند کر دیا۔ مگر ان کے چھاپہ مار دستے بار بار آتے اور شیخ صاحب کو پریشان کر کے رفوچکر ہو جاتے

غرض جوں جوں دن گذرتے گئے پسوؤں کی سرگرمیاں مدھم پڑتی گئیں۔ ایک روز شیخ صاحب
ز شوئرنگ سے ملنے گئے، یہ امریکی خاتون اپنی پیرانہ سالی کے باوجود ستار کی بہت دلدادہ
۔ انہوں نے اصرار کیا کہ کسی روز ہمیں ستار سنانے آئیے۔ مسز آلمن بھی ستار سننے کی مشتاق
ہیں انہیں بھی بلاؤں گی۔ شیخ صاحب نے پسوؤں کے خلاف مہم کا ذکر کیا، اس پر مسز شوئرنگ
شورہ دیا کہ آپ چارپائی اور بستر پر مٹی کا تیل چھڑکیں، اگلے روز انہوں نے ڈاکٹر شوئیرنگ کے
امریکی پسو پاؤڈر بھی بھیج دیا۔ نہ معلوم پسوؤں کے کانوں میں بوڑھی مسز شوئیرنگ کے تجویز کردہ
ت جنگ کی کس طرح بھنک پڑ گئی کہ اس رات محاذ جنگ پر مکمل سکون رہا۔ باقاعدہ جنگ تو
دنوں سے بند تھی اب چھاپہ مار دستے بھی میدان چھوڑ بھاگے۔ اس طرح یہ مہم کوئی ہفتہ عشرہ
دا شوری کے بعد پسوؤں پر مکمل فتح کی صورت میں ختم ہوئی۔

ہم

ہم مری پہونچے تو مطلع نیم ابر آلود تھا۔ ہوا میں کافی خنکی تھی، سورج ڈوبنے کے تھوڑی دیر
بارش اور آندھی نے دیر تک زور باندھے رکھا۔ چیڑ کے جنگلوں میں ہوا کی ڈراؤنی سرسراہٹ
ارش کی زور دار بوچھاڑ نے ہمارے اکیلے مکان کو ایک عجیب ناقابل بیان کیفیت عطا کر رکھی
ہم کمرے کے اندر سہمے تھے، سردی نے دروازے اور کھڑکیاں بند کرنے پر مجبور کر دیا، صبح اٹھے تو

مطلع صاف تھا لیکن خنکی کے باعث ہم سوئٹر اور گرم کپڑے پہننے پر مجبور تھے۔

کوئی ہفتہ بھر یہی کیفیت رہی، دن کے کسی حصہ میں یکایک بادل امڈ آتے اور دیکھتے دیکھتے موسلا دھار بارش ہونے لگتی۔ ہوا ہمیشہ تیز چلتی۔ بعض اوقات بارش گھنٹوں جاری رہتی اور تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد زور کی بوچھاڑیں آتیں۔ مقامی لوگوں اور سکاؤٹ کیمپ والوں نے بارش کی آمد کی ایک قابلِ اعتماد نشانی معلوم کر رکھی ہے، جب مغربی پہاڑوں کی چوٹیاں بادل کی چادر میں لپٹ کر نظر سے اوجھل ہو جائیں تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ بارش اب آیا چاہتی ہے ان چوٹیوں سے پلٹ کر بادل کے سفید دھوئیں کے سے گچھوں کے وادی میں نیچے اترتے اور مکانوں اور درختوں میں سے گزرتے صاف دکھائی دیتے تھے۔

پہلا ہفتہ یوں باد و باراں اور خنکی میں گزرا۔ مگر دوسرے ہفتے میں کیفیت بالکل بدل گئی اب دن رات مطلع صاف رہنے لگا۔ بادل اور بارش یکدم غائب ہو گئے، دن کو سورج کی گرمی اتنی تیز ہوتی کہ دھوپ میں چلنا پھرنا تکلیف دہ محسوس ہوتا۔ ایک قمیص میں بھی پسینہ آتا البتہ سائے میں ہوا خوشگوار محسوس ہوتی۔ رات کو اس قدر خنکی ہو جاتی کہ کمرے کے اندر چادر لے کر سو سکیں، دوسرا ہفتہ اسی طرح بارش کی انتظار میں کٹ گیا بعض اوقات مغربی پہاڑیوں کی چوٹیاں ایک ہلکی سی سفید دھند میں لپٹ جاتیں لیکن یہ بادل نہیں تھے۔ اس لیے بارش نہ آئی پر نہ آئی، ہمارے محترم دوست پروفیسر امیر حسین ملک نے پیش گوئی کی تھی کہ جس روز تم مری سے چلو گے اس روز بارش ہو گی۔ آخر ہماری روانگی کا دن بھی آ گیا۔ ہم بس میں بیٹھ کر مری سے راولپنڈی اور وہاں سے اپنے اپنے گھروں میں آ پہنچے۔ لیکن ملک صاحب کی پیش گوئی پوری نہ ہوئی۔ ایک لحاظ سے مری کا یہ خشک ہفتہ فائدہ مند ثابت ہوا اگر یہ دوسرا ہفتہ پہلے کی طرح خنک رہتا تو واپسی پر میدان کی گرمی سب پر زیادہ شاق گزرتی۔

گھوڑا گلی کی وادی کے متعلق ایک بات کا راز ہم پر آخری دن تک پوری طرح نہ کھل سکا وہ یہ کہ جہاں وادی کی مشرقی پہاڑیاں درختوں سے ہری بھری تھیں وہاں مغربی پہاڑیاں بالکل ننگی اور چٹیل تھیں۔ پہلے اس معمہ کی تشریح کے لیے پروفیسر فرحت اللہ خاں صاحب سے رجوع کیا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ مخصوص جغرافیائی موثرات کے ماتحت مشرقی پہاڑیوں پر زیادہ

بارش ہوتی ہے اور مغربی پہاڑیاں نسبتاً خشک رہتی ہیں، اگرچہ ہمارے لیے اس بات کا قائل ہونا مشکل تھا کہ ایک کھڈ جو چند گز چوڑی ہے اس کے ایک کنارے پر زیادہ پانی برستا ہو اور دوسرے پر کم سب نے خاں صاحب کے خصوصی علم کے سامنے خاموشی اختیار کرنا مناسب سمجھا، ایک روز لارنس کالج کے پرنسپل عبدالحمید صاحب سے اس کی وجہ پوچھی گئی۔ انہوں نے کہا کہ وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ مغربی پہاڑیوں کے درخت کسانوں کے بے دریغ کلہاڑے کا شکار ہو چکے ہیں، جب کہ مشرقی پہاڑیاں اس سے بچی رہی ہیں، یہ دلیل بھی کچھ بہت زیادہ وزنی معلوم نہ ہوئی، کیونکہ مغربی پہاڑیوں پر وسیع رقبے ایسے تھے جو کسانوں کے سیڑھیوں جیسے کھیتوں سے یکسر خالی تھے، جب ان پہاڑیوں پر بھی مشرقی پہاڑیوں کی طرح بارش ہوتی ہے تو کسانوں یا محکمہ جنگلات کو کونسی چیز اس بات سے روکتی ہے کہ یہاں درخت کاشت کردیں اور اپنی دولت میں اضافہ کریں؟ بے شک کسان اپنی ضرورتوں کے لیے درخت کاٹتے ہیں۔ لیکن ان ضرورتوں کی غیر منقطع نسل کے لیے وہ نئے درخت بھی بوتے ہیں، اگر پہلے وقتوں میں انہیں اس بات کا احساس نہیں تھا تو اب یہ احساس حالات کی مجبوری یا حکومت کی اطلاعاتی مہم کے ماتحت پیدا ہو جانا چاہیے تھا۔

مری

مری بوری سے باقاعدہ سڑک کے راستہ مری کا فاصلہ چھے سات میل ہے۔ اس راستے پر بس عموماً مل جاتی ہے۔ لیکن جو راستہ لارنس کالج میں سے گزر کر سیدھا مری کو جاتا ہے وہ صرف دو میل چھے فرلانگ ہے۔ یہ لگاتار چڑھائی کا راستہ ہے۔ اس لیے ہمارا عام دستور یہ تھا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد بس میں بیٹھ کر مری چلے جاتے اور چند گھنٹے گھوم پھر کر شام کو لارنس کالج کے راستے پیدل واپس آجاتے۔ مگر ایک تلخ تجربہ نے بعض دوستوں کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ بس پر جائیں اور بس ہی پر واپس آئیں۔

اس کی تفصیل یوں ہے کہ ایک شام فرحت اللہ خاں، شیخ عبدالحق، انصاری صاحب اور

مستقیم صاحب مری سے واپس آ رہے تھے کہ لارنس کالج میں انہیں بارش نے آن گھیرا۔ ہر چند کہ یہاں سے قیام گاہ صرف تین فرلانگ سے زیادہ نہ تھی لیکن باد و باراں کی غیر معمولی شدت نے انہیں سڑک کے کنارے ایک مکان کے برآمدے میں پناہ لینے پہ مجبور کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد انہیں یقین ہو گیا کہ طوفان کی تندی کے سامنے برآمدے کی پناہ بے اثر ہے، چنانچہ انہوں نے صاحب خانہ کا دروازہ کھٹکھٹایا تاکہ اضطراری حالت میں ان کی مہمان نوازی کا سہارا ڈھونڈا جائے۔ مکان لارنس کالج کے ایک استاد کا تھا۔ یہ صاحب باہر تشریف لائے تو اپنی پرانی جان پہچان والے چند لوگوں کو مشکل میں پھنسے پایا۔ فوراً بیٹھک کھول کر اس خوب صورتی سے سجے ہوئے کمرے کو ان کے حوالے کر دیا۔ طوفان کوئی سواڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہا۔ ہر چند کہ یہ عافیت کا گوشہ غنیمت تھا لیکن سب کی آنتیں کھبک سے قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ ادھر صاحب خانہ نے نصف درجن ناخواندہ مہمانوں کی شکم پری کی ہمت اپنے میں نہ پا کر انہیں چائے کی پیالی تک کا پوچھنا خطرے کو مول لینا سمجھا اور خیریت اسی میں سمجھی کہ دنیا جہان کی باتیں کی جائیں لیکن کھانے پینے کا ذکر نہ آنے پائے غرض اس محصور گروہ کو یقین ہو گیا کہ اگر خدانخواستہ طوفان کی یہ شدت چند اور گھنٹے جاری رہی تو رات بھر فاقہ کرنا پڑے گا۔ خدا خدا کر کے طوفان جس تیزی سے اٹھا تھا اسی تیزی کے ساتھ ختم ہو گیا اور یہ "یاراں دیدہ" قافلہ گرتا پڑتا اپنی منزل پہ پہونچا۔ اس روز سے شیخ عبدالحق صاحب نے قسم کھائی کہ پیدل آنے کا کبھی خیال تک نہ دل میں لائیں گے، کیوں کہ آنتوں فالتو توانائی نہیں کہ فاقہ کشی کے بعید سے بعید امکان کا بھی خطرہ مول لیا جائے۔

مری میں سب لوگوں کا اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ مری کی مختصر سی مال روڈ ہی ہر قسم کی رونق اور نمائش کا مرکز ہے۔ نماز عصر کے بعد ڈاک خانہ کے قریب دیوار میں کھڑے ہو جاؤ اور مری میں آئے ہوئے اکثر بڑے بڑے لوگوں کے درشن کر لو۔ دستور ساز اسمبلی نے پاکستان بھر کے سیاسی رہنماؤں کو مری میں اکٹھا کر رکھا تھا۔ ہم نے بہت جتن کیا کہ کسی روز دستور یہ کے اجلاس کے دیکھنے کی اجازت مل جائے، لیکن انصاری صاحب کے سوا اور کسی کو اس کوشش میں کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن

یہ ناکامی کسی بڑی مایوسی کا سبب نہ بنی، دستور یہ کے کارناموں کی روئداد ہر روز اخباروں میں پڑھ لیتے تھے اور اس کے معتبر اراکین روزانہ مال روڈ پر چلتے پھرتے نظر آجاتے تھے۔

ایک سہ پہر ہم نے قصد کیا کہ دستوریہ کا اجلاس نہیں دیکھا تو چلو اجلاس گاہ کا طواف ہی کر آئیں۔ ڈاک خانہ کے قریب ایک بورڈ اس سڑک کی طرف اشارہ کر رہا تھا جو ادھر جاتی تھی۔ ہم چند ساتھی ادھر چل نکلے، دستوریہ کا اجلاس شروع ہونے کو تھا، اس کے چند اراکین اپنی کاروں سے گرد اڑاتے ہوئے پاس سے گزر گئے، اتنے میں دیکھا کہ کھدر کی دھوتی اور کرتے میں ملبوس چپلیاں پہنے ایک بنگالی ننگے سر تیز تیز قدموں سے چلا آرہا ہے، یہ دستوریہ کا ایک کانگرسی رکن تھا۔ یہ ہمارے پاس سے گزرا اور چند منٹوں میں کافی آگے نکل گیا۔ اس کے چند منٹ بعد اسی وضع قطع کا ایک اور آدمی آیا، وہ پہلے سے زیادہ بوڑھا لیکن پھرتیلے پن میں کچھ کم نہ تھا، یہ بھی دستوریہ کا ایک ہندو کانگرسی رکن تھا۔ ان کے چلے جانے کے کافی دیر بعد تک ان کی مخصوص وضع قطع ہمارے ذہنوں میں چکر لگاتی رہی، سچ یہ ہے کہ جو تاثر گاندھی کے ان کھدر پوش پا پیادہ چیلوں نے پیدا کیا وہ چمکیلی کاروں اور قیمتی لباسوں والے اراکین پیدا نہ کر سکے۔

یوں ہی خراماں خراماں ہم دستوریہ کے چیمبر تک جا نکلے، یہ مری کلب کی سرخ عمارت تھی جو سڑک سے چند گز نیچے واقع ہے، سیڑھیوں کے ناکے پر دو سپاہی کھڑے تھے جو اس بات کی دلیل تھے کہ غیر مستند اشخاص کو آگے بڑھنے نہیں دیا جائے گا، ہم نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اس جگہ سے واپس ہو جائیں، واپسی پر راستہ میں مسٹر فضل الرحمٰن سے مڈ بھیڑ ہو گئی جو کبھی مرکز ی کابینہ میں وزیر تعلیم و تجارت ہوا کرتے تھے، اس وقت وہ دو ایک ہمراہیوں کے ساتھ پیدل چلے آرہے تھے، لیکن سوٹ اور فلیٹ ہیٹ کا ٹھاٹھ بدستور قائم تھا۔

مری میں ہمیں صرف ایک اتوار آیا، جولائی کی دس تاریخ تھی۔ ہم نے منصوبہ بنایا کہ صبح نو بجے کی بس سے نتھیا گلی چلیں اور چند گھنٹے وہاں گزار کر شام کو واپس آجائیں، بس کے اڈے پر جا کر معلوم ہوا کہ صرف دو ایک سیٹیں مل سکتی ہیں۔ بعد میں جانے والی بس سے جا کر شام تک

واپس آنا مشکل تھا۔ اس لیے نتھیا گلی کا پروگرام منسوخ کر دیا گیا اور ہم کشمیر پوائنٹ کو جانے والی خوب صورت سڑک پر ٹہلتے ٹہلتے اس سڑک کے آخری نقطہ یعنی گورنمنٹ ہاؤس تک جا پہونچے جو گورنر پنجاب کی گرمائی قیام گاہ ہے، یہ ساری سڑک اور اس کی نواحی پہاڑیاں دلآویز قدرتی حسن سے مالا مال ہیں۔ ان پہاڑوں پر چیڑ کے علاوہ گہرے سبز رنگ کے لمبے نوکیلے دیودار کے درخت بھی کثرت سے ہیں، سارا دن ان دلکش نواحات میں گذار کر ہم شام کو مری بروری میں واپس آ گئے۔

ہماری قیام گاہ سے مری کو جانے کے لیے تین راستے تھے۔ ایک تو وہ سڑک جس پر موٹر لاریاں چلتی تھیں، دوسری وہ تنگ سڑک جو مری بروری والوں نے ذاتی استعمال کے لیے بنا رکھی تھی، یہ سڑک لارنس کالج میں سے گذرتی تھی، تیسری وہ نئی کشادہ سڑک جو قیام پاکستان کے بعد بنی ہے، یہ سڑک بانسرہ گلی کی چونگی سے کچھ اوپر سے شروع ہو کر لارنس کالج کے آگے سے ہوتی ہوئی موٹروں کے اڈے پر آختم ہوتی ہے، ہم پیدل آنے کے لیے عموماً اس سڑک کو پسند کرتے تھے۔ ایک تو اس پر پنجاب ٹرانسپورٹ کی لاریوں کے علاوہ اور کوئی لاری نہ چلتی تھی، دوسرے یہ سڑک خوبصورت پہاڑی مناظر میں سے گذرتی ہے، ہمارے وزرا کے آنے جانے کا راستہ بھی یہی تھا، عموماً اس سڑک پر روزانہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر پولیس کے سپاہی کھڑے دکھائی دیتے تھے جو اس بات کی علامت تھی کہ کوئی وزیر صاحب گذرنے والے ہیں ایک شام آنریبل مسٹر محمد علی وزیر اعظم پاکستان کا رہیں ہمارے پاس سے گذرے ہم مری سے واپس آ رہے تھے اور وہ راولپنڈی سے۔

روزانہ تقسیم اوقات

ورک شاپ کے اوقات کار کو پہلے دن سے اس طرح تقسیم کیا گیا تھا کہ ہر شخص دوپہر کے بعد کے وقت کو اپنی دلچسپی کے مطابق صرف کر سکے۔ ٹھیک صبح سات بجے کام شروع ہو جاتا تھا سب لوگ اس وقت تک ہر طرح سے فارغ ہو کر ناشتہ کر کے کام کے لیے تیار ہو جاتے تھے سب سے

بلا بیر یڈ انگریزی کا ہوتا ۔ اس میں شیخ عبد الحق صاحب ساری جماعت کو لینے اور تدریس انگریزی
وحدتی طریق پر پڑھانے کے متعلق بحث و تمحیص کرتے ۔ از اں بعد ٹریننگ کالج کے لیکچراروں میں سے
بعض باری باری کسی عام تعلیمی موضوع پر تقریر کرتا ۔ یہ سلسلہ ساڑھے آٹھ بجنے تک جاری رہتا
ں کے بعد ڈاکٹر شنوئیرنگ ۔ ڈاکٹر آلبمن یا کوئی دوسرے امریکی مہمان کسی عام تعلیمی موضوع پر
ہار خیال کرتے اور ٹھیک دس بجے یہ سلسلہ ختم ہو جاتا اور جماعت کو دس منٹ تفریحی وقفہ دیا جاتا ۔
تفریحی وقفہ کے بعد بارہ بجے دوپہر تک مختلف مضامین کی باری آتی ۔ اب جماعت تین گروہوں
ں بٹ جاتی یعنی ریاضی کا گروہ ۔ سائنس کا گروہ اور معاشرتی علوم کا گروہ ۔ ریاضی کے لیے
یخ معز الدین ذمہ دار تھے ۔ سائنس کے لیے انیس الدین انصاری اور معاشرتی علوم کے لیے
ت اللہ خان اور راقم ۔ پہلے دونوں اصحاب روزانہ اپنے اپنے گروہ کو لیتے تھے ۔ لیکن رحمت اللہ خان
ور میں باری باری جغرافیہ اور تاریخ کے موضوع لیا کرتے تھے ۔ پندرہ جولائی تک نہ صرف
روہ اپنے اپنے مخصوص مضمون کو وحدتی تشکل دینے کے طریقوں کو سمجھ چکا تھا بلکہ ہر استاد نے
ں مضمون کے کسی ایک موضوع پر ایک تدریسی وحدت تیار بھی کر لی تھی ۔

اہم لیکچر

اگرچہ تقسیم اوقات میں روزانہ ایک عام لیکچر کے لیے گنجائش رکھی گئی تھی اور اس گنجائش سے
متوار فائدہ بھی اٹھایا جاتا رہا لیکن ان میں سے بعض لیکچر خاص طور پر اہم تھے ۔

پانچ جولائی کو ڈاکٹر شنوئیرنگ کی افتتاحی تقریر نہایت قیمتی افکار سے بھرپور تھی ۔ وحدتی
ق کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے صاف طور پر یہ سوال پوچھا کہ آیا ہم یہ چاہتے ہیں
پاکستان کے آئندہ شہری ایسے ہوں جو ہاتھ باندھ کر جی حضور کہنا جانتے ہوں ۔ یا ایسے کہ
ن کو سوچ کر خود اپنی رائے قائم کرنا جانتے ہوں ۔ اگر ہم دوسری صورت کو پسند کرتے ہیں
تو ہمیں اپنے پڑھانے کے طریقوں پر نظر ثانی کرنی ہوگی جس طالب علم کو
لفظ بلفظ رٹ کر ان الفاظ کو دہرانے کے سوا اور کچھ نہیں سکھایا گیا وہ جی حضور کہنے کے سوا مشکل
کوئی اور چیز سیکھے گا ۔ اگر ہم اس میں حقیقی نگاہ اور جرأت فیصلہ پیدا کرنا چاہتے ہیں تو

اسے مدرسے میں کثرت سے ایسے مواقع ملنے چاہئیں جن کی بدولت وہ اپنے طور پر سوچے دوسروں کے ساتھ مل کر منصوبے تیار کرے انہیں عملی شکل دے اور آخر کار اپنی کوشش کے نتائج کو جانچے، وحدتی طریق تدریس اس کے سوا اور کچھ مطالبہ نہیں کرتا کہ تدریسی مواد ایسی شکل میں پیش کیا جائے کہ طلبا کو تربیت کردار کے مواقع فراوانی سے ملیں۔

پرنسپل عبدالحمید نے استادوں کی جماعت کو دو مرتبہ خطاب کیا پہلی مرتبہ انہوں نے استاد کے مجلسی مقام کا ذکر کرتے ہوئے اپنے گاؤں کے ایک ہندو استاد کا ذکر کیا جو اگرچہ پرائمری مدرسے کا استاد تھا لیکن اس کے خلوص اور ہمدردی نے اسے مقامی رہنمائی کا بلند مقام دے رکھا تھا گاؤں کے لوگ اپنے اکثر معاملات میں اس سے مشورہ طلب کرتے، ان کی دوسری تقریر مری کی نباتات کے متعلق تھی، چوں کہ وہ خود پوٹھنی کے استاد رہے ہیں اور عمر کا بڑا حصہ مری میں گذار چکے ہیں، اس لیے یہ تقریر بہت پُر از معلومات تھی۔

ڈاکٹر الیمن نے استادوں کو کئی بار خطاب کیا لیکن ان کی سب سے عالمانہ تقریر غالباً وہ تھی جو انہوں نے امریکی نظام تعلیم پر کی۔ امریکی ہمہ گیر مدرسے کا خاکہ کھینچتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جو تعلیم زندگی سے کٹ جاتی ہے وہ اپنی افادیت کھو بیٹھتی ہے، جدید سائنسی اور ٹیکنیکل ترقی نے انسانی تہذیب کو بے حد تنوع عطا کیا ہے، امریکہ میں لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ مدرسے کو زندگی کا ساتھ دینا چاہیے، اب وہ زمانہ نہیں رہا جب صرف پڑھائی لکھائی سکھانا ہی کافی ہو سکے۔ مدرسے کو ایک ایسی زندگی کا ساتھ دینا ہے جس کی ضرورتیں ہر گھڑی بڑھ رہی ہیں، اس لیے امریکی نصاب کسی مضامین کی تقدیس کا قائل نہیں، ہر وہ علم اور مہارت جو زندگی میں ایک پسندیدہ درجہ رکھے نصاب میں شامل کیے جانے کے قابل ہے امریکی پبلک مدرسے سماجی طبقہ بندی اور طبقاتی بُعد کو ختم کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہیں وہ ہر طبقے کے بچوں کو ایک ساتھ رہنا سکھاتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے کے شرف کا سبق دیتے ہیں، امریکی صنعت اور امریکی جمہوریت کی ترقی اور پائداری کے اسباب امریکی

مدرسوں میں پرورش پاتے ہیں، پاکستان کی ترقی اور عظمت کے لیے کبھی پاکستانی مدرسوں میں کام ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر سمتھ ماہر صحت جسمانی نے استادوں کو رگاتار دو دن خطاب کیا، انہوں نے صاف ستھرے ماحول پاکیزہ عادات متوازن غذا اور مناسب ورزش کے فوائد اور طریقے بیان کیے انہوں نے کہا یہ بہت دیر کی بات نہیں جب امریکی بچوں کو صاف ستھرا پینے کا پانی اور جراثیم سے محفوظ کھانا میسر نہیں آتا تھا ان اسباب کی وجہ سے وہ طرح طرح کی بیماریوں کا شکار رہتے تھے۔ آخر سائنسی تحقیق اور تجربوں کے نتائج نے لوگوں کو ان خطروں سے آگاہ کیا اور ان پر قابو پانے کے طریقے بتائے جس کا نتیجہ آج دنیا کے سامنے ہے۔ پاکستانی استادوں کو چاہیے کہ پہلے وہ طلبہ اور ان کے والدین میں حفظان صحت و صفائی کا قوی احساس پیدا کریں، جب یہ احساس پیدا ہو جائے گا تو اس کے عملی نتائج خود بخود ظاہر ہونے لگیں گے۔

مجلسی تقریبیں

اگرچہ ورک شاپ کی زندگی کیمپ کی زندگی تھی جس میں مجلسی تقریبوں کے لیے بہت کم موقعے میسر تھے پھر بھی مل بیٹھنے کے چند مواقع پیدا کیے گئے۔

ایک روز شاف کی طرف سے دوپہر کے کھانے کا اہتمام کیا گیا، اس میں امریکی ڈاکٹروں کے علاوہ پرنسپل عبدالحمید، گھوڑا گلی کے چند استادوں، سکاوٹ کیمپ کے انچارج مسٹر بھٹی اور ڈاکٹر یازی نے شرکت کی۔

ورک شاپ کے اختتام سے چند دن پہلے استادوں کی طرف سے دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا گیا، اس میں شاف کے علاوہ مندرجہ بالا اصحاب کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد ایک مختصر تفریحی پروگرام کا بھی اہتمام تھا، چند افراد نے مزاحیہ نظمیں پڑھیں، امریکی مہمانوں کو ان کا سرسری ترجمہ ساتھ ساتھ بتایا جاتا تھا، دو اصحاب نے مل کر ایک تمثیلی ملیش کی جس میں سائنس معجزہ کاری کو شاعرانہ لفاظی سے بڑھ کر حقیقی اور موثر ثابت کیا گیا تھا۔ شیخ معزالدین نے

ستار کے دل نواز نغموں سے مہمانوں کو محظوظ کیا۔ اور آخر میں شیخ عبدالحق صاحب نے اپنے مشہور لطیفوں اور طرح طرح کی بولیوں سے محفل کو للطف اندوز کیا۔

سب سے آخری مجلسی تقریب وہ چائے کی دعوت تھی جو ڈاکٹر شوئیر انگ نے ورکشاپ کے خاتمہ پر شاف اور اساتذہ کے اعزاز میں دی، یہ دعوت جمعہ ۱۶ جولائی کو پرنسپل عبدالمجید کے مکان کے ساتھ ملحقہ گھاس کے میدان میں دی گئی، ورکشاپ کے لوگوں کے علاوہ اور بھی بہت سے مہمان مدعو تھے۔ شیخ معزالدین صاحب اس مجمع میں بھی ستار ساتھ لائے ہوئے تھے لیکن دعوت میں شریک ہونے والی بوڑھی عورتوں اور دوسرے مہمانوں کے تعارف نے اتنا وقت لے لیا کہ ستار کے باقاعدہ سنائے جانے کے لیے وقت نہ نکل سکا۔

ورکشاپ کے پروگرام میں تعلیمی فلموں کی نمائش بھی شامل تھی، اس مطلب کے لیے ڈاکٹر شوئیر نگ اور ڈاکٹر آیلمن نے بڑی کاوش کے ساتھ فلمیں جمع کر رکھی تھیں، طے یہ پایا تھا کہ یہ فلمیں لارنس کالج کے ہال میں دکھائی جایا کریں گی۔ پہلے دن لوگ بڑے شوق سے مقررہ وقت پر فلم دیکھنے گئے لیکن پروجیکٹر میں کچھ ایسی خرابی واقع ہوئی کہ بہت انتظار کے بعد پردہ پر تصویریں آنے لگیں لیکن آواز اتنی غیر واضح تھی کہ مجبوراً اسے بند کر دینا پڑا، نتیجہ یہ ہوا کہ خاموش تصویریں اپنی ساری کہانی وضاحت سے نہ سنا سکیں۔

یہ تجربہ ایسا ناتسلی بخش ثابت ہوا کہ اسے دہرانا مناسب نہ سمجھا گیا۔ مقامی امریکی مرکز اطلاعات اور قومی تعلیمی مرکز سے پراجیکٹر نہ مل سکا۔ اس لیے بادل ناخواستہ فلموں کا سارا پروگرام کاٹ دینا پڑا، صرف آخری دن چائے کی دعوت کے بعد ایک خاموش فلم دکھائی گئی۔

واپسی

روانگی سے ہفتہ عشرہ پہلے اکثر احباب کا خیال تھا کہ واپسی نتھیا گلی ایبٹ آباد کے راستہ سے ہو تاکہ اس دل فریب تاریخی راستہ کی جھلک بھی دیکھ لی جائے، جوں جوں روانگی کا دن قریب آتا گیا، اس راستہ کے دلدادگان کی تعداد گھٹتی گئی۔ تاآں کہ ایک روز پہلے

دو ایک کے سوا باقی سب نے سیدھے پنڈی کے لیے ٹکٹ خریدنے کا فیصلہ کر لیا، اس پر ان دونوں نے بھی سوادِ اعظم کا ساتھ دینا ہی بہتر سمجھا، چناں چہ سولہ جولائی کو ہم سب لوگ پنجاب ٹرانسپورٹ کی پہلی بس سے چل دیے۔

درک شاپ کے تمام انتظامات پروفیسر فضل محمد خان صاحب نے مکمل کیے تھے۔ اب انہیں اس تمام ساز و سامان کو واپس اپنی جگہ پہنچانا تھا جو پہلے بہت کاوش کے ساتھ جمع کیا گیا تھا وہ باقی ساتھیوں سے دو ایک روز پہلے گھوڑا گلی آئے تھے اور واپسی پر بھی ان کا ساتھ نہ دینے پر مجبور تھے۔ کھانے پینے کا سارا انتظام شیخ معز الدین صاحب کے ہاتھ میں رہا۔ ان دونوں صاحب نے جس سرگرمی اور خلوص کے ساتھ باقی ساتھیوں کے آرام اور سہولت کا لگاتار خیال رکھا اس نے سب کو ان کا دلی طور پر ممنون بنا دیا ؎

اساتذہ کی سماجی اور مالی حیثیت

محمد عبدالعزیز مسلسل نمبر ۱

ہمارے ملک میں تعلیم و تعلم کی زبوں حالی کا یہ عالم ہے کہ آٹھ برس بعد بھی تعلیمی مسائل کو ایک اہم قومی مسئلہ نہیں سمجھا جاتا، یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے میں اب تک ہم نے جو ترقی کی ہے اس کی حیثیت منفی ہے، اس کی ذمہ داری حکومت اور عوام دونوں پر عائد ہوتی ہے، حکومت پر اس لیے کہ جمہوریت کی تعمیر و بقا کے لیے تعلیم کی ترویج ضروری سمجھا نہ گیا ہے اور اس سے اس نے بے توجہی برتی اور عوام پر اس لیے۔ انہوں نے اپنے رہنماؤں کو فرض ناشناس اور خود غرض بنا دیا، اس بیگانگی کا ایک لازمی نتیجہ تو یہ نکلا کہ اپنی ضروریات کے مطابق ہنوز ہم کوئی قومی تعلیمی نظام پیدا نہ کر سکے جو ہمارے مزاج و آہنگ کے مطابق ہمارا ہو بلکہ ہمیں تو اس فرسودہ نظام تعلیم کے قائم رکھنے پر اصرار ہے جسے برطانوی استعمار پسندوں نے اپنی سامراجی ضروریات کے پیش نظر مرتب کیا تھا۔ کیا یہ حالات ہمیں زندہ قوموں کی ہم چشمی کا اہل بنا سکتے ہیں، کیا ہم آزادی کی اس مشعل کو روشن رکھ سکیں گے جسے ہم نے مخالفت کی آندھیوں میں جلایا ہے، اگر ہم ایسا سمجھتے ہیں تو یہ ہماری بہت بڑی بھول ہے جو مستقبل قریب ہی میں ہماری ہلاکت کا موجب ہو سکتی ہے۔

سیاسی اور اقتصادی اعتبار ہی سے نہیں تعلیمی اعتبار سے بھی برطانیہ ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔ اتنا ترقی یافتہ کہ اپنے تعلیمی نظام کو اس معیار پر پہنچانے کے لیے ہمیں مالی اور فنی سہولتوں کے باوجود ایک طویل مدت کی ضرورت ہو گی، لیکن اس کے باوصف اس قوم کو یہ احساس ہے کہ ابھی اس میدان میں ہمیں بہت آگے بڑھنا ہے، نئی پارلیمان میں ملکہ کی افتتاحی تقریر کے بعد جو مباحثہ ہوا اس میں حصہ لیتے ہوئے وزیر اعظم ایڈن نے تعلیم کے متعلق جن تاثرات کا اظہار کیا وہ اس قوم کے بلند عزائم کی نشان دہی کرتا ہے۔

وزیر تعلیم نے کہا :

"جو کام ہمیں کرنے ہیں ان میں تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے"

اس کے بعد وزیر موصوف نے بالتفصیل یہ بتایا کہ دیہاتی مدرسوں سے لے کر فنی اداروں کی تعمیر و ترقی کے لیے حکومت کیا اقدام کرے گی۔

ہم جب ایک گھر بنانے ہیں تو اس کی تعمیر کے لیے عمارتی سامان کے علاوہ ایک اچھے معمار کی تلاش ضروری سمجھتے ہیں تاکہ اس کی فن کارانہ صلاحیتوں سے یہ نئی عمارت زیادہ خوب صورت اور زیادہ پائدار بن سکے، جب ہم ایک کارخانے کی بنیاد ڈالتے ہیں تو اس کی تعمیر سے پہلے اس کی منصوبہ بندی ضروری سمجھتے ہیں مشینیں کہاں سے آئے گی، خام اشیاء کی فراہمی کیا صورت ہوگی، جو مصنوعات اس کارخانے میں تیار ہوں گی ان کی نکاس کا کیا ذریعہ ہوگا کتنا سرمایہ لگے گا اور اس کے حصول کا کیا طریقہ ہوگا، یہ اور اس قسم کے بیسیوں مسائل اصل کام شروع کرنے سے پہلے ہی طے کر لیے جاتے ہیں لیکن تعلیم و تدریس کے سلسلے میں اس قسم کی منصوبہ بندی صرف غیر ضروری ہی نہیں بلکہ بے کار سمجھی جاتی ہے اور اس پورے نظام کو محض اتفاقات و حوادث کے سپرد کر کے ہم وہ اطمینان قلب حاصل کر لیتے ہیں جو "تبدہ گر" کا نہیں غلاموں کی سطحی طمانیت سے عبارت ہوتا ہے۔ زندہ قوموں کا شعار کچھ اور ہوتا ہے، ان کی تیور کچھ اور ہوتے ہیں اور ان کا انداز کچھ اور ہوتا ہے۔

اس وقت ایک نئے نظام تعلیم کی تشکیل کے لیے ہمیں جن مسائل سے دوچار ہونا پڑے گا ان میں

(۱) نصاب (۲) عمارت (۳) طلبہ

(۴) تربیت یافتہ اساتذہ (۵) اساتذہ کی سماجی اور مالی حیثیت

بالخصوص قابل ذکر ہیں، لیکن اس وقت نصاب، عمارت، طلبہ، تربیت یافتہ اساتذہ سے قطع نظر اساتذہ کی سماجی اور مالی حیثیت کے تجزیے کی کوشش کی جائے گی۔

سماجی حیثیت :- ایک سیاست دان، تاجر اور صنعت کار کی طرح مدرس بھی ہمارے معاشرے کے

رکن ہے اور ایک رکن کی حیثیت سے اسے بھی وہ سہولتیں اور وہ مراعات حاصل ہونی چاہئیں جو معاشرے کے کسی دوسرے رکن کے لیے فراواں ہو سکتی ہیں، لیکن آئیے دیکھیں یہ معاشرہ جس کے ہم اور آپ ایک ایک ضروری جزو ہیں اس میں مدرس کا کیا مقام ہے۔ آیا سماج کی اس ہیئت ترکیبی میں اس کی کوئی حیثیت ہے یا وہ محض ایک عضو معطل ہے، اس دور میں جب کہ سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے لوگوں کو سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشی اور ذہنی اعتبار سے ایک دوسرے کا دست نگر بنا دیا ہے اشتراک و تعاون کے ساتھ کسی ایک مقصد کو سامنے رکھ کر کام کرنا اور ضروری ہو گیا ہے ورنہ یہ بھی ممکن ہے کہ نظری لحاظ سے ہم ایک کام کو بہت وقیع سمجھتے ہوں اور اس کی خوبیوں کے پیش نظر اسے پورے سماج کے لیے بھی مفید تصور کرتے ہوں لیکن اگر آپس میں اشتراک و تعاون نہ ہو تو یہی مقصد، مقصد نہیں رہتا، بازی گری بن جاتا ہے۔

موازنہ

سماج کی ترقی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے مختلف افراد کسی طبقاتی تقسیم کا شکار نہ ہوں بلکہ انسان کی حیثیت سے ایک کی دوسرے کی نگاہوں میں وقعت ہو، یونانیوں نے دنیا میں ایک نئے کلچر کی داغ بیل ڈالی ہے، لیکن ان کی عظمت کا تمام تر انحصار فنون لطیفہ کی ترقی فکری آزادی اور اس کے فلسفیانہ تجزیے پر ہے۔ رومیوں کو دنیا میں جو وقار حاصل ہوا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک قانون مرتب کیا اور دستوری نظام کو فروغ دینے کی کوشش کی لیکن ان میں سے کوئی نظام سماجی عدل پر قائم نہ تھا، دونوں میں خواص و عوام، آقا اور غلام کی تقسیم اور تخصیص موجود تھی۔ امرا عوام سے برتر اور آقا کے حقوق غلام پر فائق تھے۔ اسی طرح ہندوؤں نے بھی اپنے عہد عروج میں زندگی کا ایک تصور پیش کیا اور ذاتی نجات (نروان) کے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ سماج بھی انسان کے ساتھ عدل نہ کر سکا۔ ذات پات کے بندھن چھوت چھات اور بڑے چھوٹے کی تمیز نے انہیں بھی سماجی مساوات سے اتنا دور رکھا کہ رشی کے فاقوں سے بھی برہمن کا یہ طلسم نہ ٹوٹا۔

عہد حاضر میں بھی برطانیہ، امریکہ، جرمنی اور روس کی سماجی یک جہتی کے مختلف تصورات
نے ایک عالم گیر حیثیت اختیار کرلی ہے، لیکن ان میں سے ہر نظام کے سامنے ملینہ دو اہم مقصد
رہے ایک تو سیاسی تفوق اور دوسرا معاشی اقتدار اور بعض صورتوں میں نسلی اور گروہی برتری بھی
زندگی کا اہم مقصد بن گئی، ان حالات میں نئے اور اچھے معاشرے کی طرح ڈالنا فی الواقع
ممکن نہیں اور چوں کہ مغرب کی دریوزہ گری میں ہم نے اپنی پرانی روایات اور اپنے پرانے
اداروں سے منہ پھیر لیا ہے، اس لیے ہم نے اپنی قدیم معاشرتی زندگی اور اس کے بنیادی اصولوں
کا جائزہ لینے کی کوشش بھی نہیں کی، ان اگلی اور پچھلی نہاد بیوں میں صرف اسلام ہی ایک
ایسا نظامِ حیات اور ایک ایسی طاقت اور تحریک ہے جس میں انسانی مساوات اور معاشری
برابری کو ایک اچھی سوسائٹی کی اساس قرار دیا گیا ہے، اس معاشرے میں آقا، آقا نہیں اور
غلام، غلام نہیں۔ حاکم، حاکم نہیں اور محکوم، محکوم نہیں، امیر، امیر نہیں اور مفلس، مفلس نہیں
کیوں کہ اس معاشرے کا تمام تر مقصد انھیں امتیازات کو دور کرنا ہے۔

طبقاتی تقسیم

اب آئیے اس پیمانے سے ہم اپنی سوسائٹی میں مختلف افراد کی سماجی حیثیت کو ناپیں
یا ہم میں آج وہ طبقاتی تقسیم موجود ہے، جو یونانیوں یا رومیوں کا طرۂ امتیاز تھی۔ یا ہم معاشری
ساوات کے پیشِ نظر ہر شخص کی محض جماعت کے فرد ہونے کی حیثیت سے عزت کرتے ہیں اور
سے اس کے جائز حقوق سے محروم نہیں رکھتے۔ بدقسمتی سے اس وقت ہمارے ملک میں جو معاشری
ظام قائم ہے، اس میں ایک ایسی طبقاتی تقسیم موجود ہے جو زندگی کی ان اعلیٰ اقدار کو درخورِ اعتنا
میں سمجھتی جس کی قرآن ہمیں تعلیم دیتا ہے، یہ المناک صورت حال کیوں اور کس طرح پیدا ہوئی اور
ہ نے اپنے بلند قومی کردار کو کس طرح کھو دیا۔ یہ ایک طویل داستان اور تاریخی حادثہ ہے صدیوں
،سیاسی اور معاشی زوال نے ہم میں ایک ایسا موہوم وقار پیدا کر دیا ہے جسے ہم نے زندگی کا ایک
زمی جزو سمجھ لیا ہے اور اس سے ہر قسم کی معاشری خرابیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ہر سم

طاقت کی طرف بھاگتے ہیں اور طاقت ہی کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں ۔

ہر قوم اور ہر معاشرے میں مختلف لوگ مختلف کام کرتے ہیں ۔ مثلاً ایک شخص کھیتی باڑی کرتا ہے، دوسرا کپڑا بنتا ہے ۔ ایک شخص دیو ہیکل مشین چلاتا ہے دوسرا تیار کرتا ہے ۔ ایک شخص حکومت کے نظم ونسق کا ذمہ دار ہے، دوسرا عدل وانصاف کی کرسی پر بیٹھ کر مقدمات کی سماعت کرتا ہے ۔ ایک شخص بوقلمون تصویریں بناتا ہے تو دوسرا علم وحکمت کی باتیں بتاتا ہے موخرالذکر عرف عام میں مدرس یا معلم کہلاتا ہے ۔ دنیا کے بے شمار پیشوں میں علم وحکمت کی تحصیل اور پھر اس کی ترویج کو ہمیشہ ایک باوقار حیثیت حاصل رہی، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان علم وحکمت ہی کی بدولت اپنے ماحول کو سمجھتا ہے ۔ کائنات کے ایک ایک ذرے سے فیض یاب ہونے کی کوشش کرتا ہے اس سے وہ عرفان الٰہی حاصل کرتا ہے اور یہی اس کے عزم وحوصلے کو زندگی وتوانائی بخشتا ہے، اس لیے جو شخص یا جو گروہ علم کی تحصیل وترویج کو اپنی زندگی کا موقف بنالے، دنیا میں اس سے زیادہ محترم اور کون ہو سکتا ہے ۔

اسلام نے علم کی تحصیل کو ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض قرار دیا ہے کہ یہی ہماری دینی فلاح اور دنیاوی ترقی کا ذریعہ ہے، اس سے ہٹ کر ہم اپنے لیے کوئی راہ نجات تلاش نہیں کر سکتے تعلیم ہی کی بدولت ہم نوادر قدرت کو گمنامی سے نکال کر منظر عام پر لا سکتے ہیں اور یہی نہیں کہ اس کی دریافت سے نظری طور پر خوش ہو کر اپنی تمام تر توجہات کو ایک ذہنی خوشی ہی پر مرکوز کر دیں ۔ بلکہ اس پر پوری قدرت حاصل کر کے اسے انسان کے لیے مفید اور کارآمد بنانے کی کوشش بھی کر سکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جو قومیں تعلیم کو اپنی زندگی کی اساس سمجھتی ہیں ان کے افق سے توہم پرستی جہالت اور ابہام کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور وہ ایک صاف ستھری نکھری فضا میں ایک ایسا قومی کردار اور قومی شعور پیدا کر لیتی ہیں جو انہیں پہاڑوں سے ٹکرانے کا عزم عطا کرتا ہے ۔ لیکن اس کے برعکس جو قوم تعلیم سے انحراف کرتی ہے اور عمداً اس کی اچھائیوں سے آنکھیں موند لیتی ہے اس کا تباہ ہو جانا یقینی ہے ۔

ہماری بے گانگی

پچھلے دو سو برس ہماری سیاسی اور اقتصادی زندگی کا ایک ایسا دور انحطاط ہے جس میں ہم نے دوسروں کی دریوزہ گری تو سیکھی لیکن نہ ہم میں سرفروشی اور خودداری کے وہ جذبات پیدا ہو سکے جو ہمیں دوسری قوموں کی نگاہوں میں ممتاز بنا سکتے، اور نہ ہم زندگی کے حقائق ہی کا واضح تجزیہ کر سکے، اس دور میں تعلیم و تعلم کی جو حالت رہی، اس کا اندازہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہوتا ہے۔ اس وقت مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں ناکارہ اور مفلوج تھا، انگریز اپنی سیاسی بساط پر اسے شکست دے چکا تھا۔ ہندوؤں نے آنے والے طوفان کا مقابلہ نہ کیا بلکہ اس طوفان کو اور مسموم بنا دیا، انہیں یہ احساس تھا کہ ان کے بازوؤں میں اتنی قوت نہیں کہ وہ اس طاقت ور قوم کا مقابلہ کر سکیں، اس لیے انہوں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ نئے حاکم کے گلے میں چند ہار ڈال کر انہیں اپنانے کی کوشش کی جائے، چناں چہ انہوں نے نئے حاکم کے چلن کے مطابق اپنی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھال لیا۔ انہوں نے انگریزی زبان اور انگریزی معاشرت کے آداب سیکھ کر انگریزوں سے ایک ذہنی یگانگت پیدا کر لی جس سے انہیں ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ وہ حکومت کے ایوان میں بدستور صدر نشین رہے، مسلمانوں نے ہر آنے والی چیز کا واقعاتی تجزیہ نہ کیا۔ نہ اس نے اس کے حسن و قبح کو دیکھا، اور نہ اس نے اس کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کی، بلکہ محض اپنے جذبات کی رو میں اس نے ایک ایسی روش اختیار کی جو اس کی سیاسی اور اقتصادی موت کا موجب ہوئی، ابھی اس کے ذہن میں حکومت کا وہ نشہ موجود تھا جسے دراصل پلاسی اور بکسر کے میدان میں انگریزوں کی شمشیر نے اتار دیا تھا۔ حکومت جا چکی تھی تجارت پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ امرا اور شرفا کے خاندان تباہ ہو چکے تھے۔ علم و حکمت کے سرچشمے سوکھ چکے تھے، اور اب ظاہر اس مفلوج قوم کے ابھرنے کی کوئی اور صورت باقی نہ تھی، کیا وہ چند خاندان جنھوں نے انگریزی استعمار کی اس عمارت کی تعمیر میں چونے گارے کا کام دیا۔ عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے وسائل کا جائزہ لے سکتے تھے، کیا ان کے دل میں قوم کا درد اور اپنی اس

ریاستی بدحالی کی کسک موجود تھی۔ اگر ان کے دل میں اس قسم کے جذبات ہوتے تو وہ اپنی قومی خودداری کو سیم و زر کی اس جھنکار کے نذر نہ کرتے۔

ہماری اس عالمگیر تباہی کا صرف ایک ہی سبب تھا، ہم نے حکومت کے موہوم نشے میں علم و حکمت کی تحصیل سے اغماض کیا، اب ہم میں ۔۔ ابوالفضل، خان خاناں اور اورنگ زیب جیسی شخصیتوں کا فقدان تھا جو صرف تلوار ہی کے دھنی نہ تھے قلم کے بھی دھنی تھے، وہ صرف میدان میں دشمن کی سرکوبی کے لیے صف آرا ہونا ہی نہ جانتے تھے وہ اصول جہاں بانی اور آئین جہاں داری سے بھی واقف تھے۔ اگر ان کی تلوار ایک معرکہ سر کرتی تھی تو ان کا قلم اس زخم پر مرہم رکھتا تھا، جوش و غضب اور اخلاص و محبت کا یہ گنگا جمنی رنگ ہماری ہزار سالہ ہندی ثقافت کا سب سے گہرا رنگ رہا۔ اس سارے زمانے میں جسے ہم اس برصغیر میں اپنی ترقی و ترویج کا دور کہہ سکتے ہیں علم کی حیثیت نمایاں رہی۔ شیخ مبارک ناگوری اور اس کے بیٹے صرف اپنے وافر علم ہی کی بدولت ترقی کی اس منہاج تک پہنچے۔ بدایونی اپنی ہمہ دانی ہی کی بدولت دوسرے علماء کی تنقید پر کمر بستہ ہوا جس کے پاس علم کی دولت تھی یا جو علم کی ترویج میں مشغول رہا اس کی ہر شخص نے عزت کی۔ یو۔ پی میں بلگرام، مارہرہ، کاکوری اور اسی قسم کے بیسیوں قصبے محض اپنے علمی مشاغل کی وجہ سے مشہور تھے، اور یہاں فی الواقع ایسے ایسے صاحبان علم اٹھے جنہوں نے علم و حکمت کی مشعل کو ہمیشہ روشن رکھا۔

لیکن اس کے برعکس انگریزوں کے عہد میں ہم نے اپنے اس سرمایۂ قومی کو برباد کر کے جھوٹے وقار کا ایک ایسا ہالہ بنا لیا جس سے باہر جانا ہمارے لیے ممکن نہ رہا اور ہمارے معاشرے میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جو ان کی ہر چیز سے اس لیے نفرت کرتا تھا کہ اس نووارد قوم نے آکر ان کا سب کچھ چھین لیا۔ مگر اس گروہ نے یہ کبھی نہ سوچا کہ آخر یہ بات سمندر پار کر کے یہ نووارد قوم ہم پر کیوں کر غالب آئی۔ ہم میں وہ کونسی سماجی اور اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں جو ہماری تباہی کا موجب ہوئیں۔ انگریز اس ملک میں کبھی بھاری بھر کم فوج لے کر نہیں آیا۔ اس نے ہماری ہی تلوار سے ہم پر حکومت کی، اس لیے اس گروہ نے غفلت سے ہمیشہ گریز کیا، دوسرا گروہ ایسے لوگوں کا تھا

جو انگریزوں کی تقلید کو اپنا ایمان سمجھتے تھے، ان کی چال ڈھال، ان کی بول چال اور ان کے رہن سہن کے طریقے کو اپنانا ضروری تصور کرتے تھے اور حق یہ ہے کہ یہ دونوں گروہ قوم کی تعمیر نو کی راہ میں ایک بہت بڑا روڑا تھے۔ کیوں کہ نہ تو نئے حاکم کی تقلید بے جا سے ہم اپنی منزل تک پہونچ سکتے تھے اور نہ ان حالات میں اس سے مقاطعہ ہی ممکن تھا۔

سرسیدؒ کی تعلیمی تحریک

اب ہمارے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ بدلے ہوئے حالوں میں نئے دور کے مزاج و آہنگ کو سمجھ کر اپنی راہ کی تعیین کرلیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ان حالات میں مردے از غیب بروں آید و کارے بکنند، کے مصداق سرسید نے قوم کی مرض کی صحیح تشخیص کی، انھوں نے اس طوفان کا رخ دیکھا اور اس طوفان کا جو آنے والا ہے صحیح اندازہ لگایا اور قوم کو سلامتی کے ساتھ ساحل تک لانے کا جو صحیح طریقہ تھا اس پر عمل کیا۔ انہوں نے یہ اچھی طرح محسوس کرلیا کہ قوم کی ترقی کا صرف ایک ہی راستہ ہے، اگر اس پر عمل نہ کیا گیا تو اس کا تباہ ہو جانا یقینی ہے، ان کی نگاہوں میں یہ راستہ تعلیم کا راستہ تھا چنانچہ انہوں نے اپنوں کی مخالفت کے باوجود اپنی تعلیمی تحریک کی بنیاد ڈالی، ان کے پہلو میں ایک ہمدرد دل تھا۔ سر میں خدمت قوم کا سودا۔ وہ مسلمانوں کے ایک ہاتھ میں علوم جدیدہ، دوسرے میں قرآن حکیم اور سر پر لا الہ اللّٰہ کا تاج دیکھنا چاہتے تھے اور حق یہ ہے کہ اس وقت جب ہماری قوم انحطاط و زوال کی تاریکیوں سے گذر رہی تھی علم ہی کے چراغ حیات کو روشن کرسکا اور قوم کی تعمیر و بقا میں علم ہی نے سب سے اہم پارٹ ادا کیا۔

غلامی کی برکات

انگریزوں نے بھی اس ملک میں تعلیم ہی کو اپنے استعماری استحکام کا ذریعہ بنایا، اور اس کو کچھ ان بنیادوں پر استوار کیا کہ اس میں وہ پہلی سی جاذبیت اور کشش باقی نہ رہی، وہ تعلیم جو انگلستان میں بڑے بڑے عالم، فلسفی، سائنس داں، مبصرین سیاست اور انتظام کار کی تخلیق و تربیت سامان مہیا کرتی تھی، اس نے اس ملک میں ایک ایسی کل کی شکل اختیار کرلی جو صرف انگریزی

حکومت کے چلانے کے لیے معمولی قسم کے پرزے ڈھالتی رہی۔ بڑی بڑی شینیں پھر بھی دساور سے آتی رہیں مگر چوں کہ اس نظام میں زندگی اور توانائی نہ تھی۔ اس لیے رفتہ رفتہ معلم کا وہ مقام جو قدرت نے اسے اس کے کام کی نوعیت کے لحاظ سے عطا کیا تھا اس سے چھین لیا گیا۔ وہ اب مخدوم و محترم نہ تھا۔ اب وہ ملازم تھا۔ اب اس کا کام طالب علموں کے ذہنوں کو منور کرنا نہ تھا، بلکہ چند نصابی باتوں کو ان کے ذہنوں میں اتار دینا تھا۔ اب اس کا جوا ہر پدر سے زیادہ وقیع نہ تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ معلم اور متعلم دونوں ایک دوسرے سے بیگانہ ہو گئے۔ شاگرد کے دل میں استاد کا احترام رہا اور نہ استاد کے دل میں شاگرد کی محبت۔ اس طرح معاشرے میں معلم کا مقام جوتیوں کی صف سے آگے نہ بڑھ سکا اب دیکھنا یہ ہے کہ معلم اپنے اس بلند مقام سے کیوں نیچے گرا دیا گیا۔ آیا اس کی وجہ صرف ایک بیرونی اقتدار ہے یا وہ سماجی اور اخلاقی کمزوریاں ہیں جو ہمارے معاشرے میں پیدا ہو رہی ہیں یا ہماری اس بے راہ روی کے دونوں ذمہ دار ہیں۔

یہ درست ہے کہ بیرونی اقتدار نے اگر ایک طرف ہمیں سیاسی اور اقتصادی طور پر مفلوج و معطل بنایا تو اس نے ہم سے ہمارا ثقافتی سرمایہ بھی چھیننے کی کوشش کی، کیوں کہ انگریز نے اس برصغیر میں صرف اپنے سیاسی تفوق ہی پر قناعت نہیں کی، وہ یہاں ہماری تہذیب اور معاشرت کے ان ایوانوں کے ڈھانے میں معروف رہا جنھیں ہم نے صدیوں کی شکست و ریخت کے بعد تعمیر کیا تھا۔ چناں چہ انگریزی حکومت نے ان تمام اداروں کو فکری اور نظری طور پر اپنی تنقید و استہزا کا مرکز بنایا جو مسلمانوں کو آزادی و حریت کا درس دیتے تھے، ایسے اداروں میں پڑھنے والے یا اس قسم کے اساتذہ سے متاثر ہونے والے نوجوانوں کے لیے ملازمت کے سارے دروازے بند تھے اور چوں کہ یہ دور مسلمانوں کے لیے ایک اقتصادی بحران کا زمانہ تھا اس لیے مجبوراً ہر طالب علم انھیں اداروں کی طرف رجوع کرتا جو انھیں علم کے مبادیات سے روشناس کرا کے معمولی سی ملازمت کا اہل بنا دے، یا دوسرے کہ اونچے اونچے عہدے صرف انگریزوں اور ان منافقوں کے لیے مخصوص تھے جو اپنی وفاداری کا وافر ثبوت مہیا کر سکیں، ان اداروں کی ترتیب و تنظیم میں جمہوریت کے

وہ اصول کار فرما نہ تھے جو استاد کو شاگرد کی نگاہوں میں محترم بنا دے، یا استاد شاگرد کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے لیے اپنا تن من دھن لگا دے، اس کشاکش کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ استاد کی حیثیت بجھتے ہوئے خورشید کے پرتو سے آگے نہ بڑھ سکی اور شاگرد بھی آب زلال کی تلاش میں سکندر وار ظلمات ہی میں چکر لگاتا رہا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء سے اس وقت تک کم و بیش سو برس گذر چکے ہیں۔ اس طویل مدت میں ایک نہیں سیکڑوں انقلاب آئے، انگریز اس برصغیر سے رخصت ہوا۔ اور اللہ تعالےٰ نے ہمیں اس ملک میں زمین کا ایک ایسا ٹکڑا عنایت کیا جہاں ہم اپنے قومی اور ملی تقاضوں کے مطابق زندگی کا باڈول ڈال سکتے ہیں، لیکن افسوس کہ آٹھ سال کی اس مدت میں ہمارے تعلیمی نظام میں کوئی انقلاب نہیں آیا۔ اور قرائن سے ابھی کسی انقلاب کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اساتذہ کی بدحالی

زندہ قومیں بدلے ہوئے ماحول میں اپنے آپ کو اس طرح بدل لیا کرتی ہیں کہ ان کا قومی کردار بھی قائم رہے اور نئے حالات میں ان کی ساکھ بھی بگڑنے نہ پائے۔ لیکن ہم نے انفرادی و اجتماعی طور پر اب تک اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش نہیں کی اور یہی ہماری قومی زندگی کا سب سے المناک حادثہ ہے۔ غلامی میں حاکم و محکوم کا تصور ذہنوں پر کچھ اس طرح بٹھا دیا جاتا ہے کہ غیر شعوری طور پر غلام اقتدار کے آگے سر جھکانا سیکھ لیتا ہے، کیوں کہ غلامی میں قوموں کا ضمیر اتنا مر جاتا ہے کہ تمدن آفرینی اور آئین جہاں داری کی اس کے بس کی بات نہیں ہوتی اس لیے وہ اس دور میں صرف طاقت کی پرستش کرتا ہے، جہاں اسے طاقت نظر آتی ہے اس کی نگاہیں بھی ہو جاتی ہیں اور وہ آنکھوں آنکھوں ہی میں اس کی برتری اور عظمت کا اعتراف کر لیتا ہے۔ اس وقت نہ اس کی اخلاقی قدر اسے زندہ رہنے کا درس دے سکتی ہے اور نہ اس کی قومی زندگی کی روایات اسے سربلند بنا سکتی ہیں کیوں کہ وہ تو انھیں ماضی کے پارینہ اور لایعنی مفروضے تصور کرتا ہے جس کی وقعت اس کی نگاہوں میں بالکل نہیں ہوتی۔ لیکن آزادی کے بعد تو ان تصورات میں

ایک انقلاب آجانا چاہیے۔ اگر یہ انقلاب اب تک نہیں ہوا تو اس کا نتیجہ ہماری سیاسی اور اقتصادی موت ہو سکتی ہے۔ اس دور میں جب کہ دنیا میں ایسی قوتیں مصروف عمل ہیں جو واقعات کو اس سرعت اور تیزی سے بدل دیتی ہیں کہ ہم عام حالات میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اگر ہم ذہنی اور سماجی مطابقت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے یا نئے دور کے مزاج و آہنگ کو سمجھتے ہوئے اپنی معاشی زندگی کو اس نئے سانچے میں ڈھالنے سے گریز کرتے ہیں تو اس سے فائدہ کی کم اور نقصان کی زیادہ امید ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں اس برصغیر کا وہ دور جس میں انگریزوں کا سامراجی نظام ہماری معاشرتی زندگی پر چھایا ہوا تھا، اور ہم ہر چیز سے بے گانہ ایک ان جانی راہ پر چل رہے تھے اس کی واضح اور روشن مثال ہے۔

معلم کی سماجی حیثیت کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے موجودہ معاشرے کی ہیئت کذائی کا واضح تجزیہ کریں اور اس میں ان عوامل کا جائزہ لیں جو معاشرتی سربلندی یا پستی کا معیار مرتب کرتے ہیں۔ اس وقت دنیا بڑی تیزی کے ساتھ مادیت کی طرف بڑھ رہی ہے اور ہر چیز جس میں سیم وزر کی جلوہ گری موجود نہ ہو، ہیچ بلکہ بے کار سمجھی جاتی ہے۔ زندگی کا یہ دستور کوئی اتنا پرانا نہیں ہے لیکن ہم اسے نیا بھی نہیں کہہ سکتے۔ بہرصورت ہر ایا عملاً اس دور میں ہماری نوعی زندگی میں بلندی یا پستی کے ناپنے کا سب سے اعلیٰ معیار یہی ہے۔ یعنی مال و دولت یا طاقت۔ یا دونوں۔ اگر ان میں سے ایک بھی ہمارے پاس موجود نہیں تو ہماری سماجی حیثیت معلوم، اب دیکھنا یہ ہے کہ استاد کی شخصیت میں ان دونوں اوصاف میں سے کوئی وصف موجود ہے یا نہیں، اگر ان دونوں میں صرف ایک ہی وصف موجود ہے تو اس کی حیثیت کے ماننے یا نہ ماننے کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ ہر وصف سے عاری ہے تو اس کی حیثیت اس دربان سے زیادہ وقیع نہیں جو قرمزی پیٹی باندھے اپنے صاحب کو موہوم عظمت کی یاد تازہ کراتا رہتا ہے۔

ہماری معاشرتی زندگی میں معلم کا وقار اس اچھوت سے زیادہ نہیں جو اونچی قوموں کے آرام و آسائش کے لیے دن رات ان تھک محنت کرتا ہے لیکن اس خدمت کے صلے میں اسے

اس کا پورا معاوضہ ملتا ہے اور نہ ذہنی آسودگی میرے ایک پرانے ساتھی جو تعلیم میں مجھ سے دو سال جونیر تھے "گلیکسو اینڈ کمپنی" میں ملازم ہیں اور انہیں ایک معقول مشاہرہ ملتا ہے۔ علی گڑھ میں وہ ایک سادہ اور متشرع مسلمان تھے صوم وصلوٰۃ کے اتنے پابند کہ کبھی ایک وقت کی نماز قضا نہ ہوتی۔ اب جو میری ان سے ملاقات ہوئی تو حالات بدلے ہوئے تھے۔ شیروانی اور پاجامے کی بجائے ایک مکلف سوٹ زیب تن۔ سگار نہ سہی تو کم از کم ایک عمدہ قسم کا سگریٹ ہونٹوں کے درمیان دبا ہوا۔ باتیں ایسی کہ میری سمجھ سے بالاتر اور خیالات کی پرواز ایسی جو آسمانوں کے افلاک کی خبر لانے والی۔ قصہ مختصر یہ کہ اب صاحب بات نہیں کرتا TALK کرتا ہے۔ پانی نہیں پیتا بلکہ DRINK سے شغل کرتا ہے اور فضول نخرہ FLIRT کرتا ہے۔ اس نمایاں تبدیلی کو دیکھ کر میں کچھ متوحش ہوا لیکن انہوں نے نہایت بے پرواہی سے فرمایا۔ بھئی معاف کرنا میرا اس وقت ایک ENGAGEMENT ہے پھر ملوں گا۔ اس بدلے ہوئے تیور کو دیکھ کر میرا یہ تو جی نہ چاہا کہ میں ان سے دوبارہ ملوں۔ لیکن میرے دل میں اس کے اسباب جاننے کی خواہش ضرور پیدا ہوئی۔ ایک روز اتفاق سے ایک جگہ میری اور ان کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ یہ ایک بزرگ کے گھر ایک نجی مجلس تھی جس میں وہ بھی موجود تھے اور میں بھی شریک تھا۔ گفتگو کا خاصہ موقع ملا۔ میں نے ان سے اس ہیئت کذائی کے اسباب پوچھے تو انہوں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا اور کہا "میں خدا اور اس کے قانون کو سرنیاز چھوڑ آیا ہوں۔ آپ مدرس ہیں۔ آپ کو ضرورت ہو تو جا کر کسی سکھ کی خوشامد کیجیے وہ آپ کی امداد کرے گا" میں اس غیر متوقع جواب کے لیے تیار نہ تھا اس لیے مجھے کچھ تعجب بھی ہوا اور کچھ افسوس بھی لیکن میں نے انہیں کوئی تلخ جواب نہ دیا بلکہ انہیں کچھ سمجھانے ہی کی کوشش کی، اس کے بعد بارہا ملاقاتیں ہوئیں لیکن میں نے عمداً بہت کم باتیں کیں۔ بلکہ بات کرنے سے ہمیشہ پہلو تہی کی۔ مگر وہ مجھے ہمیشہ یہ احساس دلاتے رہے کہ میں مدرس ہوں یعنی مجھے اس مجلس میں اول تو بیٹھنے کا حق نہیں اور اگر بالفرض کسی نے غلطی سے شریک محفل کر لیا ہے تو میرا منصب یہ نہیں کہ میں گفتگو میں حصہ لے سکوں۔ اسی طرح کئی سال

گذر گئے۔ میں اپنی اسی رفتار پر چل رہا تھا۔ اس کچھوے کی رفتار سے جس کی منزل تو دور تھی لیکن اس کا عزم جوان تھا، اور انہوں نے اس مختصر سی مدت میں بے شمار مراحل طے کر لیے حتیٰ کہ شادی کو محض ایک سماجی تعلق سمجھنے والے نے بقول خود بیوی کا طوق بھی اپنی گردن میں ڈال لیا۔ ہمارے ایک بزرگ نے ان کے اعزاز میں دعوت کی۔ بدقسمتی سے میں بھی شریک بزم تھا۔ وقت مقررہ سے کوئی آدھ گھنٹہ بعد صاحب موصوف بیگم صاحبہ کی معیت میں تشریف لائے۔ انہوں نے مجلس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ میرا خیال تھا کہ دیر سے پہنچنے کی معذرت ضرور کریں گے۔ لیکن ان کے منہ سے ایک حرف نہ نکلا، جب سب لوگ بیٹھ گئے تو ان کی خشمگیں نگاہیں میرے اوپر مرکوز ہوگئیں اور اس طرح جیسے وہ مجھے کھا جائیں گے یا اپنی پیالی میرے منہ پر کھینچ ماریں گے۔

اس وقت میں نے انتہائی تجاہل سے کام لیا۔ گویا میں ان کی اس اضطراری کیفیت سے بالکل بے نیاز ہوں، جب ان سے نہ رہا گیا تو انہوں نے ایک بھونڈا سا مذاق کیا اور کھسیانی سی صورت بنا کر مجھ سے کہا آپ تو اسے سمجھے ہی نہ ہوں گے۔ میں نے بھی اس وقت جی کڑا کر کے اور آداب مجلس کو بالائے طاق رکھ کر کہا "جی ہاں کیوں کہ مجھے FLIRT کرنا نہیں آتا"۔ اس پر وہ بہت زیادہ برہم ہوئے۔ لیکن ان سے کوئی جواب نہ بن سکا اور قریب تھا کہ ان کے منہ سے کوئی اور خوب صورت سا کلمہ نکلتا کہ ہمارے ایک اور ساتھی نے جو میرے بالمقابل بیٹھے تھے مجھ سے پوچھنے لگے، "کیوں بھئی تمہارا پاسپورٹ بن گیا یا نہیں، کب تک جا رہے ہو" ان کے اس استفسار پر تو صاحب کی بھی کنوتیاں کھڑی ہوگئیں اور انہوں نے پوچھا کیسا پاسپورٹ یہ کہاں جا رہے ہیں" اس کا جواب نہ میں نے دیا اور نہ میرے ساتھی نے۔ ہمارے میزبان اس وقت اتفاقاً ہمارے بیچ میں کھڑے تھے جواباً کہنے لگے "لندن۔ خدا کا شکر ہے میں مدت سے اس دن کے انتظار میں تھا" ان کے اس جواب نے بجلی کا کام کیا اور صاحب کا موڈ بالکل بدل گیا۔ فرمانے لگے آپ تو بالکل چپ چپ رہتے ہیں کبھی کبھی تو ملا کریں۔ آخر ہم بھی تو

آپ کے نیاز مندوں میں ہیں۔ ان کی یہ نیاز مندی بہر صورت میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ محض اس خیال سے کہ میں لندن جا رہا ہوں میرے وقار میں کیوں کر اضافہ ہو سکتا ہے۔ میری ذہنی سطح اور میری سماجی حیثیت میں اس سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن مجھے ان کی اس پست نگاہی پر افسوس ضرور ہوا۔ اب وہ مجھ سے ملتے ہیں بڑے خشوع و خضوع سے مگر میں ان سے ہمیشہ اکھڑی اکھڑی باتیں کرتا ہوں جس کا وہ مجھ سے نہیں دوسروں سے گلہ کرتے ہیں۔

ایک دوسرا واقعہ اس سے کم دلچسپ نہیں ہے۔ میں ضلع کچہری کے بس اسٹینڈ پر ریگل تک جانے کے لیے بس کے انتظار میں کھڑا تھا کہ ایک رفیق دیرینہ سے ملاقات ہوئی جو لاہور کے ایک اچھے وکیل کہے جاتے ہیں۔ صاحب سلامت کے بعد ان سے دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں جن میں ان کی پرواز ثریا سے بھی پرے تھی۔ ان کی گفتگو میں تصنع زیادہ ہو جاتا اور وہ میری تحقیر کے لیے مناسب الفاظ کی تلاش میں تھوڑی دیر کے لیے گم سم بھی ہو جاتے۔ بالآخر انہوں نے طبیعت پر جبر کر کے کہا "تم نے یہ ذلیل پیشہ کیوں اختیار کر لیا۔ قانون پڑھ کر وکالت کرتے تو چار آدمی تمہاری عزت بھی کرتے"۔ ان کے اس بیہودہ سوفلسطہ پر مجھے تاؤ ہی آ گیا۔ اور میں نے بڑی رکھائی سے کہا "مجھے اس موہوم عزت سے غریب کسان کے ناز کش بچے زیادہ عزیز ہیں جو دن رات محنت کر کے ہماری جھولی بھرتے ہیں"۔ اور پھر میں نے تابڑ توڑ کچھ ایسی باتیں کیں کہ وہ بوکھلا گئے اور اپنی ساری حرکات بھول گئے۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ اس وقت میری زبان سے کون سے کلمات نکلے جن میں کون سے حق تھے اور کون سے ناحق۔ اس کے بعد تو انہوں نے مجھے ٹھنڈا کرنے کی بڑی کوشش کی اور میں خاموش بھی ہو گیا۔ لیکن اس درد کی کسک میرے دل میں اب بھی موجود ہے۔ کہ پڑھے لکھے لوگ بھی اسے ذلیل پیشہ تصور کرتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ تم نے تعلیم کس طرح پائی۔ تمہیں کس نے تربیت دی اور تمہاری زیست کے مادی و ما علیہ کیا ہیں۔

میرے ایک دوست واہ چھاؤنی کے ایک مدرسے میں کام کرتے ہیں۔ یار باش اور زندہ دل انسان ہیں۔ اپنے طالب علمی کے زمانے میں وہ ایک اچھے لیڈر اور طلبہ میں

بہت ہی مقبول تھے۔ ان کے ساتھی انہیں احتراماً "پیر صاحب" کہا کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور سیاست دان بننے کی بجائے وہ مدرس بن گئے۔ اور مدرس بھی ایسے کہ مغربی پاکستان کے ہر علاقے اور ہر قسم کے مدرسوں میں اپنی بیادت کا جھنڈا گاڑتے پھرے اس لیے بحیثیت مدرس ان کے معاشرتی تجربے ایک دو نہیں سیکڑوں تک پہنچتے ہیں۔ جو بہر صورت عبرت کے مرقعے ہی کہے جا سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ انہیں ایک ایسے اسکول کی عنان سنبھالنی پڑی جس میں پچھلے چھ مہینے سے کوئی گریجوایٹ موجود نہ تھا، ہائی اسکول کے نتائج ناقابل بیان حد تک خراب تھے۔ اساتذہ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر گروہ کو شہر کی کسی نہ کسی پارٹی کی حمایت حاصل تھی، طلبہ بھی پڑھنے کے لیے کم، غنڈہ گردی کے لیے زیادہ آتے تھے، جب پیر صاحب وہاں پہونچے تو پہلے ہی روز ان کے کان میں بجانت بجانت کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی انہیں حالات کی نزاکت کی طرف توجہ دلاتا۔ کوئی طلبہ کی بدنظمی رونا روتا۔ کوئی ایک چودھری صاحب کی شان میں قصیدہ پڑھتا کوئی اسے مردود قرار دے کر دوسرے کی مدح میں ایک فی البدیہہ قصیدہ کہہ ڈالتا۔ غرض یہ سلسلہ تادیر جاری رہا، دوسرے روز ایک چودھری صاحب نے انہیں بلایا۔ انہوں نے پیام بر سے پوچھا کہ آخر چودھری صاحب کو مجھ سے کیا کام ہے۔ میں تو نووارد ہوں اور میری ان سے جان پہچان بھی نہیں۔ ان حالات میں تو بھائی میں ابھی کسی سے ملنے ملانے کے لیے تیار نہیں"۔ بظاہر تو یہ ایک معمولی سی بات تھی لیکن اس کے نتائج دور رس نکلے۔

دوسری پارٹی نے جب ہیڈ ماسٹر صاحب کے یہ تیور دیکھے تو انہیں اپنے حلقۂ حمایت میں لینے کے لیے نامہ و پیام شروع ہو گئے۔ لیکن یہاں بھی ان کی روش معاندانہ نہ سہی تو روکھی ضرور رہی۔ اس عدم التفات نے ایک مسموم فضا پیدا کر دی۔ اسکول میں بھی اور اسکول کے باہر بھی۔ کوئی کہتا کہ عجیب ہیڈ ماسٹر ہے، چودھری صاحب کو سلام کرنے نہیں گیا بھلا یہ اس کو زیب دیتا ہے۔ ٹکے کا ماسٹر علاقے کے اتنے بڑے آدمی کا احترام نہیں کرتا، اس کی حیثیت کیا

یک اسی قسم کی مجلس میں چودھری صاحب نے خود ببکار تے ہوئے فرمایا۔ ہم نے اس قسم
کے بہت سے ہیڈ ماسٹر دیکھے ہیں۔ اب کے لاہور گیا تو انسپکٹر سے کہہ کر آؤں گا کہ ہمیں
یسا ذلیل آدمی نہیں چاہیے۔ وہ لاہور گئے بھی اور پیر صاحب کی شکایت بھی کی۔ انسپکٹر نے
نہیں سمجھا بجھا کر واپس کر دیا، جب وہاں بھی ان کی دال نہ گلی تو وہ ان کے بعض ہم کاروں اور
بنا بہر پھرے طلبا سے ایسی بے عنوانیاں کرانے لگے جو کسی مہذب سوسائٹی میں تو دیکھنے
سننے میں نہیں آئیں۔ لیکن ان کا سابقہ بھی ایک ایسے شخص سے پڑا تھا جو اس قسم کے سیاسی
ھکنڈوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ عہدیت کے اس انحراف کی سزا بہت بڑی
ہو سکتی ہے۔ وہ جس طرف جاتے لوگ ان کا مذاق اڑاتے، دوکاندار ان سے روابط رکھتے
ہوئے ڈرتے۔ شہر کے امن پسند باشندے ان کے قریب آتے ہوئے جھجکتے۔ غرض اسکول میں بھی
ڑے چودھری صاحب کا راج تھا۔ اور چودھری صاحب اسی وقت خوش ہو سکتے ہیں جب
ہیڈ ماسٹر صاحب صبح و شام ان کی بارگاہ میں سلام و نیاز کا نذرانہ لے کر جایا کریں اور کبھی
ن کی بھونڈی سی شکل کی خوب صورتی اور کبھی ان کی کریہہ آواز کی نغمہ ریزی کا گن گایا کریں، ان کی
بے معنی اور کھردری باتوں پر واہ و تحسین کریں تو شاید انہیں ان کی منڈلی میں تالیاں بجانے کی
جگہ مل جاتی۔

پیر صاحب نے عزم و حوصلے کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ نہایت خاموشی کے ساتھ وہ
ان بے عنوانیوں کا تماشہ دیکھتے رہے۔ ایک دن ایک مدرس نے ان سے بڑی سنجیدگی سے
کہا ہیڈ ماسٹر صاحب ہم غریب پیشہ ہیں۔ ہمارا ان کا کیا مقابلہ۔ آپ ان سے معافی مانگ لیں"
س پر انہیں سخت تاؤ آیا۔ مگر انہوں نے اپنے ہم کار سے صرف اتنا کہا، "کیا ایک معلم کے ضمیر کی
شرف یہی حقیقت ہے" اور پھر خاموش ہو گئے۔ میں نے پوچھا پیر صاحب آپ میں یہ تحمل کیسے
پیدا ہو گیا، اس پر وہ مسکرائے۔ تھوڑے سے توقف کے بعد انہوں نے اپنی داستان کا آخری حصہ
سنایا۔ انہوں نے چودھریوں کے چند شورہ پشت لڑکوں کو ایک ایک کر کے اسکول سے رخصت کر دیا۔

اس پر تو شہر میں طوفان برپا ہو گیا۔ اب تو ہر شخص کو پیر صاحب کے سرخرو ہونے کا یقین ہو گیا۔ سرباز
کسی نے کہا یہ تو ہاتھی کا پہاڑ سے ٹکرانا ہے۔ پہاڑ کا کچھ بھی نہ بگڑے گا۔ مگر جرائم ایسے تھے۔ کہ
چودھری صاحب کچھ نہ کر سکے۔ مگر کھینچاؤ بڑھتا گیا۔ اس طرح ایک سال گذر گیا۔ اسکول کا نتیجہ
غیر معمولی طور پر اچھا تھا۔ اساتذہ کی پارٹی بازی ختم ہو چکی تھی۔ چودھریوں کی مداخلت کا بظاہر کوئی
سوال نہ تھا۔ لیکن پیر صاحب نے اس کے بعد وہاں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ "جہاں عزت نہ ہو
کوئی کیا کام کرے، کم بخت تیلی تنبولی ہر شخص ذلیل سمجھتا ہے محض چودھری صاحب کے اشارہ چشم
کی بدولت" میں نے کہا تو پیر صاحب آپ نے ہمت ہار دی کہنے لگے یہ بات نہیں ابھی تم لاہور سے
باہر نہیں گئے ورنہ تم مجھ سے یہ نہ کہتے۔"

یہاں مجھے ذاتی طور پر ان سے اختلاف ہے۔ لاہور اور مضافات کے مدرسوں میں صرف نام کا
ہے۔ مزاج و آہنگ میں سب ایک ہیں۔ بلکہ بعض صورتوں میں یہاں کے حالات زیادہ مایوس کن
ہیں۔ دیہاتوں میں کم از کم اساتذہ کو اپنے طلبہ سے تو اتنی شکایت نہیں ہوتی۔ یہاں تو طلبہ اپنے
والدین سے بھی بڑھ چڑھ کر کوتاہ نظر، کم کوش اور کج خلق ہوتے ہیں، انہیں اپنے بزرگو
کی وجاہت، ان کی ریاست، مال و دولت اور منصب کا غرہ ہوتا ہے۔ ان کے مزاج زیادہ بگڑ
اور ان کے اخلاق زیادہ گرے ہوئے ہوتے ہیں۔ "پچھلے اپریل میں لاہور کے ایک مشہور و معرو
مدرسے میں جسے لوگ بزعم خود پنجاب کا منفرد ادارہ بھی کہتے ہیں، داخلے کا ہنگامہ تھا۔ طلبہ او
والدین دونوں مساوی تعداد میں احاطۂ مدرسہ میں موجود بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بعض حالات
ایک ایک بچے کے ساتھ دو دو تین تین بزرگوں کی ٹولی موجود تھی، غرض یہ کہ یہ ایک انسانی سی
تھا، جو اسکول کے ایک ایک گوشے میں امنڈتا نظر آتا تھا۔ کوئی ساڑھے آٹھ بجے امتحا
شروع ہوا۔ اب کسی شخص کو بچوں سے ملنے یا ان کے قریب جانے کی اجازت نہ تھی۔ دروازہ
باہر ایک ٹھٹھ لگا ہوا تھا، ہر شخص اندر داخل ہونے کے لیے بے تاب نظر آتا تھا۔ کبھی ضرورتاً
دروازہ کھلتا تو لوگ اس طرف ٹوٹ پڑتے۔ جو اساتذہ دروازے پر اس سیلاب کو روکنے

نہیں تھے۔ انہیں بڑی دشواریاں پیش آرہی تھیں۔ خود ایک مرتبہ مجھے بھی اس طرف جانا پڑا دروازے سے نکلتے ہوئے میں نے اپنے ایک ہم کار سے کہا اگر میں اس جگہ ہوتا تو میری دو ایک حضرات سے تو تو میں میں ضرور ہو جاتی۔ میرے یہ ہم کار نہایت متین سنجیدہ اور شستہ علیق قسم کے انسان ہیں، وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے، تھوڑی دیر بعد دروازے پر ایک ہنگامہ ہو گیا، اور اس شور و غوغا میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، میں نے کوشش کی کہ میں بھی دروازے تک پہونچ جاؤں۔ لیکن بظاہر یہی نظر آیا کہ اگر میں نے مزید کوشش کی تو شاید جان عزیز سے بھی ہاتھ دھونا پڑے میں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ دور کھڑا رہوں، جب طوفان کی شدت میں کمی ہوئی۔ لوگوں کی نقل و حرکت بند ہوئی اور کوئی سر جھکا کر اس طرف اور کوئی دوسری طرف چلنے لگے تو میں بھی پہونچا۔ وہاں پہونچ کر میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ نہایت دل دوز تھا۔ لاہور کے ایک معروف ایم۔ ایل۔ اے مجلس قانون ساز کے رکن ہونے کی حیثیت سے یا شاید اپنی بد کلامی کے زعم میں اندر داخل ہوتے پر مصر تھے منتظم حضرات نے انہیں جانے کی اجازت نہ دی تو وہ بہت برہم ہوئے اور انسانیت کو بالائے طاق رکھ کر جو سخن و مغرب شانی شروع کیں تو یہ سیلاب بلا تھمنے ہی کو نہ آیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہماری قومی زندگی پر ایک بدنما داغ ہے۔

ہمارے ایم۔ ایل۔ اے صاحب اپنے بچے کو اس مدرسے میں داخل کرانے کے لیے تشریف لائے تھے اور اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کے واسطے ایسے اساتذہ کا انتخاب کر رہے تھے جو بعض کے الفاظ میں ننگ معاشرہ ہیں۔ ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

کالج کی تعلیم

انور علی قریشی

ایشیائی مسیحی کالجوں کی انجمن واقع لندن نے ۱۹۵۳ء میں ایک یونی ورسٹی لیکچرار کو اس غرض سے جنوبی ہند میں بھیجا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے مسیحی کالجوں کے متعلق رپورٹ تیار کرے، اس نے واپسی پر جو تاثرات بیان کیے ہیں ان میں ایک جملہ بڑے مزے کا لکھا ہے وہ کہتا ہے: ـکسی مزاح نگار نے لیکچر کی یہ تعریف کی ہے کہ یہ وہ شے ہے جو لیکچرار کی نوٹ بک سے طالب علم کی نوٹ بک میں پہنچ جاتی ہے لیکن دونوں میں سے کسی کے بھی ذہن میں داخل نہیں ہوتی. یہ تعریف ہندوستان اور پاکستان میں تقریباً لفظ بلفظ درست ہے۔

یہ وہ سند ہے جو ایک برطانوی لیکچرار نے اپنے ہم پیشہ پاکستانی لیکچراروں کو عطا کی ہے جن لوگوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ تنخواہ کے گریڈ بہتر ہو جانے سے لیکچراروں کے کام کی خوبی بڑھ جائے گی انہیں یقیناً ایک غیر ملکی لیکچرار کا یہ تبصرہ پڑھ کر مایوسی ہو گی. تاہم اس میں کلام کی گنجائش نہیں کہ یہ رائے بڑی حد تک مبالغے سے خالی ہے. چند سال ہوئے پنجاب یونی ورسٹی کی طرف سے کالج کے اساتذہ کے نام ایک سوال نامہ جاری کیا گیا تھا جس میں دوسری باتوں کے علاوہ لیکچرار صاحبان سے یہ سوال بھی پوچھا گیا تھا کہ وہ روزمرہ اسباق کے لیے عموماً کس قسم کی تیاری کرتے ہیں؟ اس کے جواب میں بعض لیکچرار حضرات نے بڑے فخر کے ساتھ یہ جواب دیا تھا کہ ان کا تدریسی تجربہ اب اس قدر پختہ ہو چکا ہے کہ انہیں کسی تیاری کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی بعض نے یہ کہا تھا کہ انہوں نے اپنے طویل تجربے کی روشنی میں نوٹ تیار کر رکھے ہیں جنہوں نے اب انہیں ہر قسم کی تیاری سے بے نیاز کر رکھا ہے، جہاں کالجوں میں پڑھانے والے لوگ اس قسم کے تعلیمی نظریوں کے قائل ہوں وہاں یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں کہ اکثر حالتوں میں استاد اور شاگرد دونوں لیکچر کے

مطالب سے بے خبر رہتے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کا راشن

کچھ عرصہ سے پنجاب یونی ورسٹی کی طرف سے یہ کوشش جاری ہے کہ کالجوں کے دروازے ہر کس و ناکس کے لیے کھلے رہنے کی بجائے صرف ایسے طلبہ کے لیے مخصوص کر دیے جائیں جنہوں نے مدرسہ کے درجے پر اعلیٰ تعلیم سے استفادہ کرنے کی صلاحیت کا واضح ثبوت دیا ہو، اس کے جواز میں یہ کہا گیا ہے کہ موجودہ صورت حال بڑے المناک، قومی ضیاع کے مترادف ہے، میٹرک پاس کرنے کے بعد ہر طالب علم کالج کا رخ کرتا ہے، ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جو کالج کی تعلیم سے بہرہ مند ہونے کے ہرگز قابل نہیں ہوتے، اس پر ستم یہ کہ ان میں سے بہتوں کے والدین اپنا پیٹ کاٹ کر انہیں کالج میں بھیجتے ہیں، کالج میں دو چار سال گذار اور بار بار فیل ہو کر ان طلبہ کی ایک بھاری تعداد کالجوں سے ناکام لوٹتی ہے، اس طرح نہ صرف سینکڑوں نوجوانوں کا وقت ضائع ہوتا ہے بلکہ ان کے والدین کے گاڑھے پسینے کی کمائی بھی خاک میں ملتی ہے، ان حالات میں ہوش مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ کالج میں داخلہ کے لیے ایک معقول آزمائشی امتحان رکھا جائے اور صرف ان طلبہ کو داخل کیا جائے جو اس آزمائش میں کامیاب ثابت ہوں، باقیوں کو کچھ اور کام کاج تلاش کرنا چاہیے یا فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔

ان تجویزوں کے خلاف بعض حلقوں کی طرف سے بہت شور و غل مچایا گیا ہے، اسے "تعلیمی راشن" اور اس قسم کے دوسرے گمراہ کن نام دے کر اس کے اصل مقاصد کو عوامی نگاہ سے اوجھل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر معاشرتی رواج جس کی جڑیں کچھ مضبوط ہو چکی ہوں مانوس ہونے کے سبب خواہ مخواہ پسندیدگی کی سند حاصل کر لیتا ہے خواہ اس کی برائیاں ہر آنکھ کو نظر آتی ہوں۔ یہی حال ہمارے موجودہ کالجوں کا ہے، اس پر مستزاد یہ کہ مجوزہ اصلاح سے ان کاروباری لوگوں کے مفاد پر کڑی ضرب پڑتی ہے جنہوں نے تعلیمی کام کی آڑ میں ذاتی منفعت کی دکانیں چمکا رکھی ہیں۔ انہوں نے عوامی ذہن کی رسم پرستی کو تھپکا کر مجوزہ اصلاحات کے خلاف ایک اچھا خاصہ ہنگامہ

برپا کر رکھا ہے، یہ مہم بظاہر فلاکت زدہ عوام کی حمایت کے نام پر جاری ہے۔ مگر اکثر حالتوں میں اس کی تہ پر مخصوص مصالح کے سوا اور کچھ نہیں۔

اگر بالفرض محال کالج میں داخلہ پر مجوزہ پابندیوں کو "تعلیمی راشن" کہنا بجا بھی ہو تو بھی ذہن میں خواہ مخواہ یہ سوال آتا ہے کہ کیا قومی مفاد کے پیش نظر بعض اوقات راشن کا طریق اختیار کرنا ناگزیر نہیں ہو جاتا؟ اگر "راشن" کے بغیر قومی زندگی ہی خطرے میں نظر آ رہی ہو تو پھر اس کے سوا اور چارہ کار ہی کیا رہ جاتا ہے؟ پس تعلیمی مباحث میں یہ امر اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ جذبات سے الگ ہو کر صرف بنیادی حقائق پر نگاہ رکھی جائے، اگر کسی درجہ پر ملکی وسائل کا تعلیم پر صرف کرنا قومی زندگی کی صحت مندی کے لیے ناگزیر ہو تو ان وسائل کی بہم رسانی کی ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے اس کے برعکس اگر ان وسائل کا صرف بجائے فائدہ کے مضرت کا سبب بن رہا ہو تو انہیں کسی اور مفید تر سمت میں صرف کرنا چاہیے، غرض اس مسئلہ پر بحث کرتے وقت نگاہ صرف تعلیم کے مسلّمہ اصولوں اور قومی ضرورت تک محدود رہنی چاہیے، جذبات اور ذاتی مصالح کو بیچ میں گھسیٹ لانا سراسر غلط ہے۔

کالجوں کے طلبہ

ذہنی پختگی کے اعتبار سے ہمارے کالجوں کے طلبہ کی عام کیفیت کیا ہے؟ اوسطاً ایک جماعت میں اسّی ۸۰ سے سو تک طالب علم بیٹھے نظر آئیں گے۔ ان کی انگریزی دانی بے حد معمولی قسم کی ہو گی، وہ نوٹ خود تیار نہیں کر سکتے بلکہ لقبد ہیں کہ ہر لفظ لیکچرار خود لکھائے، وہ اپنے طور پر کوئی کتابیں نہیں پڑھتے، ان کی پڑھائی استاد کے لکھائے ہوئے نوٹوں سے شاذونادر ہی آگے بڑھتی پاتی ہے ذہنی پختگی کا یہ عالم ہے کہ سال سوم میں پڑھ رہے ہیں مگر بعض کی عمر ابھی صرف سولہ برس ہے کوئی دو سال بعد ان میں سے کوئی ایک تہائی تعداد اپنے ناموں کے ساتھ بی۔ اے کا دم چھپ لگا رہی ہو گی۔

اس کے مقابلے میں ذرا انگلستان جیسے ترقی یافتہ ملک پر نگاہ ڈالیے جس عمر کے طلبہ

ہماری ڈگری جماعتوں میں پڑھتے ہیں۔ اس عمر کے طلبہ آپ کو وہاں گرامر اسکول کی آخری جماعتوں میں ملیں گے، گویا انگلستان میں جو تعلیمی خدمت گرامر اسکول انجام دے رہے ہیں وہ ہمارے ملک میں یونی ورسٹیوں نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ لیکن دونوں کے طریق کار میں بڑا فرق ہے کہ جہاں گرامر اسکولوں میں داخل ہونے کے لیے ایک سخت داخلے کے امتحان میں سے گذرنا پڑتا ہے ہماری یونی ورسٹیوں نے ایسی کوئی آزمائش ضروری نہیں سمجھی۔ جہاں گرامر اسکول کام شروع کرنے سے پہلے اس بات کا یقین کر لیتے ہیں کہ جن کی خاطر کام کیا جا رہا ہے وہ اس سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہیں وہاں ہمارے کالج (اور یونی ورسٹیاں) ہر اس طالب علم کو پڑھانے کی ذمہ داری لے لیتے ہیں جو ان کے ہاں چلا آئے۔

ناقابلِ تلافی نقصان

جو لوگ اس صورت حال کو جاری رکھنے کے حق میں ہیں ان کی نگاہ شاید اس عظیم قومی نقصان کی طرف نہیں گئی جس کی تلافی کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ کالجوں کی بے پناہ بھیڑ میں وہ قابل جوہر بھی موجود ہوتے ہیں جو اعلیٰ تعلیم سے مستفید ہونے کی حقیقی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر یہ بدنصیب اقلیت اس اژدہام میں دم گھٹ کر رہ جاتی ہے، اس کے اصلی جوہر کبھی کھلنے ہی نہیں پاتے۔ یہ ہونہار طالب علم اپنا مقابلہ ایک ایسے گروہ کے ساتھ پاتے ہیں جو رٹنے کے سوا کسی اور چیز کو نہیں جانتا۔ ایسے انبوہ میں معمولی امتیاز حاصل کر لینا کسی زیادہ ذہنی کاوش کا محتاج نہیں۔ غیر معمولی استعداد کے طلبہ استادوں کے غیر موزوں طریقہ ہائے تدریس اور کالج کی غیر علمی فضا کے باوجود دوسروں سے آگے ضرور نکل جاتے ہیں لیکن ایک صحت مند تعلیمی ماحول میں ان کی خداداد صلاحیتیں فکر و نظر کی جس سطح تک بلند ہو سکتی تھیں اور اس طرح علم و سائنس کے میدان میں ملک کو جو فائدہ پہونچ سکتا تھا اس کے امکانات بالکل ختم ہو جاتے ہیں، یہ وہ قومی نقصان ہے جس کے سامنے ہزاروں فیل ہونے والے طلبہ کے وقت اور روپیہ کا ضیاع بھی ہیچ ہے۔

بھیڑ کے اسباب

کالجوں میں موجودہ بھیڑ زمانہ مابعد تقسیم کی خصوصیت ہے، حالاں کہ آزادی ملنے کے بعد بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری کالج نئے کھلے ہیں۔ پھر بھی کسی کالج میں تل دھرنے کو جگہ نظر نہیں آتی ہر سال تعداد طلبہ متواتر بڑھتی جا رہی ہے۔ یونی ورسٹی امتحانوں کے نتیجے ہمیشہ ۲۰ سے ۳۵ فی صد کے درمیان رہتے ہیں۔ یعنی ایف۔ اے۔ بی۔ اے اور دوسرے اعلیٰ امتحانوں میں شریک ہونے والوں میں سے عموماً ایک چوتھائی سے لے کر ایک تہائی تک کامیاب ہوتے ہیں، اس پر بھی نہ کالجوں میں بھیڑ کم ہونے میں آتی ہے اور نہ پرائیویٹ تعلیمی دوکانوں کی گہما گہمی گھٹتی نظر آتی ہے، پرائیویٹ ٹیوشن ایک ایسا پرمنفعت کاروبار ثابت ہو رہا ہے کہ اس کے اڈے لاہور سے نکل کر ہر قصبے اور بستی تک پھیل گئے ہیں اور سب کے سب خوب ہاتھ رنگ رہے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کی یہ پیاس اتنی ناقابلِ تسکین کیوں ہے؛ اس کے تین بڑے بڑے اسباب بیان کیے جا سکتے ہیں؛

پہلی وجہ یہ ہے کہ جہاں پچھلے دس سالوں میں ہر چیز کی قیمت کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے اور اجرتیں بھی بہت کچھ بڑھ چکی ہیں وہاں کالجوں کی فیسوں میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ گویا تعلیم ہی ایک ایسی جنس ہے جس کے دام نہیں بڑھے۔ اسکول کے درجے تک تو یہ بات درست ہو سکتی ہے لیکن یونی ورسٹی تعلیم کی یہ ارزانی غالباً کسی دوسرے ملک میں دیکھنے میں نہیں آئے گی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اپنی ثروت کے لیے دنیا میں بے مثال ہے۔ ثانوی درجے تک وہاں نہ صرف ہر شہری کے لیے تعلیم مفت ہے۔ بلکہ ثانوی مدرسے عموماً کتابیں بھی خود فراہم کرتے ہیں اس کے علاوہ طلبہ کو دوپہر کا کھانا بھی لاگت سے کم داموں پر مہیا کیا جاتا ہے۔ لیکن اس تمام دریا دلی کے باوجود امریکی یونی ورسٹیوں کی فیسیں غیر معمولی طور پر بھاری ہیں۔ مثلاً کولمبیا یونیورسٹی میں صرف پڑھائی کی فیس کوئی سو ڈالر ماہوار (۵۰۰ روپے) سے کم نہیں۔ فیس کا زیادہ ہونا ہونہار طلبہ کو یونی ورسٹی تعلیم سے دور نہیں رکھتا۔ کیوں کہ ایسے طلبہ کے لیے بڑی دریا دلی کے ساتھ

وظائف کا بندوبست موجود ہے لیکن فیس کی یہ زیادتی ایسے طلبہ کو یقیناً آنے سے روکتی ہے جو محض دل لگی کے لیے کالجوں کا رخ کر لیتے ہیں۔

پنجاب یونی ورسٹی نے بھی حال ہی میں اورینٹل کالج اور شاید بعض دوسرے کالجوں کی فیس بڑھا دینے اور بعض امتحانوں کی فیس داخلہ بڑھا دینے کا فیصلہ کیا تھا جس پر بہت لے دے کی گئی تھی۔ مگر احتجاج کرنے والوں نے عوام کے سامنے یہ بات کبھی نہیں رکھی کہ تعلیم کے مہنگا ہونے اور اعلیٰ تعلیم کے مہنگا ہونے میں فرق ہے۔ جہاں تعلیمی اور قومی مصالح کی بنا پر یہ ضروری ہے کہ مدرسے کی تعلیم سستی بلکہ مفت ہو وہاں انہی مصالح کا تقاضہ یہ ہے کہ یونی ورسٹی کی تعلیم کافی مہنگی ہو، اسے سستا کر دینا دراصل اس کی صحیح افادیت کو بڑی حد تک ختم کر دینا ہے۔

دوسری وجہ حالیہ سالوں میں آبادی کا بے تحاشا اضافہ ہے، دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا بھر کے ملکوں میں آبادی تیزی سے بڑھی تھی۔ آبادی کا یہ سیلاب اسکولوں اور کالجوں کی تعداد طلبہ میں اب ہر جگہ نمایاں ہے۔ لیکن جہاں مغربی ملکوں میں یہ صورت حال عارضی ہے پاکستان میں اس سیلاب کے تھمنے کی بظاہر کوئی امید نہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہندوستانی سرحد کے پار سے آنے والے مسلمان مہاجروں کا تانتا لگاتار جاری ہے بلکہ ملکی آبادی بھی کافی تیزی سے بڑھ رہی ہے، اگر اضافہ کی یہ رفتار جاری رہی (اور مستقبل قریب میں اس کے گھٹنے کی کوئی امید نہیں) تو کوئی آئندہ تین چار دہائیوں میں ہماری آبادی دوچند ہو جائے گی آبادی بڑھنے کے ساتھ ملکی دولت اور روزگاروں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ لیکن اس اضافہ کی رفتار آبادی کے اضافہ کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ عوام کو نوکری کے سوا کوئی اور پیشہ نظر نہیں آتا جسے وہ معزز پیشہ کہہ سکیں۔ زمینداری گنتی کے لوگوں کا اجارہ ہے۔ تجارتی کاروبار کے لیے آج سے سات آٹھ سال پہلے مواقع کافی تھے، لیکن اب اس میدان میں بھی کافی سرمایہ کے بغیر قدم رکھنا ممکن نہیں

صنعتی ملکوں کی طرح یہاں کوئی ایسے ٹیکنیکل اور فنی پیشے موجود نہیں جو پڑھے لکھے نوجوانوں کو جذب کرلیں، حد یہ ہے کہ آزادی ملنے کے بعد جو نوجوان مغربی ملکوں میں صنعتی اور فنی تربیت حاصل کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے وطن میں واپسی پر ان میں سے بہتوں کو حسب حال کام نہیں ملا۔ چناں چہ بعض غیر ملکی شہریت حاصل کرکے اپنی فنی تربیت کا فائدہ ان غیر ملکوں کو پہنچانے پر مجبور ہوئے۔ غرض زمینداری، بڑے کاروبار اور ملازمت کو چھوڑکر باقی تمام پیشے محنت مزدوری کا درجہ رکھتے ہیں۔ پہلے دو میدان عوامی پہنچ سے باہر ہیں، اس لیے ہر ماں باپ جو اپنے بچوں کو محنت مزدوری کے درجہ سے بلند دیکھنا چاہتا ہے، انہیں کالج میں بھیج دیتا ہے۔ ہر چند کہ کالج کی تعلیم کے بعد نوکری کا ملنا یقینی نہیں، لیکن یہ وہ سمت ہے جس میں امید کی ہلکی سی کرن دکھائی ضرور دیتی ہے۔

ثانوی مدرسوں کی تعداد بڑھ جانے سے اب عموماً دیہاتی علاقوں کے لیے بھی یہ ممکن ہوگیا ہے کہ اپنے بچوں کو میٹرک تک تعلیم دلالیں۔ میٹرک پاس کر لینے کے بعد یہ نوجوان اپنے آپ کو کھیتی باڑی کے کام سے بلند سمجھنے لگ جاتے ہیں، چوں کہ چودہ پندرہ برس کی عمر میں کسی کام کا ملنا محال نظر آتا ہے، اس لیے والدین سمجھتے ہیں کہ کیوں نہ بیٹے کو کالج میں داخل کرادیا جائے۔ ڈگری تک تعلیم حاصل کرلینے سے نوکری ملنی آسانی ہو جائے گی۔ ہر ضلع میں ڈگری کالج موجود ہونے کے سبب اس رجحان کو اور تقویت ملی ہے۔

معیاروں کا انحطاط

یہ شکایت بہت عام ہے کہ تعلیمی معیار پہلے کی نسبت بہت گر گئے ہیں اس میں کہاں تک صداقت ہے؟ جو اساتذہ زمانہ قبل از تقسیم سے کالجوں میں پڑھتے چلے آرہے ہیں ان کی رائے یہی ہے کہ موجودہ طلبہ ان تعلیمی معیاروں کو نہیں پہنچتے جو آزادی کی آمد سے پہلے کے طلبہ عموماً حاصل کرلیتے تھے۔ اس کی ایک وجہ کمرہ جماعت میں بھیڑ ہے، دوسری وجہ ذریعہ تدریس کو بخوبی نہ سمجھنا ہے، ڈگری کورس کے اکثر مضامین بدستور انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں جو

بعض کالج انٹرمیڈی ایٹ کے درجہ پر بھی انگریزی ہی کو ذریعہ تدریس بنائے ہوئے ہیں حالانکہ یہاں میٹرک کی طرح انگریزی کے سوا باقی مضامین میں ذریعہ تدریس اردو ہو سکتی ہے، لیکن کالجوں میں داخل ہونے والے طلبہ اب انگریزی زبان کی وہ استعداد ساتھ لے کر نہیں آتے جو برطانوی عہد کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔

مدرسوں میں انگریزی کو پہلے سے کم توجہ ملنے کی وجہ ظاہر ہے۔ آزادی کی آمد کے ساتھ ہی قدرتی طور پر قومی زبان کی ترقی کا سوال پیدا ہوا، اس مسئلہ پر اصولاً دو آرا نہیں ہو سکتی تھیں۔ خود قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ اردو کی ترقی اور اشاعت کی حوصلہ افزائی فرما چکے تھے۔ اردو متحدہ ہندوستان میں بھی سب ملکی زبانوں سے زیادہ ترقی یافتہ زبان تھی، عثمانیہ یونیورسٹی کے کامیاب تجربے نے ثابت کر دیا تھا کہ یہ زبان سائنس اور ٹکنالوجی کو اپنے اندر سمیٹنے کی بڑی صلاحیت رکھتی ہے چنانچہ قیام پاکستان کے فوراً بعد اردو کو میٹرک کے درجہ تک کلی طور پر ذریعہ تدریس بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مڈل جماعتوں میں شہریت، اسلامیات اور دوسرے ضروری مضامین کے لیے جگہ پیدا کرنے کی خاطر انگریزی کو کم توقیت ملنے لگا۔ اس کی حیثیت محض ایک جدید غیر ملکی زبان کی رہ گئی۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ اب جو طلبہ کالجوں میں آتے ہیں وہ پہلے کی سی انگریزی قابلیت نہیں رکھتے۔ وہ انگریزی میں دیے جانے والے لیکچروں سے بخوبی استفادہ نہیں کر سکتے۔ وہ انگریزی کتابوں کو اپنے طور پر پڑھ کر مطالب اخذ نہیں کر سکتے۔ ان حالات میں یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ ان طلبہ کی بھاری اکثریت اس بات کے سوا اور کسی چیز پہ مطمئن نہیں ہوتی کہ لیکچرار نوٹ لکھا دے۔ یہ نوٹ لفظ بلفظ رٹ لیے جاتے ہیں اور امتحان کے کمرہ میں اگل دیے جاتے ہیں۔ استاد کے لیے کسی ایسے نقطہ پر بحث کرنا بہت مشکل ہے جو براہ راست امتحان کے لیے ضروری نہ ہو۔ اگر کوئی لیکچرار کسی ایسے نکتہ پر کچھ بیان کر دے تو اغلب یہی ہے کہ بہت سے طلبہ اس سے بڑی فکر مندی کے ساتھ پوچھیں کہ جناب کیا یہ سوال امتحان میں

پوچھا جا سکتا ہے، اگر جواب نفی میں ہے تو طلبہ اس موضوع پر بحث کرنے کو وقت ضائع کرنا خیال کریں گے۔

ہمارا نصاب تعلیم یوں تو پہلے دن سے امتحانی ضرورتوں کے تابع رہا ہے۔ لیکن ذریعہ تدریس میں مہارت کی کمی نے اس نصاب کو اب پورے طور پر بلا سوچے سمجھے رٹنے کا ایک ذریعہ بنا دیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ معیاروں کی پستی ہے، جو طلبہ کالج کے دنوں میں خود کسی کتاب سے کچھ اخذ نہ کر سکتے ہوں ان سے یہ امید عبث ہے کہ کالج چھوڑنے پر وہ ایسا کر سکیں گے نتیجہ یہ ہے کہ گو ڈگری حاصل کرنے والوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے لیکن ان کی قابلیت اور اس کے ساتھ ہی ان کی قدر و قیمت تیزی سے گھٹتی جا رہی ہے۔

صحیح علاج

بعض ذمہ دار لوگ پست تعلیمی معیاروں کا یہ علاج تجویز کر رہے ہیں کہ انگریزی کو اس کا پہلا درجہ واپس دے دیا جائے، اس رجعت قہقری کا مطلب یہ ہوگا کہ قومی زبان کو دوبارہ سر اٹھانے کا غالباً کبھی موقع نہیں ملے گا۔ یہاں قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کالجوں کے طلبہ انگریزی زبان میں پہلی سی قابلیت نہیں رکھتے تو یہ کیا ضروری ہے کہ کالجوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہو؟ کیا اردو میں یہ صلاحیت نہیں کہ یہ کام انجام دے سکے؟ تجربہ گواہ ہے کہ جب درجہ پر اور جن مضامین میں بھی اردو کو ذریعہ تدریس بنایا گیا۔ طلبہ کے فہم مضمون میں نمایاں ترقی ہو اس کے جواب میں انگریزی کے حامی فرماتے ہیں کہ صاحب اردو میں لے دے کر ہر مضمون پر دو ایک سے زیادہ کتابیں ملتی ہی نہیں، طلبہ انھیں کو سب کچھ سمجھ کر اور کسی چیز کی جستجو ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے برعکس انگریزی میں ہر مضمون پر درجنوں اچھی کتابیں دستیاب ہیں، اردو کی ایک دو درسی کتابیں ان کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہیں؟ ان دو ایک کتابوں سے وہ گہرا فہم کس طرح پیدا ہو سکتا ہے جو انگریزی کی متعدد کتابوں کے پڑھنے سے پیدا ہوگا؟

اس دلیل میں بڑا وزن ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا طلبہ ان متعدد انگریزی کتابو

نی الواقع پڑھتے ہیں۔ اگر ان کا بڑا سہارا استاد کے لکھائے ہوئے نوٹ ہیں تو کیا یہ بہتر نہیں کہ ان ناقابلِ فہم نوٹوں کو رٹنے کی بجائے اردو کی دو ایک ایسی کتابیں پڑھ لی جائیں جن کو طلبہ خوب سمجھتے ہوں؟ اور پھر اردو میں اگر کتابیں بہت تھوڑی ہیں تو کیا اس کی ذمہ داری خود استادوں پر نہیں؟ کیا مغربی ممالک کے پروفیسروں کی طرح ہمارے پروفیسروں پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ اپنے اپنے مخصوص مضمون پر تازہ ترین افکار کو یک جا کریں اور فکر کی نئی نئی راہیں سوچیں؟ جب تنخواہ اور سماجی حیثیت کے بارے میں مغربی پروفیسروں کا مقام طلب کیا جاتا ہے تو ان کی سی علمی خدمت کا راستہ کیوں اختیار نہیں کیا جاتا؟ سچ یہ ہے کہ انگریزی کو ذریعہ تدریس بنانا کالج کے استادوں کے لیے سہل ہے، اردو ذریعہ تدریس بنانے کے لیے جو محنت ان پر عائد ہوتی ہے اس کے لیے ان کی اکثریت یا تیار نہیں ورنہ اس کی اہلیت نہیں رکھتی، اردو کو ذریعہ تدریس بنانا قومی تعمیر کا ایک ایسا تقاضا ہے جس سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ہمارے کالجوں کے اساتذہ کو ضروری محنت سے جی نہ چرانا چاہیے۔ ٭

وحدتی طریق تدریس

اویس احمد مسلسل ۔۔۔

ورک شاپ کا نام سن کر ذہن میں ایسے بڑے احاطے کا تصور آتا ہے، جہاں مستری، کاریگر اور مزدور مشینوں اور اوزاروں کی مدد سے مشینیں یا ان کے پرزے بنانے اور مرمت کرنے میں لگے ہوں پرانی دنیا میں ورک شاپ کا تصور یہی ہے۔ لیکن نئی دنیا میں ورک شاپ کا مفہوم بہت وسیع تر ہے امریکہ میں ورک شاپ صرف اسی جگہ کو نہیں کہتے جہاں مستری اوزاروں سے کام کر رہے ہوں بلکہ اس جگہ کو بھی جہاں کچھ لوگ باہمی کوشش سے بعض علمی مسائل کے عملی حل ڈھونڈنے میں مصروف ہوں گویا ورک شاپ ہر اس جگہ کو کہا جائے گا، جہاں بہت سے لوگ مل جل کر اس کوشش میں لگے ہوں کہ کچھ عملی ضرورتوں کے قابل عمل جواب وضع کیے جائیں، خواہ یہ جواب مشینوں اور پرزوں کی شکل میں ہوں خواہ طریقہ ہائے کار کی شکل میں، ورک شاپ کا امتیازی خاصہ اس کا غیر رسمی ہونا ہے جس طرح مستری کسی پرزے کو ٹھیک بٹھانے کے لیے اسے ہر پہلو سے دیکھتا اور اسے مناسب شکل دینے کے لیے ہر اس اوزار سے کام لیتا ہے جو ہاتھ لگ سکے، تا آں کہ وہ مقررہ نمونہ کی مشین یا مقررہ ابعاد کا پرزہ تیار کر لیتا ہے، بالکل اسی طرح علمی مسائل کی ورک شاپ میں بھی رسمی طریقوں کو خیر باد کہہ کر ایک مستری کی سی علمی سوجھ بوجھ کے ساتھ ان مسائل کے ایسے قابل عمل حل تلاش کیے جاتے ہیں جو طے کردہ مقاصد کو پورا کر سکیں۔

ورک شاپ کا وسیع تر تصور جو اوپر بیان ہوا ہے منطقی طور پر بڑا معقول ہے۔ مگر ہمارے انداز فکر کو یہ اول اول غیر مانوس معلوم ہوتا ہے، راقم نے جب پہلی بار ایک امریکی یونیورسٹی کے گرمائی نصاب کے سلسلہ میں "تعمیر نصاب کی ورک شاپ" کا نام سنا تو حیرت آمیز تجسس سے یہ دریافت کرنا چاہا کہ اس ورک شاپ کی نوعیت آخر کیا ہے؟ لیکن زبانی تشریح کچھ زیادہ روشن

ال سکی۔ آخر راقم نے کچھ دنوں تک اس ورک شاپ کو کام کرتے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہاں
وڑوں رندوں اور آروں سے کام نہیں لیا جاتا۔ بلکہ غیر رسمی فضا میں مسائل نصاب اور شریک
نے والوں کی دقتوں کے حل ڈھونڈے جا رہے ہیں۔

دیدی نصابوں کی ضرورت

تعلیمی ورک شاپ دراصل ایک تجدیدی نصاب کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہمارے یہاں یہ
یال کافی ہمہ گیر ہے کہ جو استاد ایک دفعہ تربیت حاصل کر لیں انہیں دوبارہ طریقہ ہائے
ریس کے متعلق کچھ اور جاننے کی ضرورت نہیں۔ ٹریننگ کالج یا نارمل اسکول میں سال
ن سال گذار لینا گویا اس بات کی ضمانت بن جاتا ہے کہ اس شخص کے طریق تدریس پر
رف گیری نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی اس بارے میں اسے کسی مزید تربیت کی ضرورت ہے
یال سراسر غلط ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اب یہ اصول پوری طرح تسلیم کیا جا چکا ہے کہ قبل از
زمت تعلیم استاد کو محض اس کے آئندہ پیشہ کے عام اصولوں سے آگاہ کرتی ہے، اس کی
لی تربیت اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ مدرسے کی زندگی میں قدم رکھتا ہے، اور
لیمی اصولوں کی عملی کارروائیوں اور اپنے مخصوص مدرسے کے ماحول اور کمرۂ جماعت کی دشواریو
جائزہ لینے لگتا ہے۔ ٹریننگ کالج میں بتائے گئے اصولوں میں اس کا یقین کتنا ہی مضبوط
وں نہ ہو اس کے دل میں بعض ایسی الجھنیں ضرور پیدا ہوں گی جن کے متعلق وہ دوسروں سے
دلۂ خیال کرنا چاہے گا۔ اگر اس اہم فنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً تجدیدی نصابوں کا
وبست نہیں کیا جاتا تو استاد کی پیشہ ورانہ بالیدگی بڑی حد تک رک جاتی ہے۔

مزید برآں دوسرے علمی میدانوں کی طرح علم التعلیم میں بھی نئی تحقیق تازہ افکار اور
اسلوب ہائے کار کا اضافہ کرتی رہتی ہے، اگر استاد ذاتی مطالعہ کی بنا پر ان نئی پیشہ ورانہ
وں سے باخبر بھی رہیں (ہمارے اساتذہ کے متعلق ایسی خوش فہمی تقریباً محال ہے) تو بھی
امر ضروری ہو جاتا ہے کہ استادوں کی جماعتیں باہم مل بیٹھ کر نئے تعلیمی افکار اور نئے

طریقہ ہائے تدریس کو اپنی مخصوص ضرورتوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ تجدیدی نصاب کے اہتمام کیے بغیر یہ اہم ضرورت کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔

غرض استاد کے کام کی نوعیت پر خواہ کسی زاویے سے نگاہ ڈالی جائے، اس کے لیے یہ ضروری نظر آتا ہے کہ وہ ملازمت میں داخل ہونے کے بعد جامد نہ ہو جائے بلکہ پیشہ ورانہ کمال میں مسلسل بڑھتا رہے۔ لگاتار بالیدگی استاد کے لیے شرط اول ہے۔ جب تعلیم کی اصل روح بالیدگی اور مزید بالیدگی ہے تو خود تعلیم دینے والے پر بالیدگی کے دروازوں کا بند ہونا ستم ظریفی کی انتہا ہوگی، ترقی یافتہ ملکوں میں استاد کی پیشہ ورانہ بالیدگی کو اس کی ترقی کا واحد معیار قرار دیا گیا ہے۔ کوئی استاد محض اس بنا پر ترقی کا حق دار نہیں گردانا جاتا کہ اس نے اتنے سال تک نوکری کی ہے۔ سال ہا سال تک ساکن و جامد کھڑے رہنا ایک درخت کی عمر میں اضافہ کر سکتا ہے، استاد کی قدر و قیمت میں نہیں، اسے آگے بڑھنے کا حق دار بننے کے لیے پیشہ ورانہ بالیدگی کا ثبوت دینا چاہیے، تجدیدی نصاب استادوں کو اس بالیدگی کا بہترین موقع دیتے ہیں۔

مغربی ملکوں میں تقریباً تمام یونی ورسٹیاں گرمائی نصابوں کا اہتمام کرتی ہیں، نصابوں کی بڑی غرض یہ ہوتی ہے کہ جو استاد گرمی کی چھٹیاں تعلیمی قابلیت بڑھانے کے لیے وقف کرنا چاہیں وہ ایسا کر سکیں۔ یونی ورسٹی کے صدر مقام اور دوسرے بڑے شہروں میں یونی ورسٹی کی طرف سے گرمائی نصاب جاری کر دیے جاتے ہیں۔ استاد اور استانیاں بھاری تعداد میں ان میں شرکت کرتے ہیں۔ اس طرح مسلسل کئی سالوں تک گرمائی نصابوں میں شریک ہو کر ایم۔ اے یا دوسری اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر لیتے ہیں، تنخواہ میں اضافہ اور مقام کی ملنساری حاصل کرنے کے لیے ان کے سامنے صرف یہی ایک راہ ہے، ذاتی منفعت اور پیشہ ورانہ بالیدگی کو کچھ پر وابستہ کر دیا گیا ہے کہ استاد خواہ مخواہ تعلیمی قابلیت بڑھانے پر مجبور رہیں، وہ گرمائی نصابوں میں اپنے خرچ پر شریک ہوتے ہیں، بعض اوقات تھوڑی بہت مراعات بھی مل جاتی

ری کی چھٹیوں کو بہ طیب خاطر اپنی تعلیم پر صرف کرتے ہیں۔

ہمارے یہاں بھی کبھی کبھار تجدیدی نصابوں کا اہتمام ہوا کرتا ہے لیکن ان کے متعلق سب سے
شکایت بد دلی کی ہے۔ ان میں شریک ہونے والے کم و بیش مجبوری کی حالت میں نصاب کے
ہ دن پورے کرتے ہیں اور یہ عرصہ ختم ہونے پر اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اور اپنے گھروں میں بھیجے
ں اور پڑھانے والوں دونوں کو کوستے ہوئے واپس لوٹتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہمارے ہاں
ی ملکوں کی سی سرگرمی دکھائی نہیں دیتی؟ وجہ بالکل عیاں ہے۔ ان تجدیدی نصابوں کے ساتھ
کوئی انعام وابستہ نہیں ہوتا۔ استاد خوب جانتے ہیں کہ افسروں کو خوش کرنے اور ترقی پانے کی راہیں
ہیں۔ تجدیدی نصاب میں شرکت کو وقت اور آرام کا ضائع کرنا سمجھا جاتا ہے۔ ہر استاد اس
ی بے گار سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر عملے میں سے وہی آدمی نامزد ہوتا ہے جو صدر معلم پر
ب سے کم دباؤ ڈال سکتا ہو۔

جب نصاب میں شرکت کرنے والوں کی ذہنی کیفیت کا یہ عالم ہو تو اس میں حیران کن بات
ی سی ہے، اگر یہ لوگ مغربی استادوں کی سی سرگرمی سے خالی ہوں؟ اگر آج ہی پیشہ ورانہ
رگی کو ترقی کی اکیلی شرط بنا دیا جائے اور اس بالیدگی کو قسط وار حاصل کرنے کے لیے یونی ورسٹی
محکمہ تعلیم کی طرف سے معقول بندوبست ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے استاد جوق در جوق
ائی نصابوں میں شریک نہ ہوں۔ ذاتی منفعت یہی وہ جادو ہے جو ہر انسانی کوشش میں بے پناہ
ش بھر دیتا ہے۔ ہمارے یہاں اس وقت یہ جادو مدّت ملازمت۔ خوشامد، ذاتی مراسم
اس قسم کی دوسری سستی ترکیبوں میں بھرا ہے۔ ان حالات میں کیا کسی استاد کا سر پھرا ہے
چھٹیاں ضائع کرے۔ گھر سے دور رہے اور شاید کچھ جیب سے بھی خرچ کرے اور یہ سب محض
ں لیے کہ سرکاری حکم کی متابعت ہو۔ اسے ایک تجدیدی نصاب میں شرکت کرنے کے سوا چارہ
یں؟ اگر آج یہ حالات بدل جائیں تو اس کے ساتھ ہی استادوں کا ردعمل بھی بدل جائے۔ استاد
ر انسان ہیں۔ ان کا نفسیاتی ردِ عمل عام انسانوں سے مختلف نہیں ہو سکتا۔

موزوں حالات میں استاد اپنے لیے بالیدگی کی راہیں جس قدر کشادہ کر سکتے ہیں اس کی ایک مثال راقم نے ریاست کنے ٹی کٹ (امریکہ) کے ایک شہر ویسٹ پورٹ میں دیکھی، اس شہر کے استادوں نے ترقی تنخواہ اور ترقی درجات کے لیے خود اصول وضع کر رکھے ہیں، ہر استاد ایک مقررہ گریڈ میں نوکری شروع کرتا ہے، سال گزرنے کے ساتھ اسے سالانہ ترقی تو دی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی پیشہ ورانہ بالیدگی کے اعتبار سے بھی ترقی کی حدود معین ہیں۔ جو استاد ان حدود کو تیزی سے طے کرے وہ سست رو ساتھیوں سے آگے نکل سکتا ہے، صرف اسی پر بس نہیں، استادوں نے اپنے لیے یہ اصول بھی وضع کیا ہے کہ جو استاد مسلسل پانچ سال تک کسی پیشہ ورانہ بالیدگی کا ثبوت نہ دے، وہ نہ صرف ترقی سے محروم رہے گا بلکہ اسے اپنے پہلے مقام سے نیچے بھی آنا ہوگا، یہ وہ سزا ہے جو بااقتدار انتظامی حاکم بھی کافی لیس وپیش کے بعد تجویز کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک ایسے ماحول میں جہاں استادوں کی پیشہ ورانہ بالیدگی کے ساتھ فراخدلانہ انعام وابستہ ہو، اور اس بالیدگی کی کافی سہولتیں موجود ہوں، استاد پیشہ ورانہ جمود کے لیے ایسی سزا بھی تجویز کر سکتے ہیں جو کوئی دوسرا شخص تجویز نہیں کر سکتا۔

گھوڑا گلی ورک شاپ

جو تجدیدی نصاب (ورک شاپ) گھوڑا گلی (مری) میں ۲ جولائی سے ۲۰ جولائی تک جاری رہا، اس کی نوعیت ان تجدیدی نصابوں سے مختلف تھی جو پنجاب میں پہلے ہوتے رہے ہیں پہلا فرق یہ تھا کہ اس کا اہتمام سرکاری طور پر نہیں بلکہ رضاکارانہ طور پر کیا گیا تھا، واشنگٹن سٹیٹ یونی ورسٹی (امریکہ) نے تبادلہ کا جو پروگرام پنجاب یونی ورسٹی کے ساتھ طے کر رکھا ہے اس کے مطابق کئی ایک امریکی پروفیسر پنجاب یونی ورسٹی میں کام کر رہے ہیں، ان میں سے ایک پروفیسر ڈاکٹر او بسی بشوا ایریا نگ سنٹرل ٹریننگ کالج کے ساتھ متعلق ہیں۔ یہ صاحب تعمیر نصاب کے ماہر ہیں۔ گھوڑا گلی کے تجدیدی نصاب کی تحریک ان کی طرف سے ہوئی تھی، ان کی درخواست پر ہی پرنسپل ٹریننگ کالج نے محکمہ سے اس بات کی اجازت حاصل کی کہ ان کے کالج کے کچھ لیکچرا

اس نصاب کے کام کو نافذ میں لیں۔

اس نصاب کی دوسری خصوصیت اس کی اپنی کشش تھی، جولائی کے آغاز میں جب پنجاب کے میدانوں میں بلا کی گرمی پڑ رہی تھی مری میں دو ہفتے گذارنا بذاتِ خود ایک ایسی خوش گوار پیش کش ہے، جسے اکثر نوجوان استاد خوشی سے قبول کریں گے، اس پر مستزاد یہ کہ انہی دنوں مری میں دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا، اس تاریخی اجتماع کی چہل پہل ایک ایسی کشش تھی جس نے سینکڑوں پاکستانیوں کو مری میں جمع کر رکھا تھا، غرض مری میں جمع ہونے والے استاد کسی مجبوری کی بجائے اپنی پسند کی بنا پر وہاں آئے تھے۔

اس کی تیسری خصوصیت اس کا نام تھا، اگرچہ بعض لوگوں کے نزدیک ایک نام کو چنداں اہمیت حاصل نہیں۔ لیکن نام کے نفسیاتی عواطف سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ قیام مری کے سارے عرصے میں ہم اپنے واقف کاروں کو یہ بتانے سے احتراز کرتے رہے کہ ہم ورک شاپ سے متعلق ہیں، مبادا یہ لوگ ہمیں مستری سمجھ کر کوئی ایسی فرمائش کر بیٹھیں جس کا پورا کرنا ہمارے بس سے باہر ہو۔ تاہم اس میں کلام نہیں کہ اس نئے نام نے نصاب کو تھوڑی بہت مخالف ذہنی عناصر و عطا کا تجدیدی نصاب کا پورا نام "نصاب کی پائلٹ ورک شاپ" تھا کیونکہ یہ پنجاب میں اپنی قسم کی غالباً پہلی ورک شاپ تھی۔

وحدتی طریقِ تدریس

گھوڑا گلی ورک شاپ کے انعقاد کی غایت یہ تھی کہ پنجاب کے استادوں کو وحدتی طریقِ تدریس سے روشناس کرایا جائے، اس سے پہلے دو امریکی فل برائٹ پروفیسروں یعنی ڈاکٹر کلفٹ اور ڈاکٹر ڈریسڈن نے قسمت راولپنڈی کے بعض استادوں کو اس طریقِ تدریس سے واقف کیا تھا لیکن سارے پنجاب کے استادوں کے لیے یہ پہلی کوشش تھی، چوں کہ ہمارے استادوں کے لیے ابھی یہ طریقِ تدریس اور اس کا بنیادی فلسفہ نیا ہے اس لیے اس کے متعلق کچھ بیان کر دینا موزوں رہے گا۔

ہمارے مدرسوں میں جو نصاب مدتوں سے چلا آرہا ہے وہ دو بنیادی مفروضوں پر قائم ہے، پہلا یہ کہ طالب علموں کو ایسی جماعتوں میں بانٹا جا سکتا ہے جو ذہنی طور پر ایک سی استعداد رکھتی ہوں۔ ہر جماعت کے لیے سال بھر کے کام کی تعیین کردی جاتی ہے جماعت کا سلیبس کہلاتا ہے۔ اس میں یہ وضاحت کی گئی ہوتی ہے کہ جماعت سال رواں اس قدر انگریزی۔ اس قدر اردو۔ اتنی ریاضی۔ اور اس قدر تاریخ و جغرافیہ اور سائنس ختم کرے گی۔ یہ سلیبس نہ صرف کسی خاص مدرسے کی ایک جماعت کے لیے تجویز کیا گیا ہوتا ہے بلکہ صوبہ بھر کے سارے مدرسوں میں کم و بیش ایک ہی سلیبس مقرر ہوتا ہے۔ مثلاً ساتویں جماعت کا ایک طالب علم خواہ لاہور میں پڑھتا ہو اور خواہ ضلع میانوالی کے کسی دور افتادہ گاؤں میں، دونوں کو بالکل ایک ہی نصاب ختم کرنا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک خاص عمر کے پاکستانی طلبہ بالکل یکساں ذہنی استعداد اور یکساں ذہنی پس منظر رکھتے ہیں، اس لیے انہیں یکساں رفتار کے ساتھ مختلف مضامین کے یکساں حصے ختم کرنے کے قابل ہونا چاہیے۔ جو طالب علم ایسا نہیں کر سکتا یہ اس کی اپنی کوتاہی ہے، اس کو اس کی سزا سے ناکامی کی صورت میں ملنی چاہیے تاکہ وہ ایک اور سال اسی جماعت میں رہ کر نصاب کو پورا کرے۔

ہمارے نصاب کا دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ علم کو الگ الگ مضامین میں اس طرح بانٹا جا سکتا ہے کہ ہر استاد کے ذمے صرف ایک مضمون رہے۔ یا اگر ایک ہی استاد ایک سے زیادہ مضامین پڑھاتا ہو تو وقت کو اس طرح بانٹے کہ ہر مضمون کو الگ الگ توجہ

(باقی)

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

اُستاد کی براءت

میڈی گن نامی ایک برطانوی استاد کے خلاف ایک لڑکے کے والد کی طرف سے اس مطلب کا دعویٰ دائر کیا گیا تھا کہ اس نے کمرۂ جماعت میں اس کے بیٹے پر حملہ کیا جس کے نتیجہ کے طور پر لڑکے کی آنکھ کے نیچے چوٹ آئی۔ ماتحت عدالت نے استاد کو قصوروار ٹھہرا کر اسے ایک پونڈ جرمانہ کیا۔

واقعات یوں ہیں کہ استاد کمرۂ جماعت میں پڑھا رہا تھا، اسے تختہ سیاہ پر کچھ سمجھانے کی ضرورت پیش آئی، کچھ منٹ بعد اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کیوان نامی لڑکا تختہ کی طرف متوجہ نہیں بلکہ فٹ رولر کے ساتھ کھیل رہا اور باتیں کر رہا ہے، استاد نے اسے نام سے پکارا۔ لیکن وہ اتنا بے خبر تھا کہ استاد کی آواز بھی نہ سنی، اس پر استاد نے اس کی طرف وہ جھاڑن دے مارا جس سے وہ بورڈ صاف کر رہا تھا، جھاڑن کی پشت لکڑی کی تھی۔ کیوان استاد سے کوئی چار گز کے فاصلہ پر تھا۔

استاد نے ماتحت عدالت کے فیصلہ کے خلاف اپیل کی، اس موقع پر جرح کا جواب دیتے ہوئے لڑکے نے کہا کہ میں نے استاد کی آواز نہیں سنی، اس نے مجھ پر لکڑی کی پشت والا جھاڑن پھینکا یہ میری دائیں آنکھ کے نیچے لگا اور زمین پر گر گیا، مزید جرح کے جواب میں اس نے کہا میں نے استاد کو جھاڑن پھینکتے نہیں دیکھا لیکن مجھے علم ہے کہ یہ اسی نے پھینکا تھا، میں اس سے پہلے اپنے پیمانے کے ساتھ کھیل رہا تھا، مجھے یہ معلوم نہیں کہ آیا ڈسٹر مجھے لگا یا ڈسٹر پیمانے پر لگا اور پیمانہ مجھے لگا۔ ممکن ہے کہ پیمانے کا کنارہ میری آنکھ پر لگا ہو۔ اگر ڈسٹر اس کے ہاتھ سے گر جاتا تو وہ ایک اتفاقی امر ہوتا لیکن میں کہتا ہوں کہ اس نے ڈسٹر خود پھینکا۔ میں کل مدد سے کے

ضمن میں اپنے دوست نیگٹ کو بھی بتا رہا تھا۔

لڑکے کے دوست نیگٹ نے گواہی دیتے ہوئے اس کے بیان کی تصدیق کی لیکن اس نے بھی تسلیم کیا کہ اس نے استاد کو ڈسٹر پھینکتے ہوئے نہیں دیکھا۔

استاد نے بیان دیتے ہوئے کہا: کیوان توجہ نہیں دے رہا تھا، وہ پیمانے کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ بورڈ سے مڑ کر میں ڈسٹر ہاتھ میں لیے اس کی طرف بڑھا کہ پیمانہ اس کے ہاتھ سے چھینوں، دفعتہً ڈسٹر میرے ہاتھ سے چھوٹ کر پیمانے سے ٹکرایا اور پیمانہ لڑکے کے چہرے پر لگا، میں نے ڈسٹر پھینکا نہیں، بلکہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

استاد کے وکیل نے بحث کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ ڈسٹر پھینکا گیا تھا۔

لارڈ چیف جسٹس نے یہ بحث سن کر کہا: ماتحت عدالت نے ایک پونڈ جرمانہ کی سزا دی ہے۔ اگر اس کی بجائے صرف اڑھائی پنس جرمانہ کیا جاتا تو کیا تمہاری رائے میں درست تھا؟ وکیل نے کہا نہیں، میری رائے میں کچھ جرمانہ نہ ہونا چاہیے تھا۔

بحث کے خاتمہ پر لارڈ چیف جسٹس نے کہا یہ کہنا مشکل ہے کہ ڈسٹر پھینکا گیا تھا، مزید برآں لڑکوں کی باتوں پر بھروسہ کرنا بھی مناسب نہیں، کیوں کہ وہ اکثر اوقات جھوٹ بولتے ہیں۔ ماتحت عدالت کو مناسب نہ تھا کہ استاد کو قصوروار ٹھہراتی، کیوں کہ اس امر کی واضح شہادت موجود نہیں۔ لارڈ چیف جسٹس نے یہ کہتے ہوئے استاد کو بری کر دیا، کہ یہ مقدمہ دائر ہی نہ ہونا چاہیے تھا۔

امریکی اور برطانوی تعلیم

اکسفورڈ یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر سر رچرڈ لونگسٹن نے لندن اسکول آف ہائی جین اور ٹراپیکل میڈیسن میں تقریر کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا کہ کیا امریکہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ملک ہے؟ سر رچرڈ نے کہا انسان کو مجبوراً اس سوال کا جواب

ہاں میں دینا پڑتا ہے، کیوں کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کوئی سترہ سو یونیورسٹیاں ہیں جب کہ انگلستان میں اس کے مقابلے میں صرف اٹھارہ یونیورسٹیاں ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۶۰ء تک پینتالیس لاکھ امریکی یونیورسٹیوں میں تعلیم پا رہے ہوں گے۔

طلبہ کی اس بھیڑ کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ برطانوی یونیورسٹیوں کے مقابلے میں امریکی یونیورسٹیاں اپنی علمی سطح پست تر رکھنے پر مجبور رہیں۔ نیز ان کے نصاب میں موٹر ڈرائیوری سے لے کر لاطینی زبان تک ہر چیز شامل ہے۔

سر رچرڈ نے کہا امریکی تعلیم کے مزاج کا اندازہ ثانوی مدرسوں سے ہو سکتا ہے، کیوں کہ امریکہ میں پرائیویٹ مدرسے بہت تھوڑے ہیں اور وہ بھی مشرق میں ہیں۔ امریکی ہائی اسکول کا تصور کرنے کے لیے برطانوی پرائمری اور ثانوی مدرسے کو یکجا سمجھنا چاہیے۔ اس مدرسے کا تعلیمی معیار برطانوی گرامر اسکول کی بجائے ماڈرن ہائی اسکول کے زیادہ قریب ہے، بچے عمری گروہوں کے مطابق نچلی جماعتوں سے اوپر ترقی پاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ترقی ذہانت کی بنا پر نہیں ملتی۔

امریکی پروفیسروں کی تنخواہوں میں اضافہ

امریکہ کی فورڈ فاؤنڈیشن نے اس سال پانچ کروڑ ڈالر کی رقم اس مطلب کے لیے وقف کی ہے کہ امریکہ کے پرائیویٹ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کام کرنے والے پروفیسروں کی تنخواہیں بڑھائی جائیں۔ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو یہ مالی امداد اس رقم کے تناسب سے ملے گی جو وہ خود اس مطلب کے لیے جمع کریں گے، مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لیے یہ تناسب مختلف مقرر کیا گیا ہے۔ یہ مالی امداد سنہ ۱۹۵۶ء کے آخر تک تقسیم ہوگی۔

اس مالی امداد کی غایت یہ ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے استادوں کے کام کو زیادہ پرکشش بنایا جائے تاکہ وہ علمی روایتوں کو برقرار رکھ سکیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ امریکہ کے اعلیٰ پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں کوئی تین لاکھ استاد پڑھا رہے ہیں جن میں سے ڈیڑھ لاکھ ہمہ وقت ملازم ہیں۔ ان کی تنخواہیں تین ہزار ڈالر سالانہ سے لے کر پندرہ ہزار ڈالر سالانہ تک ہیں

عام طور پر ایک باقاعدہ پروفیسر کی تنخواہ آٹھ ہزار ڈالر سالانہ اور دس ہزار ڈالر سالانہ کے درمیان ہوتی ہے۔

فاؤنڈیشن کے صدر مسٹر ہنری فورڈ نے اس مالی امداد کا اعلان کرتے ہوئے کہا اعلیٰ تعلیم کے سارے مقاصد کا انحصار بالآخر تدریس کی خوبی پر ہے۔ پرائیویٹ کالجوں کی سب سے بدیہی ضرورت استادوں کی تنخواہیں ہیں۔

لندن کے تعلیمی اعداد و شمار

پچھلی جولائی میں ختم ہونے والے تعلیمی سال میں ۴۶۳۱ ۱ اساتذہ لندن تعلیمی کونسل کے تربیتی اداروں میں تربیت پا رہے تھے، ۱۲۸۵۸ بچوں نے تعلیمی سیاحت میں حصہ لیا۔ ان میں سے ۲۳۶۷ یورپ گئے۔ کونسل نے تعلیمی اغراض کے لیے جو بسیں رکھی ہیں انہوں نے ۳۱،۵۰۰ میل طے کیے۔ کونسل کی قائم کردہ پولی ٹیکنیک، نے ۶۱۵ طلبہ کو بی، ایس سی، کی ڈگری دی۔

اسرائیل میں تعداد طلبہ

نام نہاد ریاست اسرائیل تعلیم پر جو توجہ دے رہی ہے اس کا اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہوگا:۔ سال رواں میں سرکاری ابتدائی مدرسوں میں پڑھنے والے بچوں کی تعداد ۱۶۵ ۶۲۱۵ ان میں سے ۴۳۴۹۵۱ بچے عام مدرسوں میں پڑھ رہے ہیں اور باقی سرکاری مذہبی مدرسوں میں۔ پچھلے سال کے لیے کل تعداد طلبہ ۲۰۳۶۹۱ تھی، جن میں سے ۱۵۰۱۱۸ عام مدرسوں میں پڑھتے تھے، اور باقی سرکاری مذہبی مدرسوں میں، ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ سال رواں میں بچوں کی تعداد بقدر ۴۷۴۱۱ کے بڑھی۔ اعداد و شمار سے یہ بھی ظاہر ہے کہ عام مدرسوں اور مذہبی مدرسوں میں پڑھنے والے بچوں کے تناسب میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا ۞

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دوھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ھے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ھے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھہ روپیہ (انگریزی) اور چھہ روپیہ (اردو) ھے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئیے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل
اموزش

۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

[شمارہ ٦] لاہور [...

اس شمارہ میں

مدیر { پروفیسر سراج الدین، پروفیسر ایم - اے - مخدومی

معاونین { عبدالغفور ...، فضل احمد ...

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش (لاہور)

ستمبر ۱۹۵۵ء

جلد ——— ۸

شمارہ ——— ۶

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

اداریہ

نظامِ تعلیم کی صحت مند تعمیر

ایم۔ اے مخدومی

افلاطون اپنی شہرہ آفاق کتاب "جمہوریت" میں لکھتا ہے :- "بچپن وہ زمانہ ہے جب کردار کی تشکیل ہوتی ہے، اس وقت کردار کو جس شکل میں چاہو ڈھال لو۔ تو کیا ہم اپنے بچوں کو اس بات کی اجازت دے دیں کہ وہ ہر طرح کے قصے کہانیوں کے سننے میں مگن رہیں جو لوگوں نے گھڑ رکھی ہیں، اور اس طرح ان کے دل و دماغ پر ایسے تصورات چھا جائیں جو اکثر حالتوں میں ان تصورات کی بالکل ضد ہیں جنھیں ہم بالغ زندگی میں کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں" ؟۔

ان الفاظ میں اس خطرے کا ذکر کیا گیا ہے جس سے ایک آزاد جمہوری معاشرے میں تعلیم کو ہر وقت خبردار رہنا چاہیے۔ اگر بچپن کے اثر پذیر سال ایسے ماحول میں کٹتے ہیں جو غلط قسم کے ذہنی اطوار کی پرورش کرنے والا ہے تو یہ توقع رکھنا خود فریبی ہے کہ بالغ زندگی کی ذمہ داریاں صحت مند نقطۂ نگاہ سے انجام دی جائیں گی، جو قوم یہ چاہتی ہو کہ اجتماعی زندگی کے معاملات پختہ فہم و فراست اور پاکیزہ جمہوری اقدار کے تقاضوں کے مطابق انجام پائیں اسے پہلے اس بات کا بندوبست کرنا چاہیے کہ نئی پود کو پاکیزہ، صحت بخش اور علم نواز ماحول میں تعلیم و تربیت ملے۔ جن بچوں نے ایسے مدرسوں میں تعلیم پائی ہو جہاں غیر تربیت یافتہ، نیم خواندہ یا ناکارہ قسم کے استاد برائے نام

اجرتوں پر کام کر رہے ہوں۔ جہاں طلبہ کی کثرت سے دم گھٹا جاتا ہو اور جہاں معمولی تعلیمی سہولتیں بھی سرے سے غائب ہوں۔ ان سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ کل بڑے ہو کر جمہوری اقدار کو اپنا سکیں گے اور قومی زندگی کی ذمہ داریاں قابلیت کے ساتھ سنبھال سکیں گے۔

پچھلے چند مہینوں سے صوبے کی تعلیمی حالت سرکاری اور عوامی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ حکومت پنجاب تعلیمی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی کے تقرر کا اعلان کر چکی ہے۔ لاہور کارپوریشن نے اپنی ذمہ داریوں کو بہتر طور پر انجام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ لاہور کے بیشتر اخباروں نے موجودہ ناکافی اور غیر تسلی بخش تعلیمی سہولتوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے صورت حال کی فوری اصلاح کا مطالبہ کیا ہے۔ یہ تمام باتیں بڑی خوش آئند ہیں، یہ اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ نئی پود کی موزوں تعلیم و تربیت کی ضرورت اور اہمیت پہلے سے زیادہ محسوس کی جانے لگی ہے۔ آٹھ سال کی آزاد زندگی کے تجربے سے یہ احساس زور پکڑتا دکھائی دیتا ہے کہ نظام تعلیم کی صحت مند تعمیر کے بغیر قومی زندگی کی ہمہ جہتی ترقی ممکن نہیں۔ بعض لوگ کہیں گے کہ کاش یہ احساس آج سے آٹھ برس پہلے پیدا ہوا ہوتا، لیکن اب بھی اگر یہ احساس لفظی بحث اور منصوبہ بندی کی منزل سے آگے بڑھ کر عملی تعمیر کی شکل اختیار کر لے تو بہت غنیمت ہوگا۔

آج ہمارے مدرسے کی سب سے نمایاں کمی یہ ہے کہ اسے مقامی زندگی سے کچھ لگاؤ نہیں اس کا سبب یہ ہے کہ مقامی آبادی کو نہ مدرسے کے معاملات میں کچھ دخل حاصل ہے اور نہ وہ اس کی مالی کفالت کے لیے براہ راست ذمہ دار ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں معاملہ اس کے بالکل الٹ ہے۔ وہاں عموماً نہ صرف مدرسے کا مالی بوجھ براہ راست مقامی لوگوں کے کندھوں پر ہوتا ہے۔ بلکہ مدرسے کی باگ ڈور بھی لوگوں کے اپنے چنے ہوئے نمائندوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، انگلستان اور امریکہ میں تعلیم کی بیشتر ذمہ داری مقامی آبادیوں پر ہے، اس طریق کار نے مدرسے اور معاشرے کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر رکھا ہے، یہ قرب تعلیم کی لچک اور اس کی عملی افادیت کی سب سے بڑی ضمانت ہے، اس کے برعکس مخصوص تاریخی حالات نے ہمارے ملک میں تعلیم کو پہلے دن سے

خالصتہً حکومت کی ذمہ داری بنا رکھا ہے، اس روایت نے مدرسے اور معاشرے کے درمیان ایسا بُعد پیدا کر دیا ہے گویا مدرسہ اور مقامی لوگ ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ ہیں اور انہیں اسی طرح الگ تھلگ رہنا چاہیے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس روایت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے بیشتر تعلیمی ذمہ داری مقامی آبادیوں کی طرف منتقل ہو جانے سے جہاں تعلیمی سہولتوں کی ضروری توسیع میں مدد ملے گی، وہاں اس حد سے بڑھی ہوئی مرکزیت کا ازالہ بھی ہو جائے گا جو عرصہ سے ہمارے نظامِ تعلیمی کا خاصہ چلی آ رہی ہے، لیکن اس کے پہلو بہ پہلو یہ امر بھی بے حد ضروری ہے کہ نجی تعلیمی اداروں پر پہلے سے زیادہ کڑا احتساب قائم کیا جائے۔ پچھلے دنوں مقامی اخباروں میں جو تعلیمی خبریں شائع ہوتی رہی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ صرف لاہور میں لڑکوں اور لڑکیوں کے کوئی ستر ثانوی مدرسے موجود ہیں۔ ان میں سے چند ایک کو چھوڑ کر باقی سب کے سب پرائیویٹ مدرسے ہیں، ان پرائیویٹ مدرسوں میں بہت سے ایسے ہیں جن کی حیثیت ذاتی املاک سے زیادہ نہیں، انہیں کسی تعلیمی مقصد کی بجائے ذاتی منفعت کے پیشِ نظر چلایا جا رہا ہے ثانوی تعلیم کی تیزی سے بڑھتی ہوئی مانگ نے بعض لوگوں کو اس قابل بنا دیا ہے کہ والدین اور طلبہ کو اپنی تجارتی اغراض کا ذریعہ بنائیں، اس قماش کے مدرسے جس ڈھنگ پر چلائے جا رہے ہیں اور ان کی عام فضا اور تعلیمی سہولتیں جس معیار کی ہیں اس پر فہمیدہ طبقہ گہری تشویش کا اظہار کر رہا ہے جو بچے ان نام نہاد مدرسوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں وہ ان اوضاع و اطوار کے مالک نہیں بن سکتے جنہیں ہم قومی کردار کا خاصہ دیکھنے کے آرزومند ہیں۔

نجی تعلیمی ادارے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی موجود ہیں، لیکن وہاں رائے عامہ اس قدر طاقتور ہے کہ اس نے انہیں قریباً قریباً عوامی اداروں میں تبدیل کر رکھا ہے، ایک کم ترقی یافتہ معاشرے میں جہاں رائے عامہ ابھی پوری طرح بیدار اور منظم نہ ہو، یہ امکان بہت اغلب ہے کہ پرائیویٹ مدرسے بنیادی تعلیمی مقاصد کے لیے حقیقی خطرہ بن جائیں۔ ترکی، شام اور بعض دوسرے ملکوں کو اس خطرے پر قابو پانے کے لیے نجی تعلیمی اداروں پر کڑا احتساب قائم کرنا پڑا تھا، پاکستان میں بھی ان

اداروں پر یہ احتساب اس وقت تک قائم رہنا چاہیے جب تک یہ صحیح معنوں میں عوامی ادارے نہ بن جائیں۔

غرض قومی تعمیر کی موجودہ منزل پر تعلیم کی سرکاری رہنمائی دو اہم مسائل سے دوچار ہے ایک طرف اسے پرانی مرکزیت کی گرفت کو ڈھیلا کرنا چاہیے تاکہ مقامی آبادیاں بیش از بیش اپنے تعلیمی مسائل کی ذمہ داری خود سنبھالیں، دوسری طرف اسے نجی تعلیمی اداروں کا پہلے سے زیادہ کڑا محاسبہ کرنا چاہیے۔ تاکہ ان کی عمارتیں، سازوسامان، نصاب اور تعلیمی سہولتیں معیاری درجہ پر آجائیں اور ان کا نظم ونسق زیادہ جمہوری قسم کا بن جائے، ہمیں یقین ہے کہ تعلیمی رہنمائی ان دونوں فرائض سے پوری طرح عہدہ برا ہو گی ؛

مدارسی وحدت اور اس کے امکانات

فضل احمد

جب سے انسان نے دنیا میں قدم رکھا ہے وہ لگاتار اس دھن میں لگا ہے کہ کسی نہ کسی طور اپنی زندگی کو پہلے سے زیادہ اچھا بنا لے۔ قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں ترقی اور پیش قدمی کے دور وہی ہیں جب انہوں نے اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی کوششیں تیز کر دیں۔ اس کے برعکس جمود اور بے حسی کے دور وہ ہیں جب وہ موجودہ زندگی پر قناعت کرکے بیٹھ گئے۔ اپنے پچھلوں سے جو کچھ ورثے میں پایا تھا اسے انسانی کوشش کا معراج سمجھ کر عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ بیٹھے۔ انسان کے لیے اس سے بڑی محرومی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ خدا کی دی ہوئی سب سے بڑی نعمت کو یوں ٹھکرا دے۔ اس کفران نعمت کا نتیجہ ذلت کے سوا کیا نکل سکتا ہے۔ ملاحظہ ہوں قرآنی الفاظ:۔

"اگر تم شکر گذاری کرو گے تو ہم اور زیادہ دیں گے اور اگر کفران نعمت کرو گے تو بے شک میرا عذاب بڑا سخت ہے"

شکر گذاری سے کیا مراد ہے اور کفران نعمت کس چیز کا نام ہے؟ قرآن حکیم نے ان دونوں کے مطالب کی وضاحت میں کوئی شک باقی نہیں رہنے دیا۔ جو لوگ خدائی انعامات کے حقدار بنائے گئے ہیں منجملہ دوسرے اوصاف کے ان میں بڑا وصف یہ ہے کہ:۔

وہ زمین و آسمان کی پیدائش کے متعلق سوچ بچار کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے پروردگار، تو نے یہ سب کچھ بے کار پیدا نہیں کیا۔ تیری ذات پاک ہے پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا"

شکر گذاری کی یہ بہترین تفسیر ہے۔ نظام کائنات پر غور کرنے کے بعد انسان اگر محض حیرت میں ڈوبا رہتا ہے تو یہ سراسر ناکافی ہے۔ یہ کارخانہ بے کار پیدا نہیں کیا گیا۔ غور و فکر کی اصلی منزل یہ ہوتی

چاہیے کہ فطرت کے ان گنت خزانوں اور لامحدود قوتوں کا کھوج لگا کر ان کی افادیت معلوم کی جائے اور ان سے انسانی زندگی کو بہتر بنانے کی خدمت لی جائے۔ یہ کارخانہ قدرت کے خالق کی بہت بڑی شکر گذاری ہے، اس کے عوض میں وہ اور انعامات دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ لیکن اگر انسانوں کی کوئی جماعت شکرگذاری کے اس راستہ سے منہ موڑ کر محرومی کی اس پستی میں پہنچ جائے کہ :-

"ان کے دل ہیں لیکن ان سے سوجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔ ان کے کان ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے، ان کی آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، وہ حیوانوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے، وہ بالکل بے خبر لوگ ہیں"

تو یہ ناشکری کی انتہا ہے، بدنی حواس اور ذہنی قوتیں اس لیے عطا کی گئی تھیں کہ ان سے کام لیا جائے، ان قوتوں سے کام لینا چھوڑ دینا اپنے خالق کی بڑی ناشکری ہے، جو شخص اس کفران نعمت کا مرتکب ہو اس کی سزا ایسی ہو سکتی ہے کہ :-

"اللہ نے اسے باوجود اس کے تمام علم کے گمراہ کر دیا۔ اس کے دل اور کانوں پر مہر لگادی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اللہ کے بعد اسے کون راستہ دکھا سکتا ہے؟"

بے شک یہ بڑا رسوا کن عذاب ہے۔ لیکن یہ عذاب خدا کا مسلط کیا ہوا نہیں، خود اپنے ہاتھوں کا مسلط کیا ہوا ہوگا۔

"یہ وہی کچھ ہے جو تیرے ہاتھوں کا کیا ہوا ہے۔ بے شک اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا"

غرض عقل و فکر وہ پاکیزہ آسمانی جوہر ہے جو انسان کو عطا کیا گیا، یہ جوہر اسے حیوانی سے اونچا کرتا اور بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔ تعلیم وہ آلہ ہے جو انسان نے زندگی کو بہتر بنا-کے لیے وضع کیا ہے۔ پس اگر تعلیم اپنا اصلی مقصد پورا کرنا چاہتی ہے تو اسے سب سے زیادہ ز غور و فکر کی ترقی پر دینا چاہیے، اس کی صورت صرف ایک ہی ہے، وہ یہ کہ نصاب تعلیم میں، صرف

معلومات اور مہارتوں کا سیکھنا ہی شامل نہ ہو، بلکہ مسائل زندگی کا حل کرنا بھی شامل ہو۔ بنیادی معلومات مثلاً طبعی اور مجلسی ماحول کی کیفیت اور بنیادی مہارتیں یعنی کلام، پڑھائی، لکھائی اور گنتی تعلیم کے اہم آلے ہیں۔ انہیں اخذ کرنے کے بعد اگلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ان کی مدد سے زندگی کے مسائل کو حل کرنا سیکھا جائے۔ جو تعلیم اس بات کا اہتمام نہیں کرتی وہ اپنے حقیقی مقصد سے ہٹی رہتی ہے۔

زندگی مسائل سے بھرپور ہے

تدبر اور تفکر بہت اعلیٰ ذہنی سرگرمیاں ہیں۔ مدرسوں کے بچوں سے کوئی شخص یہ توقع نہیں رکھتا کہ وہ گہرے سائنسی، علمی یا مذہبی مسائل پر سوچ بچار کریں گے۔ لیکن یہ ضرور ممکن ہے کہ وہ ادنیٰ سطح پر سوچنا سمجھنا سیکھیں۔ تاکہ بڑے ہو کر زیادہ باریک مسائل کی طرف بھی دھیان دے سکیں جان ڈیوئی کے الفاظ ہیں:۔ "چھوٹے بچے کے سامنے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ اپنے جسمانی اعضا سے کس طور پر کام لے کہ مادی اور مجلسی ماحول کے ساتھ آرام دہ طور پر نباہ ہو سکے۔ بچے کو قریباً قریباً ہر چیز سیکھنا پڑتی ہے، اسے دیکھنا، سننا، ہاتھ پھیلانا، ہاتھ سے چیز پکڑنا، جسم کا توازن قائم رکھنا، رینگنا اور چلنا، غرض سب کچھ سیکھنا پڑتا ہے، ان حرکات کے سوچ سمجھ کر پسند کرنے میں ذہنی فکر کی ضرورت پیش آتی ہے، گو یہ فکر بہت ادنیٰ قسم کا ہے۔"

ڈیوئی نے ماحول کے ساتھ جس نباہ کا ذکر کیا ہے اس کے مسائل عمر بھر باقی رہتے ہیں جونہی یہ مسائل زیادہ پیچیدہ شکل اختیار کرنے لگتے ہیں، ان کے لیے زیادہ گہرے فکر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بچہ جوں جوں بڑا ہوتا ہے اسے زیادہ مشکل مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مدرسے کے ماحول اور نصاب کے ساتھ ہم قدم رہنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تعلیم کے خاتمہ پر روزگار کا مسئلہ ستاتا ہے۔ پھر گھریلو زندگی کی ضرورتیں آن گھیرتی ہیں۔ کاروباری زندگی کے اتار چڑھاؤ، مجلسی اور سیاسی زندگی کے جھگڑے ایسا یہ سب اس کی توجہ چاہتے ہیں۔

دنیا کے بڑے بڑے موجدوں اور مصلحوں نے انسانی زندگی کے معرکتہ الآرا مسائل کے حل ڈھونڈے۔ لیکن عام انسان تفکر کی اس بلندی کو نہیں پہنچتے، وہ نوع انسان کے ان محسنوں کے

معلوم کردہ حقائق اور تصورات کو اپنی عملی زندگی کی بنیاد بناتے ہیں۔ انہیں محض زندگی کے روز مرہ مسائل حل کرنا ہوتا ہے، مثلاً ایک باپ کے سامنے یہ سوال ہے کہ اس مہینے کی بچت سے اپنا سوٹ بنوا لوں یا بیٹے کا؟ کیا اس سال حج کے لیے جانا بہتر ہے یا ابھی چند سال اور انتظار کرنی چاہیے؟ کیا بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی بھیجنا چاہیے یا امریکہ؟ یہ اور اس قسم کے بیسیوں سوالات دیکھنے میں معمولی نظر آتے ہیں لیکن افراد کی زندگیوں پر ان کا گہرا اثر پڑتا ہے، جو لوگ اپنے ان روزمرہ مسائل میں سوجھ بوجھ سے کام نہیں لے سکتے، ان سے یہ امید رکھنا عبث ہے کہ ملکی، علمی یا مذہبی مسائل میں سوچ سمجھ سے کام لے سکیں گے۔ مغربی ملکوں کے مدارس نے بہت عرصہ سے یہ محسوس کرنا شروع کیا ہے کہ بچوں کو ایسی تربیت بھی ملنی چاہیے جو انہیں روزمرہ مسائل کو قابلیت کے ساتھ حل کرنے کا اہل بنا دے۔

غور سے دیکھا جائے تو مسائل حل کرنے میں بڑی ذہنی راحت ہے، ہر مشکل پر کامیابی سے قابو پا لینے کے بعد جو طمانیت پیدا ہوتی ہے وہ بذات خود ایک بڑی چیز ہے۔ ایک عالم نے کیا خوب کہا ہے:۔ "اچھی زندگی صرف وہی زندگی ہے جس میں مسائل موجود ہوں۔ جو زندگی آرزو اور تمنا کے بغیر بسر کی جائے وہ ایک ادھوری زندگی ہے۔"

آگے چل کر یہی عالم کہتا ہے:۔ "چوں کہ اکثر لوگوں کی زندگی میں مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں، اس لیے مدرسے کے بلند ترین مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہونا چاہیے کہ مطالعہ کے پُر تفکر طریق پر زور دے اور اس کا احترام کرے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مستقبل کے مسائل حل کرنے والوں کو نہ صرف سوجھ بوجھ اور نظم کے ساتھ ایک نتیجے پر پہنچنے کا ڈھنگ آ جائے گا، بلکہ انہیں اس طریق کار میں لذت اور راحت بھی محسوس ہونے لگے گی۔ کوئی شخص نو عمر ہو یا پختہ عمر اس کے احترام نفس اور اعتماد نفس کو سب سے زیادہ ترقی دینے والی چیز وہ فخر ہے جو وہ اپنے کسی اہم ذاتی مسئلہ کے کامیاب حل پر محسوس کرتا ہے۔"

جدید تعلیمی فکر اس نکتہ پر زور دیتا ہے کہ مدرسے کو گرد و پیش کی زندگی کے ساتھ گہرے رشتے قائم کرنے چاہئیں۔ چوں کہ یہ زندگی طرح طرح کے مسائل سے بھرپور ہے اور زندگی کی راحت کا مدار

ی مسائل کے تسلی بخش حل پر ہے، اس لیے مدرسے کو چاہیے کہ بچوں کو مسائل کے حل کا ڈھنگ
کھائے۔ اگر وہ ابتدائی زندگی کے اثر پذیر سال بہر سنی سنائی باتوں کو بے چون و چرا ماننے اور الفاظ
ہ زبانی رٹنے کی نذر کر دیں گے تو بالغ زندگی میں ذمہ داری کے ساتھ فیصلہ کرنے کے قابل نہیں
ہ سکیں گے، وہ ایک آزاد جمہوری معاشرے میں شہری ذمے داریوں کو نہیں سنبھال سکیں گے
ن کے لیے دوسروں کی ہاں میں ہاں ملانا آسان ہو گا لیکن وہ معاملہ کے نیک و بد کا جائزہ لے کر
و دبے لاگ رائے قائم کرنے اور اسے ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہوں گے۔

اگر ہم پاکستان میں اسلامی معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں پہلے دن سے پاکستانی
چوں کو حق گوئی اور بے باکی کا سبق دینا چاہیے۔ یہ سبق زبانی باتوں سے نہیں بلکہ مسائل کے
عملی حل ہی سے سکھایا جا سکتا ہے۔ جس بچے نے ہم مکتبوں کی مجلس میں بے جھجک بات
رنا اور استاد سے سوال پوچھنا نہیں سیکھا اس سے یہ امید کیوں کر باندھی جائے کہ وہ اس
رب نوجوان کی سی جرات اور بے باکی پیدا کر سکے گا جس نے بھری محفل میں خلیفہ ثانی رض سے
یہ سوال پوچھا تھا کہ آپ کا لباس کرتہ مال غنیمت کی ایک چادر سے کیسے تیار ہو گیا؟ جس طالب علم نے
دس بارہ سال تک دبک کر بیٹھنا اور استاد کے سوال پوچھنے پر اٹک اٹک کر رٹے ہوئے
الفاظ کو دہرانا سیکھا ہو، وہ ایک آزاد اسلامی معاشرے میں حدود اللہ کی حفاظت کا فرض
کس طرح ادا کر سکتا ہے؟

اگر ہم فی الواقع سچی اسلامی اقدار کے لیے زمین ہموار کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں
کمرۂ جماعت کی فضا میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنا ہو گی۔ ہمیں فرسودہ روائتی طریقہ ہائے تدریس
کی جگہ زیادہ زندگی بخش اور اجازت دہ طریقے تلاش کرنے ہوں گے، یہ اس لیے نہیں کہ کسی
انگلستان یا امریکہ کی پیروی لازمی ہے۔ بلکہ محض اس لیے کہ ہمارے مروجہ طریقے اسلامی
روح سے بہت دور ہیں۔ آج ہم جن ملکوں کی ترقی پر اچٹتی بھری نگاہیں ڈالتے ہیں انہوں نے
بھی اسی سرچشمہ فیض سے فائدہ اٹھایا ہے جس نے دنیا کو یضع عنھم اصرھم ولا

تلاش امتحا کانت علیہم" کا روح پرور پیغام سنایا تھا، ذہنی اور بدنی غلامی کی زنجیروں کو پاش پاش کر دینے والے اس ابدی پیغام سے فائدہ اٹھانے کی سب سے زیادہ ضرورت آج ہمیں ہے۔

بچے کی انفرادیت

پچھلی آدھی صدی میں جن علوم کی پیش قدمی نے تعلیمی فکر اور طریقہ ہائے تدریس کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے ان میں تین اہم ترین علوم یہ ہیں:۔

۱۔ فلسفہ تعلیم (۲) انسانی بالیدگی اور نشوونما جس میں نفسیات بھی شامل ہے۔

۳۔ ترقی پذیر عمرانیات۔

یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ ان ہر سہ علمی میدانوں کے انکشافات نے تعلیمی فکر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ پہلے یہ تقلین کیا جاتا تھا کہ بعض مضامین اور بعض شہرہ آفاق کتابیں پڑھ لینا مخصوص ذہنی اور اخلاقی اطوار کے پیدا کرنے کی ضمانت ہے، اگر کوئی طالب علم یہ کتابیں پڑھ لینے کے باوجود مطلوبہ اطوار سے عاری رہتا ہے تو یہ سراسر اس کا قصور ہے۔ اسے مار پیٹ کر اس بات پر مجبور کیا جانا چاہیے کہ ان آزمودہ تعلیمی نسخوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائے۔ تقریباً ایک ہی عمر کے بچوں سے توقع رکھی جاتی تھی کہ ان کی ذہنی استعداد اور فطری میلان ایک سے ہوں گے۔ اگر کوئی بچہ سبق میں ساتھیوں سے پیچھے رہ جاتا تو یہ بدیہی طور پر اس کا اپنا قصور سمجھا جاتا۔ اگر کوئی کتاب میں دلچسپی لینے کی بجائے کھیل کود یا کھلونوں اور پودوں میں دلچسپی لیتا تو یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت سمجھا جاتا کہ وہ پڑھائی سے جان بوجھ کر جی چراتا ہے اور غیر ضروری باتوں میں وقت صرف کرنا چاہتا ہے، ان تعلیمی مفروضوں کا ایک عملی اثر یہ بھی تھا کہ بہت سے طلبہ کو ایک ساتھ بالکل ایک ہی سبق دیا جاتا، یہ کام اسی طرح سالوں تک چلتا رہتا تا آں کہ طالب علم مقررہ نصاب کو پورا کر لیتا۔

ہمارے یہاں نصاب تعلیم اور طریقہ ہائے تدریس کی اب بھی بالکل یہی حالت ہے

ن مغربی ملکوں میں اس صورت حال کے خلاف پچھلی صدی کی آخری چوتھائی ہی میں رد عمل شروع
یا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب ایک فرانسیسی ڈاکٹر بینے نامی نے بچوں کی ذہانت کا پیمانہ
ع کر لیا تو یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی کہ تمام بچوں کو ایک سی ذہنی غذا کا اہل سمجھنا بہت بڑی
لطی ہے۔ ہر بچہ کچھ مقررہ ذہنی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتا ہے، مادی اور مجلسی ماحول ان صلاحیتوں
بڑھنے پھولنے کے مواقع دیتا ہے کیوں کہ کوئی دو بچے بھی ان دونوں باتوں میں بالکل ایک سے
یں ہوتے، اس لیے یہ امر بہت غیر اغلب ہے کہ ہم عمر بچوں کی ایک جماعت ذہنی استعداد
ور دلچسپیوں کے معاملہ میں بالکل ایک ہی سطح پر ہو، جب یہ نہیں تو جماعت کے سارے طلبہ کسی
بق کو ایک سی توجہ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اگر پڑھانے والا چاہتا ہے کہ کوئی سبق
ب کو اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے تو یہ سبق ہر طالب علم کے سامنے اس طرح پیش ہونا چاہیے
۔اس کی مخصوص استعداد اور دلچسپیوں کے حسب حال بن جائے، یہ طریق کار اس بات کا ضامن
و گا کہ طالب علم سیکھنے کے کام میں سرگرم تعاون کرے۔ اس طرح تدریس کی کیفیت یہ نہیں رہے گی
ہ استاد کچھ مفید علوم سکھانے کی دھن میں ہلکان ہوا جا رہا ہے اور شاگرد اس آفت سے کسی نہ کسی طرح
جان بچانا چاہتا ہے، بلکہ اب اس کی نوعیت یہ ہو گی کہ استاد اور شاگرد دونوں پورے تعاون سے
ایک مشترک مقصد کی تلاش میں کوشاں ہیں۔ اس سے نہ صرف دونوں کا کام پرلطف اور پُر معنی
بن جائے گا بلکہ اس کے نتائج مستقل اور زندگی میں کارآمد ثابت ہوں گے۔

جدید تعلیمی فکر کا یہ استدلال نفسیاتی اور جمہوری نقطہ نگاہ سے ناقابل تردید ہے۔ ہر بچہ
ایک یگانہ شخصیت کا مالک ہے۔ قدرت نے اسے کچھ مخصوص صلاحیتیں عطا کی ہیں اور اس کے
مخصوص ماحول نے اسے ایک خاص ذہنی پس منظر دیا ہے، وہ جو کچھ دیکھے گا اپنے ذہنی پس منظر
کی عینک میں سے دیکھے گا اور وہ جو کچھ کرے گا اپنی مخصوص صلاحیتوں کی بساط کے اندر اندر
کرے گا۔ سزا، خوف یا انعام ان بنیادی حقائق کو نہیں بدل سکتے۔ ان سے آنکھیں بند کرنا اپنے
آپ کو دھوکہ دینا اور بچے کے وقت کو ضائع کرنا ہے۔ تعلیم کو بچے کی انفرادیت کھلم کھلا تسلیم کرنی چاہیے۔

اور اسی کے مطابق تدریسی کام کو ڈھالنا چاہیے۔ تعلیم کی کامیابی، بچے کی شخصیت کی پوری ترقی اور اجتماعی بہبود کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔

ان ناقابلِ تردید تعلیمی اور نفسیاتی حقائق نے ماہرینِ تعلیم کو مجبور کیا کہ تدریس کے روایتی طریقوں کو چھوڑ کر زیادہ معقول طریقے وضع کریں۔ چنانچہ موجودہ صدی کی پہلی چوتھائی میں منصوبی طریقِ تدریس اور ڈالٹن پلان نے جنم لیا۔ یہ دونوں طریق روایتی نصاب، مدرسے کی روایتی تنظیم اور روایتی طریقِ تدریس کا خاتمہ کر کے انفرادی کام اور طلبہ کی ذمہ داری کو پہلا درجہ دیتے ہیں۔ ان طریقوں نے مغربی دنیا میں خوب شہرت پائی۔ ڈالٹن پلان پنجاب کے کچھ کالجوں اور اسکولوں میں بھی کامیابی کے ساتھ آزمایا گیا۔ تاہم فلسفۂ تعلیم، انسانی بالیدگی و ترقی اور ترقی پذیر عمرانیات کے میدانوں میں تحقیقی کام بدستور جاری ہے۔ نئے دریافت شدہ حقائق نے طریقہ ہائے تدریس میں مزید اصلاح کی۔ اب تک تعلیمی عمل ان گوناگوں دریافتوں سے جو اثرات قبول کر چکا ہے ان سب کو کسی خاص طریقۂ تدریس کے نام سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان صحت بخش اثرات میں سے بیشتر کو عموماً وحدتی طریقِ تدریس میں جمع کر دیا گیا ہے۔

وحدتی طریقِ تدریس کیا ہے؟

دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں پرانی لکیروں کی پیروی کم ہوتی ہے۔ وحدتی طریق مواد تدریس کی اس تنظیم کا نام ہے جس کا مرکز زندگی کا کوئی بنیادی تجربہ ہو اور جو طلبہ کی ہر طرح کی معلومات سے ــــ خواہ مدرسے سے تعلق رکھتی ہوں یا باہر ــــ کام لے ــــ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اس طریقے نے کچھ عرصہ سے بہت مقبولیت حاصل کی ہے۔ اوّل اوّل اس کے مفہوم کے متعلق اختلاف رائے رہا، لیکن اب یہ مفہوم عموماً کافی وضاحت حاصل کر چکا ہے۔ ایک ماہرِ تعلیم نے وحدت کی تعریف یوں کی ہے:۔

ایک وحدت مربوط اور بامعنی سرگرمیوں کا ایسا جامع سلسلہ ہے جس کی بدولت نہ صرف طلبہ کے مقاصد حاصل ہوتے ہیں، بلکہ ساتھ ہی معنی خیز تعلیمی تجربے بھی، اس کے علاوہ طور طریقوں میں

زوں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔

وحدتی طریق مقاصد کے لحاظ سے روایتی طریقوں سے اس بات میں مختلف ہے کہ جہاں روایتی طریقے صرف معلومات اور واقفیت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں وہاں وحدتی طریق عادات و اطوار میں موزوں تبدیلی کو اولیت دیتا ہے۔ علم اور واقفیت اچھی چیزیں ہیں، لیکن کردار میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے انہیں آلوں کے طور پر استعمال ہونا چاہیے۔ اصل مقصود کردار و اطوار ہیں معلومات اور مہارتیں نہیں۔ مثلاً ایک شخص تمباکو نوشی کے مضر اثرات کو خوب جانتا ہے، اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ وہ تمباکو پینا چھوڑ دے گا۔ اپنی عادت میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے اسے معلومات سے کچھ قدم اور آگے جانا ہوگا۔

تدریسی مواد کی تنظیم کے معاملہ میں بھی دونوں طریقوں کا فرق بہت نمایاں ہے۔ روایتی طریق میں مواد کی ترتیب استاد کے نقطۂ نگاہ سے تشکیل پذیر ہوتی ہے، وہ اپنے طور پر فیصلہ کرتا ہے کہ فلاں ترتیب طلبہ کے لیے زیادہ حسب حال رہے گی۔ مگر اس کے باوجود یہ منصوبہ بندی کلی طور پر اس کی اپنی ہے، طلبہ کو اس میں کچھ دخل نہیں، وحدتی طریق میں طلبہ منصوبہ بندی میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ استاد اور طلبہ باہمی بات چیت سے یہ طے کرتے ہیں کہ کونسی سرگرمیاں منظم کی جائیں اور کیوں، وحدت کی تنظیم میں ایک اور نمایاں فرق یہ ہے کہ یہ مضامین کی روایتی حد بندی کو مقدس خیال نہیں کرتی۔ ایک وحدت کی تنظیم اور تکمیل میں جن معلومات اور مہارتوں کی ضرورت پڑے گی۔ ان سب کی توجہ دی جائے گی۔ علم کی مصنوعی حد بندیاں استاد یا طلبہ کو اس بات پر آمادہ نہیں کریں گی کہ چونکہ یہ واقفیت یا مہارت فلاں مضمون سے متعلق ہے اس لیے اسے سردست نہ چھیڑا جائے۔ زباندانی، معاشرتی علوم، سائنس، ریاضی اور دوسرے مضامین کو ایک ہی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کی شکل میں دیکھا جائے گا۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ وحدتی طریق سلیبس یا درسی کتاب کو خیر باد کہہ دیتا ہے۔ ان دونوں کا کام یہ ہے کہ سال بھر کے کام کا ایک عام خاکہ اور اس کی ترتیب کی نشان دہی کر دیں۔ بس

اب یہ کام استاد کی سوجھ بوجھ اور تجربہ پر چھوڑ دینا چاہیے کہ تدریسی مواد کو چنے اور اسے ترتیب د
جب تک ایسا نہیں کیا جاتا تدریس اور تعلیم خارجی عمل بن کر رہ جاتے ہیں اور تاثیر سے خالی رہتے
استاد کی جرات عمل اور تخلیقی قوت فنا ہو جاتی ہے اور طلبہ عملی افادیت سے محروم رہتے ہیں۔

امتیازی خصائص

اس عام بیان کے بعد اب وحدتی طریق تدریس کے خصائص کا ذکر ذرا تفصیل سے کیا جار
ہے۔ لیکن یہاں یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ وحدتیں دو قسم کی ہیں۔ تدریسی وحدت اور ماخذی وحدت
تدریسی وحدت کسی خاص مدرسے میں پڑھنے والی طلبہ کی ایک مخصوص جماعت کے لیے ا
خاص موقع پر تیار کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ماخذی وحدت کا تعلق ایک بہت وسیع تر علمی ا
کے ساتھ ہوتا ہے، ماخذی وحدت اس رقبے سے متعلق ہر قسم کے سوالوں، سرگرمیوں، تدری
تکنیکوں اور قدر و قیمت کی پیمائش کے طریقوں کو یکجا کر دیتی ہے۔ یہ تمام باتیں کسی خاص جما
یا مدرسے یا سبق سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ بالکل عام نوعیت کی ہوتی ہیں۔ استاد تدر
وحدت تیار کرنے کے لیے اس ماخذ سے مواد اور رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ غرض ماخذ
وحدت استاد کے لیے ماخذ کا کام دیتی ہے اور تدریسی وحدت وہ عملی منصوبہ ہے جو اس
اور طلبہ نے اپنے مخصوص حالات میں پورا کیا ہو، ذیل میں جن امتیازی خصائص کا ذکر کیا
جائے گا وہ تدریسی وحدت کے خصائص ہیں۔

۱- وحدتی طریق اس حقیقت پر مبنی ہے کہ موثر طور پر سیکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر
چیز کا مجموعی طور پر احاطہ کیا جائے نہ کہ اس کے الگ الگ ٹکڑوں کا علم حاصل کیا جائے۔ تا
نفسیاتی تحقیق نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ہم بیرونی دنیا کا علم بامعنی اکائیوں کی صورت میں حا
کرتے ہیں، چھوٹے چھوٹے اجزا کی شکل میں نہیں، انسان مختلف اشیا، اور طرح طرح کی تہ
کا ادراک چھوٹی چھوٹی قسطوں میں نہیں بلکہ بیک وقت حاصل کرتا ہے۔ انسانی ذہن میں
تجزیہ اور ترکیب کے عمل ایک ساتھ جاری رہتے ہیں یہ نہیں کہ پہلے ذہن اجزاء کو الگ الگ

سمجھ لے پھر انہیں یکجا کر کے کوئی معنی پہنائے مثلاً جب ایک بچہ پہلی بار کتے کو دیکھتا ہے تو اس کا ادراک اس طرح تشکیل پذیر نہیں ہوتا کہ پہلے اس کی ٹانگوں اور پاؤں کو دیکھا جائے پھر جسم کو پھر دم کو۔ پھر آنکھوں۔ کانوں ناک وغیرہ کو۔ پھر اس کے رنگ ڈھنگ اور شکل و شباہت کو۔ بلکہ یہ ادراک جامع مگر مبہم سا ہوگا۔ جوں جوں بچہ اسے بار بار دیکھے گا یہ ادراک زیادہ واضح ہوتا جائے گا لیکن ہر بار یہ ادراک کل کا ہوگا اور الگ الگ اجزا کا نہیں۔ انسانی ذہن کی یہ صلاحیت اسے اس قابل بناتی ہے کہ خارجی دنیا کا بہت جلد ادراک حاصل کر لے اور اس طرح اپنے ماحول پر قابو پا لے۔

یہ نفسیاتی حقیقت تدریس کے لیے بہت معنی خیز ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر بچوں کو غیر متعلق معلومات کے اجزا رٹا دیے جائیں تو اس سے وہ حقیقی طور پر کچھ نہیں سیکھتے۔ چند ہفتوں کی بات ہے کہ حسن ابدال کالج کے داخلہ کا امتحان ہوا۔ شریک ہونیوالے طلبہ سب کے سب فرسٹ یا سیکنڈ ڈویژن میٹرک تھے۔ انگریزی کی قابلیت جانچنے کے لیے انہیں ایک نہایت آسان جواب مضمون لکھنے کو کہا گیا جس کی لمبائی دو سو الفاظ سے زیادہ نہ چاہیے تھی۔ موضوع ایسا چنا گیا تھا جس کے لیے رٹی ہوئی چیزیں کچھ کام نہ دے سکتی تھیں۔ بلکہ سادہ اور درست فقرے لکھنے کی مہارت درکار تھی نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی ۵۰ طلبہ میں سے جنہوں نے ابھی چند ہفتے پہلے فرسٹ اور سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا تھا صرف تین لڑکے ایک تہائی سے زیادہ نمبر لے سکے۔ صفر لینے والوں کی تعداد درجن کے لگ بھگ تھی۔ ایک امیدوار نے دو سو الفاظ کی فہرست بنانے ہی پر اکتفا کی تھی! بے شک جب زبان کا درست طور پر کلی تصور پختہ کرنے کی بجائے بے ربط اور متفرق اجزاء ہی ذہنوں میں ٹھونسے گئے ہوں تو عملی نباندانی اس سے بہتر آ بھی کیسے سکتی ہے؟

وحدتی طریق طلبہ کے سامنے تجربے کی مکمل وحدتوں یا اکائیوں کو پیش کرتا ہے۔ مثلاً تدریس زبان میں وہ الفاظ نہیں بلکہ زبان کی بنیادی ساختیں سکھائے گا جو بول چال اور

لکھنے پڑھنے میں کام دیں۔ جغرافیہ کا مطالعہ شہروں۔ دریاؤں۔ پہاڑوں وغیرہ کی فہرستیں رٹنے سے نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اس کی صورت یہ ہو گی کہ ملک کی جغرافیائی اور معاشی زندگی کے بڑے بڑے پہلوؤں پر اس طرح نگاہ ڈالی جائے کہ ان کے سب گوشے سامنے آجائیں۔ مثلاً پاکستان کا نظام آب پاشی اس کے معاشی۔ سیاسی اور بین الاقوامی پہلو" یا " پاکستان کی درآمدات اور برآمدات ۔ عام صورت حال اور اس کی وجوہ"۔ یہ موضوع زیادہ جامع ہونے کے سبب ثانوی جماعتوں کے لیے موزوں ہیں، چھوٹی جماعتوں میں ان سے زیادہ آسان موضوع لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ جغرافیہ اور تاریخ کا جو مطالعہ اس طرح کیا جائے گا وہ گہرا فہم پیدا کرنے کے ساتھ اطوار میں تبدیلی پیدا کرنے کا سبب بھی ہو گا۔ اس کے الٹ ناموں کی لمبی فہرستیں رٹنے سے نہ حالات واقعات کا فہم پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس سے کردار میں رتی بھر تبدیلی کا امکان ہے۔

۷۔ وحدتی طریق اس بات کا قائل ہے کہ تدریس اسی صورت میں مؤثر ہو سکتی ہے جب طلبہ نہ صرف اس کے مقاصد کو اچھی طرح سمجھ جائیں بلکہ انہیں قبول بھی کر لیں اور ان مقاصد کے حصول کے لیے سرگرمیوں کی منصوبہ بندی میں پوری آزادی اور سرگرمی سے حصہ لیں۔

اس اصول کا ذکر کرتے ہوئے ایک امریکی ماہر تعلیم جو تقریباً سال بھر سے پاکستان میں مقیم ہیں لکھتے ہیں :- ایشیا میں اس تصور کا سکھانا ایک مشکل کام ہے۔

ایشیا وہ براعظم ہے جس نے نوع انسان کو متعدد بار روحانی زندگی عطا کی۔ یہی وہ براعظم ہے جس کے ایک ریگستانی گوشے سے ہدایت کا آخری سرچشمہ ابلا اور اس کی سیرابی سے ذہن انسانی غیر اللہ کی ہر قسم کی غلامیوں کے نقوش سے دھل کر پاک ہو گیا۔ آج بھی ان آزاد اور پاک انسانوں کی اولاد کا بیشتر حصہ اسی براعظم میں بستا ہے۔ لیکن صدیاں گذریں کہ اس قوم کی سب سے قیمتی متاع یعنی فکر و عمل کی آزادی لٹ گئی اور آج اس قوم کو یہ تصور دلانا بھی مشکل ہے کہ دنیا کی دوسری قوموں نے فکر و عمل کی آزادی کو زندگی کی اساس بنایا ہوا ہے اور ان کے مدرسے نئی پود کو جس چیز کی سب سے بڑھ کر تربیت دیتے ہیں وہ فکر و عمل کی آزادی ہے۔

آج دنیا کو ریاست ہائے متحدہ کی بے پناہ معاشی قوت اور دولت پر تعجب ہے۔ یہ درست
ہے کہ اس ملک کو قدرت نے لامحدود قدرتی دولت کے خزانے بخشے ہیں۔ لیکن یہ خزانے اس وقت بھی
موجود تھے جب ہم وحشی سرخ ہندی یہاں نیم فاقہ کشی اور نیم برہنگی کی زندگی گذار رہے تھے۔
دنیا میں آج بھی ایسے ملک موجود ہیں جو قدرتی وسائل کی فراوانی کے معاملہ میں ریاست ہائے متحدہ
سے کچھ کم نہیں۔ لیکن قدرتی وسائل سے کام لینے کے لیے دل و دماغ کی ضرورت ہے اور دل و دماغ
اسی صورت میں بہترین کام کر سکتے ہیں جب وہ غلامی کی بھاری بھرکم بیڑیوں سے آزاد ہوں خواہ
یہ زنجیریں اوہام پرستی اور رسم پرستی کی ہوں۔ خواہ اسلاف پرستی اور شخصیت پرستی کی۔ خواہ سیاسی
غلامی کی اور خواہ اپنے میں سے تحکم پسند اور خود بین سرداروں کی گھڑی ہوئی زنجیریں جو انہوں نے
شخصی اقتدار کو بقا دینے کے لیے تیار کی ہوں۔ مغربی ملک اس معاملہ میں بڑے خوش نصیب ہیں۔
انہوں نے بڑی حد تک ذہنی زنجیروں کو چکنا چور کر دیا۔ مگر ریاستہائے متحدہ امریکہ میں شخصی
آزادی کو جس طرح زندگی کے ہر شعبے کی بنیاد بنایا گیا ہے اس کی مثال کسی دوسرے مغربی ملک
میں بھی شاید ہی ملے۔ بڑے بڑے کارخانے ہوں یا کاروباری ادارے زراعت ہو یا حکومت کا
کوئی شعبہ امریکہ میں ہر ایک کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ حاکمیت اور اختیار اشخاص کو نہیں بلکہ
قانون کو حاصل ہے۔ قانون کو نافذ کرنے والے لوگ حاکم نہیں بلکہ خادم ہیں۔

مدرسہ معاشرے کا ایک کارندہ ہے جو نئی پود کو آئندہ ذمہ داریوں کے قابل بناتا ہے۔ ایک
آزاد جمہوری معاشرے میں شہریوں کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اچھے مقاصد
طے کریں اور انہیں پورے کرنے کے طریقے سوچیں، مدرسے کے ذمہ یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ
بننے والے شہریوں کو مدرسہ کی زندگی ہی میں اس کام کی تربیت دے، وہ ایسی عملی سرگرمیوں کا
اہتمام کرے جن کے مقاصد خود طلبہ کے طے کردہ ہوں اور جن کا اکثر کام خود ان کے ہاتھوں انجام پائے۔

یہاں ایک عام غلط فہمی دور ہو جانی چاہیے۔ کئی استاد اور والدین بھی یہ خیال کرتے ہیں
بچوں کے اپنے مقاصد بیٹے کا دکھیل کھود کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ یہ خیال درست نہیں۔

بچے لغو کھیل کود میں پناہ اس وقت ڈھونڈتے ہیں جب ان پر دوسرے لوگوں کے طے کردہ مقاصد ٹھونسے جائیں۔ اگر کسی سرگرمی کے مقاصد انہوں نے خود طے کیے ہیں اور اسے پورا کرنے کی ذمہ داری آزادانہ اپنے سر لی ہے تو یہ سرگرمی کھیل سے کہیں زیادہ پرکشش بن جائے گی، بچے اور بڑے طلبہ طبعاً گرد و پیش کی ہر چیز کی تہ تک پہونچنا پسند کرتے ہیں، وہ مادی اور مجلسی ماحول کے تمام اجزاء کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ کام ایسے سبقوں کی صورت میں انجام پائے گا جن کے مقاصد کی ان کو کچھ خبر نہیں اور جو سزا یا جرمانے کے خوف سے ان پر ٹھونسے جاتے ہیں تو یہ کام ان کے لیے حد درجہ بوجھل اور کرانا ثابت ہوگا لیکن اگر کسی ذہنی الجھاؤ نے انہیں اس بات پر ابھارا ہے کہ معاملہ کی تہ تک پہونچیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے طریقے بھی انہوں نے خود سوچے ہیں تو پھر اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جو کتابی مطالعہ اور جو ذہنی کام بھی کیا جائے گا وہ بے حد طمانیت بخش ہوگا۔ اس پر مزید یہ کہ اس طرح کام کرنے سے ان کے دل اور دماغ آزادی کی لذت سے آشنا ہوں گے اور کل کو کوئی "متکبر جبار" انہیں اپنی ضمیر کے خلاف کسی کام پر آمادہ نہیں کر سکے گا، وہ فرعون کی قوم کی طرح آنکھیں اور زبانیں بند کیے ہوئے ہر صاحب اقتدار کی پیروی نہیں کریں گے، بلکہ عقل و فکر سے کام لے کر صحیح منزل کی تعیین کر سکیں گے اور جرأت عمل کے طفیل اس منزل کی طرف قدم اٹھا سکیں گے۔

۳- وحدتی طریق کی تیسری خاص خوبی یہ ہے کہ یہ طلبہ کی مختلف استعدادوں اور دلچسپیوں کا پورا پورا لحاظ رکھ کر ہر بچے کی انفرادیت کو چمکنے کا موقع دیتا ہے۔ ہمارے موجودہ نصاب کا یہ مفروضہ بے حد مضحکہ خیز ہے کہ تمام طلبہ کو ایک سی ذہانت اور یکساں دلچسپیوں کا مالک ہونا چاہیے، قدرت کا منشا اس کے بالکل خلاف ہے،، اگر اللہ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک قوم بنا دیتا لیکن ان کے اختلافات کبھی ختم نہ ہوں گے۔ خدا نے انہیں پیدا ہی اس لیے کیا ہے اگر قدرت تمام انسانوں کو بالکل ایک سی استعداد اور یکساں طبعی میلان عطا کر دیتی تو انسانی زندگی کا سارا حسن ختم ہو جاتا اور رنگ برنگے جلووں کی جگہ بے کیف یک رنگی نظر آتی

سانی زندگی کی ساری خوبی اور رعنائی کا مدار انسانی صلاحیتوں اور رجحانوں کے تنوع پر ہے
ہوئی نصاب تعلیم اس بات کا کیا جواز رکھتا ہے کہ وہ سب کو ایک ہی ذہنی سانچے میں ڈھالے
اور جو اس سانچے میں ڈھلنے سے انکار کردیں انہیں "ناکارہ" گردان کر پھینک دے؟

بدقسمتی سے ہمارے نصاب کا یہ بے لچک مطالبہ اپنی پشت پر اتنے لمبے کہنہ پن کی سند
رکھتا ہے کہ بعض لوگوں کو اس کے خلاف کچھ سننا بھی ناگوار ہوگا، لیکن اوپر کے استدلال کی
صحت میں شاید ہی کسی کو کلام ہو۔ ہمیں اپنے نصاب کی مضحکہ خیزی کا شدید احساس اس وقت
ہوتا ہے جب ہم کسی زیادہ معقول نصاب پر عمل ہوتا دیکھیں۔ اپنے قیام امریکہ کے بالکل آغاز میں ہم
واشنگٹن ڈی سی کے مشہور مدرسہ جیفرسن جونیئر اسکول کو دیکھنے گیا۔ صدر معلم غیر ملکی اساتذہ کو
مدرسہ دکھا چکے تو دفتر میں بیٹھ کر مختلف سوالوں کا جواب دینے لگے، ایک نے پوچھا: آپ
عموماً کتنے فی صد طلبہ کو مدرسے کی ایک جماعت سے دوسری جماعت میں ترقی دیتے ہیں؟
جواب ملا سبھی کو۔ اس پر غیر ملکی اساتذہ میں سے بہتوں کو حیرت ہوئی۔ ایک نے پوچھا
کیا آپ اچھے لڑکے چن چن کر داخل کرتے ہیں؟ جواب ملا یہ سرے سے ممکن ہی نہیں ثانوی
تعلیم ہر ایک کے لیے لازمی ہے۔ ہم اس نواح کے تمام اچھے برے بچوں کو داخل کرنے پر مجبور
ہیں۔ یہ سن کر تیسرے نے حیرانی سے پوچھا۔ تو کیا آپ نے کمزور طلبہ کے لیے زاید پڑھائی کا
خاص الخاص انتظام کر رکھا ہے؟ اس کا جواب بھی نفی میں ملا۔

مہمانوں کی حیرت دور کرنے کے لیے صدر معلم نے امریکی نصاب اور طریق کار کی وضاحت کی
انہوں نے کہا ہمارا نصاب اس مفروضے پر قائم ہے کہ ہر بچہ کوئی نہ کوئی قابل قدر جوہر ضرور
رکھتا ہے۔ مدرسے کا کام یہ ہے کہ اس جوہر کو معلوم کرے اور اس کی بالیدگی کے لیے ہر ممکن
سہولت بہم پہونچائے۔ ہم اس بات کو نہ ہی ممکن سمجھتے ہیں اور نہ ہی ضروری کہ لکھائی پڑھائی
اور حساب کتاب میں سب طلبہ ایک سے تاک ہو جائیں۔ ہر بچے کی الگ صلاحیتیں اور الگ
دل چسپیاں ہیں۔ مدرسے میں عام مضامین کے علاوہ طرح طرح کے دوسرے کورس موجود ہیں

یہاں تک کہ کار چلانا اور کھانا پکانا بھی نصاب کے مضامین میں سے ہیں۔ نصاب کی وسعت تقریباً زندگی کی وسعت کے ہم پلّہ ہے۔ ہر طالب علم اپنی استعداد اور دلچسپی کے حسب حال کچھ مضامین چن لیتا ہے۔ سال بھر ان مضامین کے مطالعہ کے بعد وہ خود بخود اس بات کا منتظر بن جاتا ہے کہ اگلے درجے میں ترقی پائے فیل ہونے اور ایک جماعت میں دو سال گزارنے کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ آخر زندگی میں قدم رکھنے کے بعد ہر طالب علم کو علمی پیشہ تھوڑا ہی اختیار کرنا ہے؟ جو طالب اور کچھ نہیں کر سکتا وہ کم از کم قہوہ تیار کرکے میز پر تو رکھ سکتا ہے۔ تاکہ وہ زندگی میں اپنا کام بہتر طور پر انجام دے سکے؟ اور جب وہ مدرسے میں اس کام کو خوبی سے کرنا سیکھ لیتا ہے تو مدرسے کے پاس کیا جواز ہے کہ اسے ناکام قرار دے، اس میں جو استعداد قدرت نے رکھی تھی اس نے اسے ممکن حد تک ترقی دے لی۔ مدرسے یا معاشرے کو کیا حق ہے کہ اس سے زیادہ کا مطالبہ کرے؟

انفرادی صلاحیتوں کی نشوونما کا اصول بظاہر نکمے لڑکوں کی زندگیوں میں جو انقلاب برپا کر سکتا ہے اس کی ایک مثال بھی سن لیجیے۔ ایک امریکی سپرنٹنڈنٹ مدارس تدریسی کام کو دیکھتے دیکھتے ایک جماعت کے کمرے میں جا نکلے، استاد تختۂ تحریر پر ہندسہ کا ایک مسئلہ سمجھا رہا تھا۔ چونکہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کمرے کے پچھلے دروازے سے داخل ہوئے تھے، اس لیے کسی طلبہ کو ان کی موجودگی کا علم نہ ہوا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے دیکھا کہ جہاں اکثر طلبہ تختۂ تحریر پر دیکھ رہے ہیں ایک لڑکا اپنی کاپی پر کچھ کام کرنے میں لگا ہے، وہ کبھی کبھی نگاہ اٹھا کر استاد کی طرف دیکھ لیتا ہے اور پھر فوراً اپنے کام میں مشغول ہو جاتا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب دبے پاؤں اس کے سر پر جا کھڑے ہوئے اور دیکھا کہ لڑکے نے پنسل سے استاد کا ایک اچھا کارٹون تیار کر رکھا ہے اور اب اس کی آخری درستی میں لگا ہے۔ کچھ منٹ تک چپکے سے دیکھنے کے بعد سپرنٹنڈنٹ نے آہستہ سے کہا: "واہ کیا خوب کارٹون ہے۔" طالب علم نے سمجھا کہ کسی ساتھی نے داد دی ہے، اچھل کر بولا "بے شک!" مگر جوں ہی اس کی نگاہ بولنے والے کے چہرے پر پڑی وہ کچھ گھبرا گیا اور

کارٹون کو ڈیسک میں چھپانے لگا۔ سپرنٹنڈنٹ نے ہمت افزا لہجہ میں کہا۔ گھبراؤ نہیں تم جس کام میں لگے تھے وہ ہندسہ کے مسئلہ سے کم اہم نہیں۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب نے استاد کو بلا کر لڑکے کا کارنامہ دکھایا۔ وہ معذرت آمیز لہجہ میں بولے یہ لڑکا پڑھائی میں ذرا جی نہیں لگاتا۔ ریاضی سے اسے خاص نفرت معلوم ہوتی ہے۔ یہ بہت نکما لڑکا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے اس نقطۂ نگاہ کی درستی کرتے ہوئے کہا نہیں یہ نکما لڑکا نہیں، یہ بڑا ہونہار لڑکا ہے، یہ ایک نہایت کارآمد ہنر جانتا ہے اور اس کی مشق خوب جی لگا کر کرتا ہے، اس کام میں اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے۔ چند سالوں بعد یہ لڑکا مشہور امریکی اخبار شکاگو ٹریبیون میں کارٹون سازی کا کام نہایت کامیابی سے کرنے لگا۔

انفرادی جوہروں کی یہ حوصلہ افزائی اور نشوونما اگرچہ بے حد پسندیدہ امر ہے۔ لیکن ہماری ثانوی تعلیم کی نوعیت امریکی ثانوی تعلیم سے بہت مختلف ہے، امریکہ میں ثانوی تعلیم مفت اور جبری ہے۔ پندرہ کروڑ آبادی رکھنے والی قوم کے سب بچوں کو ثانوی مدرسے میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس طرح امریکی ثانوی تعلیم کو استعدادوں اور دلچسپیوں کے جس تنوع سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہے جتنا زندگی کا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ثانوی تعلیم کے نصاب میں بھی ایسی ہی وسعت پیدا کی گئی ہے۔ لیکن ساری قوم کے لیے جبری اور مفت ثانوی تعلیم کا بندوبست کرنا امیر قوموں ہی کے بس کی بات ہے۔ خود امریکہ کو یہ تعلیم مہیا کیے بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ عالمگیر سلطنت کی مالک برطانوی قوم نے دوسری عالمی جنگ کے بعد ثانوی تعلیم کو عام کیا ہے اور اب روس بھی ثانوی تعلیم کو عام کرنے میں معروف ہے۔ ہمارا معاملہ ان ملکوں سے بہت مختلف ہے۔ جو ملک لاہور جیسے تعلیمی مرکز میں کوئی ایک تہائی بچوں کے لیے ابتدائی تعلیم کی سہولتیں نہ رکھتا ہو وہ ابھی ثانوی تعلیم کو عام کرنے کی منزل سے جس قدر دور ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے اکثر ملکوں میں ہماری طرح ثانوی تعلیم ہر کس وناکس کے لیے نہیں بلکہ ابھی تک صرف چیدہ چیدہ بچوں کے لیے ہے۔ جہاں ثانوی تعلیم

اس طرح محدود ہو وہاں لازمی طور پر اس کا نصاب بھی کم وسیع اور زیادہ تر علمی نوعیت کا ہوگا جبر
طالب علم کو جاتے ہوئے کیا سیکھنا ہو اس کے لیے امریکی ثانوی مدرسے کو چار و ناچار گنجائش نکالنا ہوگی
لیکن پاکستانی ثانوی مدرسے میں اس کے لیے گنجائش نہیں ہو سکتی۔

ہر چند کہ ہماری ثانوی تعلیم منتخب طلبہ کے لیے ہے مشکل یہ ہے کہ یہ انتخاب ذہنی صلاح
کی بنا پر نہیں بلکہ مالی استطاعت کی بنا پر ہوتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں سینکڑوں ذہین
ثانوی تعلیم سے محروم رہتے ہیں وہاں سینکڑوں ایسے ثانوی مدرسوں کو آن گھیرتے ہیں جو علم
قسم کی تعلیم کے ساتھ زیادہ مناسبت نہیں رکھتے۔ آزادی کی آمد کے ساتھ تعداد طلبہ میں ج
بے تحاشا اضافہ ہوا ہے، اس نے اس صورت حال کو اور زیادہ شدید بنا دیا ہے۔ آج ہما
ثانوی معلم نہ صرف طلبہ کی بھیڑ سے پریشان ہے۔ بلکہ اس کی پریشانی میں اس بات سے اض
ہو رہا ہے کہ اس بھیڑ کی ایک روز افزوں تعداد مروجہ علمی نصاب سے استفادہ کرنے کی بہت ک
صلاحیت رکھتی ہے۔

اس پریشان کن صورت حال سے عہدہ برا ہونے کے لیے وحدتی طریق تدریس خاص ط
کارآمد ہے۔ ایک تدریسی وحدت کو عملی جامہ پہناتے وقت کئی قسم کی سرگرمیاں منظم کی جائیں گی ا
کچھ علمی نوعیت کی ہوں گی مثلاً کتابوں، رسالوں اور مستند حوالوں سے معلومات جمع کرنا، ان
ترتیب دینا اور موزوں الفاظ میں بیان کرنا وغیرہ۔ مگر ان سرگرمیوں کے پہلو بہ پہلو ایس
سرگرمیاں بھی جاری ہوں گی جو کسی لمبے چوڑے علمی کام کا مطالبہ نہیں کرتیں۔ مثلاً اخبار او
رسالوں سے تصویریں اکٹھی کر کے البم بنانا۔ نقشے خاکے اور چارٹ بنانا بعض لوگوں سے ملا
کر کے ان کے خیالات معلوم کرنا۔ کسی تمثیل کو تیار کرنا اور اسے اسٹیج پر پیش کرنا۔ کسی مجلسی تقر
اہتمام کرنا وغیرہ۔ یہ دوسری سرگرمیاں ایسی ہیں جو پڑھائی میں کمزور طلبہ کو زیادہ پسند آئیں
ان سرگرمیوں میں حصہ لے کر وہ نہ صرف ایک مفید تربیت حاصل کریں گے بلکہ ان کے ا
خودی کو بھی سہارا ملے گا۔ انہیں دفعتہً محسوس ہونے لگے گا کہ وہ بالکل گئے گذرے نہ

جماعت کے تدریسی کام میں ایک قیمتی اضافہ کرنے کے قابل ہیں، یہ احساس ان کی تمام صلاحیتوں میں ایسا ابھار پیدا کرے گا کہ وہ علمی کام میں بھی پہلے سے زیادہ دلچسپی لینے لگیں گے۔

۴۔ وحدتی طریق کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ یہ قدر و قیمت کی جانچ کے لیے ایک قابل اعتماد ذریعہ مہیا کرتا ہے۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ روایتی طریق تدریس میں بھی استاد مسلسل امتحانوں اور آزمائشوں کے ذریعہ طلبہ کی ترقی کو تولتا ناپتا رہتا ہے، یہ درست ہے۔ لیکن یہ تول ماپ کی خوبی کی بجائے اس کی تعداد پر زور دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اقدار اخذ کرنے کی بجائے معلومات کا رٹ لینا زیادہ فائدہ مند بن جاتا ہے، جو طالب علم امتحانی کاپی پر زیادہ معلومات درج کر دے وہ فائق سمجھا جاتا ہے خواہ اس کی نگاہ اور اطوار میں کوئی پسندیدہ تبدیلی پیدا نہ ہوئی ہو۔ مزید برآں امتحانی ماپ تول کی آخری باگ ڈور استاد اور طلبہ کے ہاتھ میں نہیں بلکہ کسی بیرونی محکمہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ لہٰذا طلبہ خود قدر و قیمت کی جانچ کا طریقہ نہیں سیکھ سکتے۔

رسمی امتحان کے خلاف وحدتی تدریس کا ایک لازمی جزو یہ بھی ہے کہ وحدت کی سرگرمیوں کے پورا ہو جانے پر استاد اور طلبہ آزادانہ یہ بحث کریں کہ مختلف سرگرمیوں میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے ان کی بدولت جماعت کے مختلف افراد نے کون کون سی معلومات اور مہارتیں اخذ کی ہیں؛ ان کے فہم اطوار اور نقطۂ نگاہ میں کیا اور کس حد تک تبدیلی بھی آئی ہے؛ طلبہ کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ وحدت کے پسندیدہ اور تعمیری پہلوؤں کا ذکر کریں اور ناقص۔ اصلاح طلب پہلوؤں کا بھی۔ ان سے درخواست کی جاتی ہے کہ ضروری ترمیم و اصلاح کے لیے قابل عمل مشورے پیش کریں تاکہ آئندہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔

غرض وحدت کی قدر و قیمت کی جانچ اکیلا استاد یا کوئی بیرونی شخص نہیں کرتا بلکہ طلبہ خود کرتے ہیں۔ یہ امر بذات خود بڑی تعلیمی قیمت رکھتا ہے۔ تنقید نفس کی صلاحیت اور عادت افراد اور قوموں دونوں کی صحت مند ترقی کے لیے ضروری ہے، یہ عادت اور صلاحیت تربیت کے بغیر بہت شاذ پیدا ہوا کرتی ہے۔ تعلیم کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ نوعمر شہریوں کو یکطرفہ نگاہ

پیدا کرنے سے بچاتے، وحدتی طریق میں جب طلبہ مل کر بیٹھتے ہیں اور ایک دوسرے کی زبانی اپنے کام کی خوبی اور کمی پر تبصرہ سنتے ہیں اور خود دوسروں کے کام پر ایسا تبصرہ کرتے ہیں تو انہیں نہ صرف مجلسی بات چیت کا ڈھنگ آتا ہے بلکہ وہ تعمیری تنقید کرنے اور سننے کے عادی بھی ہو جاتے ہیں۔ تنقید نفس کی یہ استعداد بعد کی زندگی میں بے حد کارآمد ثابت ہونے والی ہوتی ہے۔

تاہم قدر و قیمت کی جانچ میں استاد ایک خاموش تماشائی کا کردار ادا نہیں کرتا وہ باقیوں کے ساتھ بحث و مباحثہ میں برابر کا شریک رہتا ہے، وہ وحدتی سرگرمیوں کے دوران بھی کھلی آنکھوں سے جماعت کے ہر فرد کی کارکردگی کو دیکھ رہا تھا اور اب جماعتی بات چیت میں بھی ہر ایک کے ردِ عمل اور طور طریقوں کو غور سے دیکھتا ہے، وہ اکثر مقامات پر لقمے بھی دیتا ہو وضاحت چاہتا ہے اور بحث کو مناسب حدود کے اندر رکھتا ہے، غرض وحدتی طریق اول سے آخر تک جمہوری اقدار اور سچی جمہوری روح کو ترقی دیتا ہے۔

مختلف منازل

وحدتی طریق پر اس تفصیلی بحث کے بعد اب ان منازل کو دیکھا جائے گا جن میں عموماً ایک تدریسی وحدت کو تقسیم کیا جاتا ہے، ان منازل کا لحاظ رکھنا وحدت کی تاثیر کے لیے ضروری ہے یہ تعداد میں چار ہیں۔

۱۔ منصوبہ بندی :- اس منزل پر اختیار کردہ مسئلہ پر عام بحث ہوتی ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جماعت کا ہر فرد مسئلہ میں ذاتی دلچسپی پیدا کرلے۔ جب دلچسپی پیدا ہو جائے تو پھر ہر ایک سے رائے طلب کی جاتی ہے کہ مسئلہ کے حل کے لیے کیا کرنا چاہیے، ان تجویزوں کی بنا پر ایک منصوبہ تیار کیا جاتا ہے۔

۲۔ تحقیقاتی کام :- یہ تدریسی وحدت کی دوسری منزل ہے، اس منزل پر طلبہ کے مختلف گروہ تعاون اور اشتراک عمل سے مسئلہ کے متعلق متعدد ذرائع سے معلومات اور دوسرا مواد جمع کرتے ہیں، تخلیقی کارروائیوں میں حصہ لیتے ہیں، ان سرگرمیوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسئلہ

م پہلوؤں کے متعلق پورا فہم پیدا ہو جائے اور جمع شدہ معلومات اور مواد کو اس طور پر پیش کیا جا سکے
بہ مسئلہ کا حل ممکن ہو جائے۔

۳۔ نہائی سرگرمی :- وحدت کی دوسری منزل دراصل اس تیسری منزل کے لیے تیاری کا ذریعہ
بنی تھی، یہ وہ مرکزی نقطہ تھا جس کو نگاہ میں رکھ کر مختلف سرگرمیوں کی سمت متعین کی گئی تھی۔ اس
منزل پر مسئلہ کے کئی متبادل حل جانچے جاتے ہیں۔

۴۔ قدر و قیمت کی جانچ :- وحدت کی اس آخری منزل پر پہونچ کر ساری کارکردگی پر نگاہ بازگشت
ڈالی جاتی ہے، یہ کام دو واضح سطحوں پر انجام پاتا ہے۔ ایک طرف طلبہ اپنے طریقہ ہائے کار کی خوبیوں
اور خامیوں کا جائزہ لیتے ہیں، دوسری طرف استاد ہر طالب علم کے انفرادی ردّ عمل کا ایک جامع خاکہ
تیار کرتا ہے، وہ اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ کونسے طلبہ بے ڈھب ہیں اور کون سے خصوصی استعدادوں
کے مالک ہیں، اس واقفیت کی روشنی میں وہ بعض کی خاص دست گیری اور رہ نمائی کا بندوبست کرتا
ہے اور بعض کی خاص حوصلہ افزائی کا۔

ایک مثال

آخر میں یہ موزوں ہوگا کہ تدریسی وحدت کی ایک مثال بھی درج کر دی جائے۔ چند دنوں
سے مشرقی پاکستان میں خوفناک طغیانی کی خبریں تمام اخباروں میں آرہی ہیں، وزیراعظم، قائم مقام
گورنر جنرل۔ وزیر داخلہ اور مرکزی حکومت کے کئی دوسرے ارکان مشرقی پاکستان کے دورہ پر ہیں
مرکزی حکومت نے کئی لاکھ روپیہ سیلاب زدہ لوگوں کی مدد کے لیے منظور کیا ہے۔ تباہی کام کی
خبریں اور تصویریں لگاتار اخباروں اور رسالوں میں آرہی ہیں۔ قدرتی طور پر ہر پاکستانی اس
قومی ابتلا سے متاثر ہے، فرض کیجیے آٹھویں یا نویں جماعت کو تاریخ جغرافیہ پڑھانے والا استاد
جماعت میں اس موضوع کو چھیڑ دیتا ہے۔ تمام طلبہ بڑی سرگرمی سے بات چیت میں حصہ لیتے
ہیں۔ آخر طے یہ پاتا ہے کہ اس مسئلے کا مطالعہ کیا جائے۔ اتفاق رائے سے مطالعہ کے مندرجہ
ذیل مقاصد قرار دیے جاتے ہیں۔

۱- مشرقی پاکستان کی سطح۔ آبادی، مواصلات اور زراعت کا اس طور پر مطالعہ کرنا کہ صوبے کی زندگی میں دریاؤں کی اہمیت واضح ہو جائے۔

۲- بنگال میں اسلام کی آمد اور اشاعت اور اسلامی حکومت کے قیام و زوال کی کہانی کے مختلف اجزاء کو یکجا کرنا۔

۳- حالیہ سیلابوں کی تباہ کاریوں کا حال معلوم کرنا اور صوبے کے مخصوص جغرافیائی اور تاریخی حالات کے پیش نظر ہندوستان کے ساتھ مل کر سیلابوں کی روک تھام کے مجوزہ منصوبے پر رائے قائم

۴- طلبہ میں تحقیقی نگاہ پیدا کرنا۔ اشتراک عمل اور جرأت عمل کے جذبات کی پرورش کرنا۔ تقریری اور تحریری قوت اظہار کو ترقی دینا۔

منصوبہ بندی :۔ ان مقاصد کی روشنی میں اب سوچا جائے گا کہ ضروری مواد فراہم کرنے کا کیا صورت ہو۔ مختلف مشورے پیش ہوتے ہیں اور بالآخر قرار پاتا ہے کہ :۔

(ا) جغرافیہ کی چند ایک مستند کتابوں اور حکومت پاکستان اور حکومت مشرقی پاکستان کے شائع رسالوں اور کتابچوں سے ملک کے جغرافیائی حالات کے متعلق معنی خیز معلومات یکجا کی جائیں۔

(ب) بختیار خلجی کے زمانہ سے لے کر اب تک مشرقی بنگال کی تاریخ کا ایک مختصر خاکہ تیار کیا جائے جس کے تین حصے ہوں (i) قطب الدین ایبک کے زمانہ سے لے کر بکسر کی لڑائی تک (ii) انگریز کے تسلط سے لے کر قیام پاکستان تک (iii) پندرہ اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک۔ اس سارے مطالعہ میں معاشی اور مجلسی زندگی کا پہلو زیادہ نمایاں رکھا جائے۔

(ج) موجودہ اور پچھلے سال کے سیلاب کے متعلق جو تصویریں اخباروں اور رسالوں سے ہاتھ آ سکیں وہ سب جمع کی جائیں۔

(د) مشرقی بنگال میں چھپنے والے اردو اخباروں کے ان تاریخوں کے شمارے حاصل کیے جائیں جن میں سیلاب زوروں پر تھا۔ نیز بنگالی مدرسوں کے استادوں اور طلبہ کو خط لکھ کر ان کے ذاتی تاثرات اور مشاہدات حاصل کیے جائیں۔

(۱۳) مشرقی بنگال کے چند نقشے بڑے پیمانے پر تیار کیے جائیں جن میں دریا اور شہر وضاحت سے دکھائے گئے ہوں۔

منصوبے کی تکمیل :- اس منصوبے کو پورا کرنے کے لیے جماعت کے مختلف طلبہ اپنی اپنی استعداد اور دلچسپیوں کے مطابق چند گروہوں میں بٹ جاتے ہیں، ہر گروہ کام کا ایک حصہ اپنے ذمے لے لیتا ہے، اس طرح یہ کام مندرجہ ذیل تحقیقی اور تخلیقی سرگرمیوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے

(۱) پڑھائی میں تاک اور جغرافیہ میں خاص دلچسپی رکھنے والے طلبہ اپنے ذمہ جغرافیائی معلومات کا فراہم کرنا لیتے ہیں، وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اوقات مدرسہ کے بعد روزانہ ایک گھنٹہ مدرسہ کے کتب خانے میں صرف کیا جائے۔ استاد موزوں کتابوں اور لٹریچر کی نشان دہی کرتا رہتا ہے، جو مواد مدرسے کے کتب خانے سے نہیں مل سکتا اس کی فراہمی کے لیے چند طلبہ لاہور کی پبلک لائبریری میں چند دن صرف کرتے ہیں۔ حکومت پاکستان اور حکومت مشرقی پاکستان کے شائع کردہ کتابچے مدرسے کے کتب خانے میں منگوا لیے جاتے ہیں۔

(۲) بالکل اسی نمونہ پر تاریخ میں زیادہ دلچسپی رکھنے والے طلبہ تاریخی پہلو کے مطالعہ کے لیے ایک گروہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں یہ گروہ آگے تین حصوں میں بٹ جاتا ہے اور ہر گروہ تینوں زمانوں میں سے ایک زمانے کا مطالعہ اپنے ذمہ لیتا ہے۔ یہاں بھی استاد موزوں کتابوں کی نشان دہی کرتا رہتا ہے، تاریخ کے ابتدائی دور کی کچھ مستند کتابیں فارسی میں ہیں۔ ان سے استفادہ کرنے کے لیے معلم فارسی سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اسی طرح برطانوی عہد کی مستند کتابیں انگریزی میں ہیں ان کے ضروری مقامات کو سمجھنے کے لیے استاد سے رجوع کیا جاتا ہے۔

(۳) جماعت کے ایسے طلبہ بھی ہوں گے جن کے ہاں انگریزی یا اردو اخبار روزانہ آتا ہے ان سے درخواست کی جاتی ہے کہ اپنے ہاں سے یا اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں سے اخباروں کے فائل حاصل کریں۔ چند ایک اخباروں کے فائل خود مدرسہ میں ہوں گے۔ طلبہ میں سے چند جو پڑھائی لکھائی میں زیادہ تاک نہیں اپنے آپ کو اس مطلب کے لیے پیش کریں گے کہ ان فائلوں سے

ضروری تصویریں کاٹ کر ایک البم تیار کریں۔ یہ گروہ ان فائلوں کے علاوہ رسالوں وغیرہ میں سے بھی تصویریں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۴) چند طلبہ جو انگریزی اور اردو میں اچھے ہیں خط وکتابت کا کام اپنے ذمہ لے لیتے ہیں وہ پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز کانفرنس سے مشرقی بنگال کے اردو اخباروں اور رسالوں کی فہرست منگواتے ہیں اور ان ایڈیٹروں کو خط لکھ کر سیلاب کے دنوں کے شمارے بذریعہ وی۔پی حاصل کرتے ہیں۔ وہ مشرقی بنگال کی وزارت تعلیم سے گورنمنٹ اسکولوں کی فہرست منگوا کر ان کے معاشرتی علوم کے استادوں اور آٹھویں نویں جماعتوں کے مانیٹروں کو خط لکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے جواب موصول ہو جاتے ہیں۔

(۵) جو طلبہ ڈرائنگ اور دست کاری میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ مشرقی پاکستان کے چند رنگین نقشے تیار کرتے ہیں جن میں سطح، دریاؤں اور ندی نالوں کا جال، مشہور شہر اور آبادی کے بڑے بڑے جماؤ دکھائے گئے ہوں۔ یہ گروہ لکڑی کے ایک بڑے تختے پر مٹی سے مشرقی پاکستان کا ایک ماڈل تیار کرتا ہے۔

یہ پانچوں گروہ چند ہفتوں تک اپنی سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں۔ ہر گروہ روزانہ کچھ عرصہ کے لیے جمع ہو کر اس گروہی کام کو وقت دیتا ہے، ہفتہ میں دو ایک بار ہر گروہ جماعت کو اپنی رفتار کار سے آگاہ کرتا رہتا ہے اور اپنے جمع کردہ مواد سے اپنے ساتھیوں کو بھی باخبر رکھتا ہے۔ اس طرح گو صرف چند طلبہ ہی جغرافیائی معلومات فراہم کرنے پر مامور ہیں ان کی محنت کے نتائج سے ساری جماعت فائدہ اٹھاتی ہے۔ اسی طرح باقی گروہ جماعت کے سامنے باقاعدہ رپورٹ پیش کرتے رہتے ہیں رپورٹیں گروہ کے مختلف افراد باری باری پیش کرتے ہیں: تاکہ ہر ایک کو موقع ملتا رہے، اس طریق کار سے جماعت کے تمام افراد مسئلہ کے تمام پہلوؤں کے متعلق رفتہ رفتہ فہم پیدا کرتے جاتے ہیں اور ہر فرد کو باری باری موقع ملتا ہے کہ وضاحت کے ساتھ واقعات اور نقطہ ہائے نگاہ کو ساتھیوں کے سامنے پیش کرے۔

نہائی سرگرمیاں:- اب وہ آخری منزل آ پہونچی ہے جس کے لیے یہ ساری تیاری ہو رہی تھی

اس منزل کی سرگرمیاں مندرجہ ذیل صورتیں اختیار کرتی ہیں۔

(۱) پہلے دوسرے اور چوتھے گروہ کے نمائندے باہم مل کر اپنی رپورٹوں کو ایک منضبط مضمون کی شکل دیتے ہیں۔ تاریخی اور جغرافیائی پس منظر میں مشرقی پاکستان کی موجودہ معیشت اور سیلاب کی حالیہ تباہ کاریوں کی تفصیل دی جاتی ہے۔ اور آخر میں اس مسلسل طور پر سر پر منڈلانے والے خطرے کو روکنے کے لیے پاکستان اور ہندوستان کے متحدہ اقدام کی ضرورت واضح کی جاتی ہے۔ یہ مضمون اردو اور انگریزی ہر دو زبانوں میں تیار کیا جاتا ہے، طلبہ کی کمیٹیاں ان دونوں مضمونوں کو آخری شکل دے کر مدرسہ کے صدر معلم کی خدمت میں پیش کر دیتی ہیں، ان سے درخواست کی جاتی ہے کہ اگر ان مضامین میں سے کسی کو معیاری خیال کریں تو کسی اخبار یا رسالے میں اشاعت کے لیے بھیج دیں۔ ہر طالب علم اردو اور انگریزی مضمون کی ایک ایک نقل تیار کرتا ہے اور اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے۔ اس غرض سے انگریزی اور اردو پڑھانے والے استادوں کا تعاون بھی حاصل کیا جاتا ہے۔

(۲) ایک شام یوم مشرقی پاکستان منایا جاتا ہے جس میں طلبہ کے والدین۔ مدرسوں کے اساتذہ اور بعض دوسرے علم دوست مہمانوں کو آنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ تاریخ جغرافیہ کے کمرے کی دیواروں پر سیلاب سے متعلق جمع کردہ تصویروں کی نمائش کی جاتی ہے، مشرقی بنگال کے تیار کردہ نقشے بھی نمائش کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ طالب علموں میں سے ایک اس تقریب کی صدارت کرتا ہے، باقی طلبہ میں سے چار یا پانچ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر حاضرین کے سامنے تقریریں کرتے ہیں۔

(۳) آخر میں ایک چھوٹی سی تمثیل پیش کی جاتی ہے، اس میں کچھ طلبہ بنگالی دیہاتیوں کا مخصوص لباس پہنے سیلاب کی تباہ کاری کا ذکر کرتے ہیں۔ حکومت پاکستان کے نمائندے انہیں مدد پہونچانے اور سیلاب کے خطرے کے مستقل دفعیہ کی امید دلاتے دکھائے جاتے ہیں۔

قدر و قیمت کی جانچ :- تقریب کے بخوبی ختم ہو جانے کے اگلے روز استاد اور طلبہ باہم مل کر بیٹھیں گے اور اپنی کارکردگی کی قدر و قیمت کی جانچ مندرجہ ذیل معیاروں سے کریں گے۔

۱۔ پچھلی رات کے مہمانوں نے نمائش کردہ تصویروں۔ نقشوں۔ تمثیل اور تقریروں سے کیا اثر قبول کیا؟

یہ چیزیں مشرقی پاکستان کی معیشت کا ایک واضح تصور پیدا کرنے میں کہاں تک کارگر ثابت ہوئیں۔

۲۔ تقریر کرنے والوں اور تمثیل میں حصہ لینے والوں نے اپنے اپنے حصے کا کام کس قدر خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ کیا ان کے خیالات سلجھے ہوئے طرز بیان قدرتی اور آواز موزوں تھی؟

۳۔ مسئلہ کے متعلق طلبہ کے انفرادی فہم میں کیا اضافہ ہوا ہے؟

۴۔ کیا طلبہ مشرقی پاکستان کے مسائل کو بھی اسی ہمدردی اور دل سوزی سے سمجھنے لگے ہیں جس سے وہ مغربی پاکستان کے معاملات کو دیکھتے ہیں؟

۵۔ وحدت کی تکمیل سے طلبہ کے اسلامی اخوت کے جذبے اور وطنی محبت کے جذبے کو کہاں تک تقویت پہونچی ہے۔

۶۔ مشرقی پاکستان کی تاریخ کے مطالعہ نے انھیں تحریک پاکستان کے سمجھنے میں کیا مدد دی؟

۷۔ مشرقی پاکستان کے جغرافیائی فہم نے انھیں پاکستان کی معاشی حالت کے ذہن نشین کرنے میں کہاں تک مدد دی ہے۔

۸۔ طلبہ کی قوت تقریر میں کس قدر ترقی ہوئی ہے؟

۹۔ طلبہ کی تحریر، ان کے خط، ہجا اور قوت اظہار میں کہاں تک ترقی ہوئی ہے؟

۱۰۔ وحدت کی مختلف سرگرمیوں نے طلبہ کو مل جل کر کام کرنے اور دوسرے لوگوں سے شستہ انداز میں میل جول قائم کرنے کا ڈھنگ کہاں تک سکھایا ہے۔

جیسا پیچھے کہا جا چکا ہے قدر و قیمت کی جانچ کا یہ کام طلبہ کے ہاتھوں انجام پائے گا اور کچھ استاد کے ہاتھوں اس ضمن میں انھیں جو خامیاں باقی نظر آئیں گی ان سے آئندہ بچنے کی تدبیریں سوچی جائیں گی، استاد اس تجزیہ کی روشنی میں جماعت کے مختلف طلبہ کو مختلف قسم کی مدد اور رہنمائی فراہم کرے گا۔

اب اس تدریسی وحدت کا موازنہ ذرا روایتی سبق سے کیجیے، استاد لاکھ دل سوزی اور محنت سے کام کرنے والا ہو، اس کی محنت طلبہ کو معلومات اور مہارتوں سے مالا مال کر دے گی۔ لیکن کوئی پائدار جمہوری قدر شاید ہی عطا کر سکے۔ جمہوریت کی طرح اسلام بھی زبانی باتوں کا نام نہیں ضابطۂ عمل کا نام ہے۔ اگر اخوت، مساوات بے باکی اور آزادانہ اظہار رائے کو تدریس کی بنیاد نہیں بنایا جاتا تو زندگی میں حق گو اور بے باک مومنوں کا

اساتذہ کی سماجی اور مالی حیثیت

محمد عبدالعزیز مسلسل نمبر ۲

اساتذہ اور والدین

ان مختلف واقعات پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال جائے تو شاید معلم کے سماجی وقار کی صحیح تصویر اور اس کے خدوخال نمایاں نہ ہوسکیں۔ لیکن انہی واقعات اور حادثات کا تجزیہ ان بگڑے ہوئے حالات کے پیش نظر کیا جائے جو ہماری معاشری زندگی میں بظاہر ایک لابدی مقام پیدا کر چکے ہیں تو ہمیں یہ محسوس ہوگا کہ حالات نازک ہی نہیں، اندیشہ ناک بھی ہیں۔ معلم کی سماجی حیثیت کے اچھے یا برے ہونے کا سوال تو اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب سماج اس کے وجود یا اس کے کارہائے نمایاں کے اچھے یا برے کا قائل ہو۔ میری نگاہوں میں اس وقت ایک نہیں بیسیوں والدین کی زندہ تصویریں ہیں جو اس وقت تو بڑے خشوع و خضوع سے ملتے ہیں، جب ان کا بچہ زیرِ تعلیم ہوتا ہے اور جب بچہ وہاں سے کسی اور جگہ پہنچ جاتا ہے تو پھر تو پاس سے گذر جاتے ہیں صاحب سلامت بھی نہیں ہوتی۔ یہاں میں صرف دو ایک ہی مثالوں ہی پر اکتفا کروں گا۔

ایک بچہ ایک سال میری جماعت میں پڑھتا رہا۔ لیکن اسے پڑھنے پڑھانے سے کہیں زیادہ جھوٹ بولنے کا شوق تھا، اور اگر اس کے متعلق میں یہ کہوں کہ اس کے قصے دریا بہ دریا، یم بہ یم اور جو بہ جو تھے تو غالباً غلط نہ ہوگا۔ باپ اس سے نالاں۔ ماں اس کی شاکی۔ بھائی بہن اس سے خائف۔ میں اس سے ناراض اور اس کے دوسرے اساتذہ اس سے متنفر۔ شروع میں تو میں نے اس کی نازیبا حرکتوں کی پرواہ بھی نہیں کی۔ اگر وہ کام کرکے نہیں آیا تو بھی اس کی سرزنش نہیں کی۔ لیکن اگر اس نے اپنے ساتھیوں کو تنگ کیا تو اسے اس کی سزا ضرور ملتی تھی، اس کے والد وزارتِ تعلیم میں ایک بڑے عہدے پر مامور تھے، اس لحاظ سے انہیں یہ توقع تھی کہ شاید سارا محکمۂ تعلیم اور بالخصوص وہ مدرسہ جہاں ان کا بچہ زیرِ تعلیم ہے ان کے اشارہ ہائے چشم و ابرو پر چلے گا اور کچھ جنتر منتر پڑھ کر ان کے بیٹے کو راہِ راست پر لائیگا

تیسرے چوتھے وہ خود اسکول میں آجاتے۔ مجھ سے گھنٹوں باتیں کرتے رہتے کہ میں اس نالائق سے تنگ آگیا ہوں۔ آج میں نے اتنا مارا کہ ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ یہ اور اس قسم کے بے شمار واقعات وہ سناتے اور مجھے سننے پڑتے۔ میں نے ان سے کہا بچے کو مار کی نہیں پیار اور اعتماد کی ضرورت ہے براہ کرم گھر میں آپ افسر بن کر نہیں باپ بن کر اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں حصہ لیا کریں، انہوں نے میری بات مان لی، مجھے بھی یہ اطمینان ہوا کہ شاید اس کی اصلاح اسی طرح ہو جائے۔ میں نے بھی اسے تسلی تشفی دی مگر جو ہیرا پھیری اس کی سرشت بن گئی تھی وہ اس سے نجات نہ پا سکا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے جس چیز کو نسخۂ کیمیا اثر سمجھا تھا وہ کیوں کر ناکام ہوا۔ کوئی دو ہفتے بعد ان سے پھر ملاقات ہوئی معلوم ہوا کہ صاحب کو اس کی مذموم حرکتوں پر پھر غصہ آگیا اور اسے پھر طعن و تشنیع کے کچھ کچوکے سہنے پڑے ایک مرتبہ تو وہ اس قدر مایوس تھے کہ کہنے لگے کہ میں تو اسے پان سگریٹ کی دوکان رکھا دوں گا میں نے کہا جناب والا ان حالات میں وہ تجارت میں کامیاب ہونا بھی ممکن نہیں، غرض اسی طرح سال گذر گیا اور اس بچے کی کوئی خاص اصلاح نہ ہو سکی۔ یہ ایک ایسے باپ کی مثال ہے جو بچے کی اصلاح کے لیے اس کے پڑھانے والے کے پاس بھی آتا رہتا تھا اور اس سے بڑی دیر تک اس کی اصلاح کے متعلق گفتگو بھی کیا کرتا تھا، دوسرے سال جب جماعت بندی ہوئی تو وہ طالب علم ایک دوسرے سیکشن میں چلا گیا۔ اور حق یہ ہے کہ میں نے بھی خدا کا شکر ادا کیا۔ کیوں کہ اس کا مرض کونگاہی لاعلاج تھا یا کم از کم اس کی اصلاح کے لیے کسی دوسرے معالج کی ضرورت تھی۔ کوئی ہفتے عشرے بعد میرے ہم کار اس کی شکایت لے کر میرے پاس آئے اور کہا بھائی ایسے بچوں کی تعلیم و تربیت سے تو میں باز آیا۔ میں نے انہیں کچھ اپنے تجربے بتائے کہ شاید اس سے ان کی کچھ رہنمائی ہو جائے۔ بہر صورت دن یوں ہی گذرتے رہے، بچے کے والد ایک مرتبہ نہیں حسب معمول ہفتے میں دو تین مرتبہ اسکول ضرور آتے لیکن انہوں نے مجھ سے ملنے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کی، ایک روز اتفاقاً میری ان کی ملاقات ہو ہی گئی۔ میں نے پوچھا شیخ صاحب مزاج تو اچھے ہیں لیکن شیخ صاحب میری بات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میرے ہم کار سے مصروف گفتگو ہو گئے۔ میں کوئی ایک منٹ کے توقف کے بعد آگے بڑھا۔ میرے

دست نے مجھے روکا۔ مگر میں نہ ٹھہرا۔ اور ایک سخت سا جواب دے کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے بعد آن سے
اکثر آمنا سامنا ہوا۔ لیکن کبھی بات چیت نہیں ہوئی۔

ایک دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہے جس سے میں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔
میں اپنے دوستوں سے بہت کم توقعات رکھتا ہوں اس لیے ان کی کج روی یا بے مہری کا مجھے افسوس
بھی زیادہ ہوتا ہے۔ مگر چوں کہ ہماری زندگی کچھ ایسی مادی ہو گئی ہے کہ ہمارے تعلقات دراصل
ذاتی مفاد کے مطابق بنتے یا بگڑتے رہتے ہیں۔ آج اگر آپ سے مجھے کوئی ذاتی فائدہ ہے تو میں
آپ کا ایسا نیاز مند اور ایسا دوست بن جاؤں گا کہ بظاہر مجھ جیسا جاں نثار ملنا مشکل ہوگا۔ مگر جب
مفاد کی یہ وابستگی آپ کے ساتھ قائم نہیں رہتی تو میری نگاہوں میں آپ سے زیادہ برا کوئی
نہیں ہوتا۔ راستے میں اگر مڈبھیڑ ہو جائے تو میں یقیناً آنکھ بچا کر نکل جانے کی کوشش کروں گا۔

میں یونی ورسٹی کے دل خوش کن ماحول سے نکل کر پہلی مرتبہ اس زندگی میں قدم گذار ہوا تھا
جو اس سے بالکل مختلف تھی۔ جس آنکھ میں بظاہر محبت کی جھلک دکھائی دی، فی الواقع اس میں مکر و فریب
کے نیرو نشتر تھے جس دل میں محبت و یگانگت کی سادگی نظر آئی۔ اس کی اندرونی کھوٹ دشمنی ہو شر خرد
ثابت ہوئی۔ غرض سال دو سال کے تجربے نے بہت کچھ سکھایا اور زمانے کی اس فکری کج روی نے
زندہ رہنے اور زندگی کا واقعاتی تجربہ کرنے کا صحیح شعور پیدا کر دیا۔ ہاں تو میں نے جب پہلی مرتبہ ایک
معلم کی حیثیت سے بچوں کو پڑھانا شروع کیا تو میرے پیش نظر زندگی کا ایک ایسا تصور تھا جو طلبہ کی
حروف شناسی یا درس و تدریس کے محدود تخیل سے بہت بلند اور بہت ماورا تھا۔ لیکن مجھے ایک
مختصر سی مدت ہی میں اپنے ان اعلیٰ و ارفع نظریات کو بالائے طاق رکھ کر زندگی کا ایسا تانا بانا بننا پڑا
جو اس نظری زندگی سے بالکل مختلف تھا۔ اس میں بغض و عناد کے تملق و ریا کی پرچھائیں تو نہ پڑ سکی
مگر محتاط رہنے کا شدید جذبہ ضرور پیدا ہو گیا۔ میں نے بچوں کی تعلیم و تدریس اور ادارے کے انتظامی
امور میں بڑے ذوق و شوق اور انہماک سے حصہ لیا، صبح کو سب سے پہلے آتا اور شام کو سب سے
آخر میں جاتا۔ اس ساری تگ و دو کا مقصد بچوں کی اصلاح، ان کی ذہنی، اخلاقی، جسمانی اور روحانی

قوتوں کو بیدار کرتا تھا، مگر یہ دراصل ایک پندار بے جا تھا، اس میں مجھے وہ کامیابی نہ
جس کا میں آرزومند تھا تعلیم و تدریس کے سلسلے میں طلبہ کے جس گروہ سے میرا شروع میں
وہ ان کی تعلیمی زندگی میں چار سال تک قائم رہا، اس میں ہر قسم کے لڑکے تھے، اچھے۔ برے
شودہ پشت۔ مگر ان میں بعض طلبہ ایسے بھی تھے جن کے دل میں محبت و اخلاص اور جن
احساس کی شدت باقی تھی، ان میں سے ایک لڑکا پہلے سال تو نہیں مگر دوسرے سال آ
بہت قریب ہو گیا۔ اتنا قریب کہ وہ خود میری زندگی میں داخل ہو گیا، اس کی محبت و مروت
اخلاص و ہمدردی کی وجہ سے میں بھی اس کی طرف بڑھنے پر مجبور تھا۔ اس کی ان ذاتی خوبیوں
اس کی طبعی سلامت روی، اس کی ذہانت اس کی علمی معلومات اور اس کا جذبۂ شوق
کی بلندی اور اس کے علوہمت کی نشان دہی ضرور کرتا تھا میں نے اس کی تعلیم و تربیت میں
زیادہ حصہ لیا میں نے اسے بولنے کا شوق دلایا۔ لکھنے کی لگن پیدا کی اور مختلف قسم کی
سنبھالنے کا خوگر بنایا، مجھے یہ خوشی کہ کم سے کم دوچار لڑکے تو ایسے ہیں کہ ان میں ا
موجود ہیں جو انسان کو فی الواقع انسان بناتے ہیں اور ان میں میرے اس عزیز شاگرد
یقیناً سب سے زیادہ نمایاں تھی، اس کے گھر والوں سے مجھے بارہا ملنے کا اتفاق ہوا،
جس سے ملاقات ہوئی عجز و انکسار کا مرقع معلوم ہوتا۔ گفتگو نہایت شستہ لیکن بظاہر بھو
اور نہایت سادے، پہلے تو میں ان کے اس سلوک سے بہت متاثر ہوا۔ اور یہ نتیجہ
کی خوش خلقی اور آدمیت دراصل اس ماحول کی رہین منت ہے، اچھے ماحول میں
باتیں سیکھتا ہے۔ لیکن ایک عجیب بات ہے کہ عقل نے میرے ان تاثرات کو کبھی قد
کیا، جو کچھ دل کہتا ذہن اس سے بغاوت کرتا۔ ہر سال کچھ ایسا ہوتا رہا کہ جماعت،
جو طلبہ میرے حصہ میں آتے ان میں سرفہرست اسی کا نام ہوتا، پھر تو سال بھر اس کے گھر وا
میں میری خاص قدر و قیمت دیکھتی اور سال کے آخر میں اس عزت و توقیر کو گھن لگنے لگتا۔
سال جب پھر ان کے صاحب زادے کا تعلق میرے ہی ساتھ ہوتا تو وہ ایک نئ

یری آؤ بھگت کرتے۔ اسی طرح کئی سال گذر گئے، اس مدت میں نرم وگرم مختلف قسم کی باتیں ہوئیں
اب مرتبہ اس کے ایک بزرگ سے محض اس امر کی وضاحت کے لیے کہ ان کے اس تعلق کی میرے دل میں
یا قدر و قیمت ہے، میں نے صاف صاف کہا کہ میں جو کچھ اس بچے کے لیے کرتا ہوں یا کروں گا وہ
پ کی خاطر نہیں بلکہ اس بچے کے حسن سلوک اور اس کے حسن اخلاق کی وجہ سے، اور جس دن مجھے
یقین ہو گیا کہ اس کے قلب میں اخلاص و نیت کی گرمی نہیں تو میں بھی ان کی اعانت اور ہمدردی
سے دست کش ہو جاؤں گا کہ دنیا کا یہی چلن ہے۔ انہوں نے میری اس تنقید کو نہایت خندہ پیشانی کے
ساتھ سنا، بلکہ میری تائید کی، لیکن دل کی اندرونی کھوٹ وقت اور موقعے کی رسے بڑی نمایاں ہوتی
ہے انہیں ابھی مجھ سے کام لینا تھا، ابھی ان کا بچہ میرے پاس پڑھتا تھا، اس لیے مجھے ناراض
کرنا قرین مصلحت نہ تھا۔

اس کے بعد زندگی کے دن یوں ہی گذر گئے، اس بچے نے میری بڑی خدمت کی، میرے کام کے لیے
ہر وقت ہمہ تن تیار رہتا، اس نے اس سلسلے میں صبح و شام، سردی گرمی، اور وقت بے وقت کی کبھی
پرواہ نہ کی، لیکن اس کی یہ سپردگی اور اس کا یہ جذبۂ شوق گھر والوں کو نہ بھایا، اور بچے کو اشارتاً یہی سمجھایا
گیا کہ انسان کو ہر کام اپنے مفاد کے پیش نظر کرنا چاہیے، کیوں کہ دنیا میں کام یابی کا یہی ایک
نسخۂ کیمیا اثر ہے۔ اس طرح اب اس غریب کی جان پر دوگونہ عذاب تھا۔ اسے اپنے گھر والوں کے
حکم کی تعمیل اور دل داری منظور تھی اور وہ میری پاس داری کا بھی خواہاں تھا، آخر ان حالات میں
وہ کیا کرتا، اس کے ذہن و دماغ میں پراگندگی کے سوا اور کیا چیز پیدا ہو سکتی تھی، چناں چہ اس کے
بعض اقدام سے مجھے شکایتیں بھی پیدا ہوئیں جس پر میں نے اسے نہایت سخت سست بھی کہا
مگر اس نے ہمیشہ یہی جواب دیا "میرا مقصد آپ کو رنجیدہ کرنا نہیں"۔ اور بمصداق مثل کہ دنیا میں
باپ اور استاد سب سے زیادہ کم زور ہوتے ہیں، انہیں اپنے خطاکار بیٹوں اور شاگردوں کو معاف
کرنا پڑتا ہے، میں بھی اسے معاف کر دیتا، مجھے معلوم نہیں کہ اب اس کے قلبی تاثرات کیا ہیں، درس
تدریس کا جو تعلق تھا وہ ختم ہو چکا ہے، اب تو محض ایک ذہنی رابطہ ہے، اگر کوئی قائم رکھنا چاہے تو

قائم رکھ سکتا ہے اور اگر توڑنا چاہے تو اس میں کوئی دشواری نہیں۔ لیکن ابھی تک بفضلہ تعالیٰ کوئی ایسا
پیدا نہیں ہوئی، وہ اب بھی میرے کام اس تن دہی اور محبت سے کرتا ہے، جیسے اس وقت جب
اس کا اور میرا شاگرد اور استاد کا تعلق تھا، مگر اب اس کے والدین سے بہت کم ملاقات ہوتی ہے ان
محبت و مروت اور اخلاص دہ کوہ آسا وعدے یا تو نذر حوادث ہو گئے یا بقول ملک فیروز خاں نوا
"رات ہی رات دیو اور جن کی طرح غائب ہو گئے" خدا کا شکر ہے کہ جب سے میں نے انہیں پہچان
لیا۔ ان کے تجارتی تعلقات کی ماہیت کا جائزہ لیا تو میں نے بھی اپنے رابطہ کو کچھ ان خطوط پر قائم
کہ انہیں اس بات کا احساس رہے کہ میں بھی اپنی عزت نفس کا پاسباں ہوں، ان کی دریوزہ گری کا
قائل نہیں، اس جگہ اگر میں یہ بھی کہنا چاہوں کہ اس خاندان کو اپنی مالی اور سیاسی وجاہت پر بڑا
ناز ہے تو غالباً بے جا نہ ہوگا۔

یہ دونوں مثالیں میں نے اس لیے پیش کی ہیں کہ والدین کے دونوں گروہ از روئے اخلاق
ایک ہی منزل میں ہیں، صرف درجوں کا فرق ہے، ان کا ظاہر الگ الگ ہے لیکن ان کی روح
ایک ہے، دونوں کا مقصد صرف اپنی فلاح و بہبود یا اپنی اولاد کی اصلاح ہے، نہ ان کی نگاہ
میں استاد کا احترام اور نہ اس کا عزت و وقار، یہ تو ایک بازی گری ہے جو بڑھ چڑھ کر کرتب دکھاتی
کامیابی اس کے قدم چومتی ہے، بہرصورت ان مختلف مثالوں سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے
انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ اساتذہ کی سماجی حیثیت مشکوک ہے۔ سماج بحیثیت سماج
فرد بحیثیت رکن معاشرہ اس کی عزت و توقیر کے قائل نہیں، وہ محض اسے اپنا آلہ کار بنا کر اپنا
نکالنا جانتے ہیں، اس سلسلے میں بظاہر دونوں کو ید طولیٰ حاصل ہے اور استاد اپنی خلقی د
اور نرمی کی وجہ سے ہمیشہ ان کا آلہ کار بنا رہتا ہے۔

اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے، آخر معاشرے میں استاد کا احترام کیوں نہ
کیا جاتا، وہ بھی گوشت و پوست کا انسان ہے، چلتا پھرتا کھاتا پیتا اور ہنستا بولتا ہے،
کیا وجہ ہے کہ اسے اس کے سماجی حق سے محروم رکھا جائے، کسی کا سماج میں داعیہ الا

ہونے کا ایک سبب تو اخلاقی اقدار کا پست ہونا ہے، اور اس سلسلے میں سماج ہر بلند و پست کو ایک بار بری طرح جھنجھوڑ دیتا ہے، جو حساس ہوتے ہیں وہ زندگی کی صحیح اقدار کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں اور جن میں قبول اصلاح کی صلاحیت نہیں ہوتی وہ اور دیدہ دلیر بلکہ پست تر ہو جاتے ہیں لیکن یہ ایک اصولی بات ہے کہ جو کام معلم کو تفویض کیا گیا ہے اس کی نوعیت بہت ہی بلند و ارفع ہے، اس قسم کی اخلاقی کمزوریاں انہیں ان کے منصب سے گرا دیتی ہیں یعنی اس کی عمومی اخلاقی سطح معاشرے میں اوروں کی نسبت بلند ہی ہوتی ہے تو پھر آخر اس پیشے میں آنے کی وجہ سے اسے بدترین خلائق کیوں سمجھا جاتا ہے، بظاہر اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے، آج کل ہماری معاشری زندگی کا تمام تر انحصار خوف و ہراس اور بیم و زر کی جھنکار پر ہے، خوش قسمتی یا بدقسمتی سے استاد کو ان دونوں میں سے ایک پر بھی قدرت حاصل نہیں، وہ معاشرے میں کسی کو نقصان نہیں پہونچا سکتا، کسی راہ چلتے کی پگڑی نہیں اچھال سکتا، کسی کے مال پر اپنا دست حرص دراز نہیں کر سکتا، کسی کو ٹھیکے نہیں دلا سکتا، چور بازاری میں کسی کی اعانت نہیں کر سکتا، پھر آخر اسے ننگ معاشرہ نہ سمجھا جائے تو اور کیا۔

معاشرے میں کم وقار ہونے کی دوسری وجہ مالی پستی اور معاشرتی بدحالی ہے، معلم جتنا کام کرتا ہے اور جس نوعیت کا کرتا ہے اسے اس کا پورا پورا معاوضہ نہیں ملتا، اس کا کام معاشرے کی ذہنی اور اخلاقی تربیت ہے، اگر وہ خود زندگی کی ان اقدار سے محروم رہا تو وہ دوسروں کو بلند نگاہ کیوں کر بنا سکتا ہے، چشمہ اتنا ہی اونچا اُٹھتا ہے جتنا اندر سے پانی کا زور ہوتا ہے، استاد بھی از راہ تربیت بچوں کو اپنی ذہنی بلندی سے زیادہ اونچا نہیں لے جا سکتا، اگر اسے آسودگی قلب و دماغ حاصل نہ ہوگی تو وہ بچوں کی اصلاح میں سرگرمی نہیں دکھا سکتا، اسے تو دن رات دال روٹی کے دھندوں سے نجات نہیں مل سکتی وہ بچوں کے اصلاح کی طرف کب توجہ دے گا۔ ہمارے ملک میں اساتذہ کو جو مشاہرہ ملتا ہے وہ اس کی ضروریات کے لیے ناکافی ہوتا ہے، میرے اس اعتراض کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے محکموں میں اتنی تنخواہ پانے والے لوگ بڑی ٹھاٹھ کی زندگی

بسر کرتے ہیں۔ پھر آخر استاد پر کون سا خدا کا عذاب نازل ہوا کہ وہ ہر مجلس میں موقع اور بے موقع اپنی زبوں حالی کا رونا روتا رہتا ہے، میرے پاس اس کا صرف یہی جواب ہے کہ اسے "مردم آزاری" کا فن نہیں آتا اور یہی اس کی سماجی پستی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ مالی حیثیت سے دوسرے ممالک کے اساتذہ بھی مطمئن نہیں ہیں۔ مگر معاشرے میں ان کی جو عزت و توقیر ہوتی ہے اس سے انہیں ایک گونہ سکون ضرور ہے۔

مالی حیثیت

ہمارے ملک میں کہنے کو تو ایک جمہوری نظام قائم ہو چکا ہے، لیکن جمہوری معاشرہ ابھی ایک تصور ہے جو ہمیں ذہنی طور پر سکون و طمانیت بخشتا ہے، مگر اس کی عملی حیثیت ہنوز مشتبہ ہے، یہاں حاکم و محکوم، بلند و پست کا جو نظریہ انگریز کی استعماری چالیں قائم کر گئی ہیں، ہم ان سے اب تک نجات حاصل نہیں کر سکے، ہم ہندو سے زیادہ چھوت چھات کے قائل ہیں، لیکن ہمارے ہاں برہمن اور شودر کا مقام اس کی مالی بلندی یا پستی کے اعتبار سے متعین ہوتا ہے، نسل و نسب کے لحاظ سے نہیں، اس وقت سائنس کی محیر العقول ترقی کی بدولت دنیا بڑی تیزی کے ساتھ مادیت کی طرف بڑھ رہی ہے اور اس خالص مادیت کی وجہ سے آئے دن قوموں اور ملکوں میں تنازعات پیدا ہوتے رہتے ہیں، چنانچہ اس دارو گیر میں آج ایک عام انسان کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ایک ایسا روحانی سکون ہے جو ایک مرتبہ اس مشینی دور سے باہر لے جائے لیکن اس کے باوجود اس دور میں انسانی زندگی کی قدر و قیمت کا مدار زیادہ تر یہی مادی ترقی ہے، یعنی سیم و زر کی چمک دمک سے ایک شخص کی حیثیت بلند و بالا ہو سکتی ہے، اور اگر اس کے پاس دولت کی ریل پیل نہیں تو اسے پست اور رکیک سمجھا جائے گا، یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ نظریہ صحیح ہے یا غلط۔ اچھا ہے یا برا۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ ہم انسان کی حیثیت کو اس پیمانے سے ناپتے ہیں کہ یہی سکہ رائج الوقت ہے۔ (باقی)

وحدتی طریق تدریس

اویس احمد مسلسل نمبر ۲

ثابت شدہ نفسیاتی حقائق اور تحقیقی مطالعوں نے ان دونوں مفروضوں کو کلی طور پر غلط ثابت کر دکھایا ہے، ذہنی استعداد کے اعتبار سے ہم عمر طلبہ میں نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے، ذہانت کو اچھی خاصی صحت کے ساتھ جانچنے کے جو نفسیاتی اوزار وضع ہوئے ہیں ان کے نتائج اگر کوئی مفید تعلیمی حقائق روشن کرتے ہیں تو وہ یہی ہے کہ ایک ہی عمر کے بچوں کی ذہانت میں بہت فرق ہوتا ہے جب تک بچہ مدرسے میں آنے کے قابل ہوتا ہے اس وقت تک وہ ایک خاصہ وسیع ذہنی پس منظر پیدا ہو چکا ہوتا ہے، یہ پس منظر اس مخصوص طبعی اور سماجی ماحول کی پیداوار ہوتا ہے جس میں بچہ پرورش پاتا ہے، چونکہ یہ ماحول کسی دو بچوں کے لیے کلی طور پر ایک سا نہیں ہوتا اس لیے ایک ہی جماعت کے مختلف طلبہ کے ذہنی پس منظر بھی یکسر مختلف ہوتے ہیں گویا ذہانت اور افتاد طبع ہر دو کے اعتبار سے ہر طالب علم کی تعلیمی ضرورتیں اپنی جگہ یگانہ ہوتی ہیں، ان حالات میں سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا اور سب کے لیے ایک ہی طرح کی ذہنی غذا بہم پہنچانا تعلیمی طور پر سراسر غلط ہے۔

اسی طرح یہ فرض کرنا بھی خود فریبی ہے کہ علم کی مختلف شاخوں کے درمیان ناقابل عبور حد بندیاں قائم کرنے سے طالب علم کا کام سہل ہو جاتا ہے۔ علم زندگی کا آئینہ ہے اور پس، زندگی ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے، اس کے کسی ایک حصے کو دوسرے حصوں سے الگ کر کے سمجھا نہیں جا سکتا، مختلف حصوں کو الگ الگ سمجھنے کی جو کوشش کی جائے گی وہ نگاہ میں ٹیڑھا پن اور فہم میں خامی پیدا کیے بغیر نہ رہے گی۔

ان ناقابل تردید تعلیمی اور نفسیاتی حقائق کی روشنی میں ترقی یافتہ ملکوں نے اپنے مدرسوں کے

نصابوں کو از سر نو مرتب کیا ہے اور نئے طریقہ ہائے تدریس وضع کیے ہیں۔ تدریس کے یہ نئے طریقے بچے کی انفرادیت پر زور دیتے ہیں، ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اصلاح تعلیم کی یہ تحریک انیسویں صدی کی آخری چوتھائی ہی میں شروع ہو گئی تھی، اس سمت میں یہ اولیت کا شرف سپرنٹنڈنٹ سرج کو حاصل ہے جس نے ۱۸۸۶ء میں اپنے ماتحت مدرسوں میں اصلاح شدہ نصاب تعلیم رائج کیا۔

اصلاح نصاب کی اس تحریک نے بیسویں صدی میں زیادہ زور پکڑا، پہلی عالمی جنگ کے تعلیمی تجربوں نے اس یقین کو اور تقویت دی کہ ہر فرد بعض یگانہ صلاحیتیں ساتھ لے کر دنیا میں آتا ہے جن کی ترقی کا انحصار سازگار حالات پر ہے تعلیم کی پہلی ذمہ داری یہ ہونی چاہیے کہ طلبہ میں لگن پیدا کرے، شوق اور دلچسپی پیدا ہو جانے کے بعد طلبہ کا دلی تعاون خود بخود حاصل ہو گا، طریقہ ہائے تدریس کے میدان میں ان نظریوں نے منصوبی طریق اور ڈالٹن پلان کی شکل اختیار کی، آج کل امریکہ میں وحدتی طریق تدریس کو بڑی مقبولیت حاصل ہے، اس کی بڑی خوبی اس کی عملی افادیت ہے، جہاں منصوبی طریق رسمی نصاب کا خاتمہ کر دیتا ہے اور ڈالٹن پلان میں رسمی انضباط اوقات کی قید اٹھ جاتی ہے وہاں وحدتی طریق تدریس ان رسمی ظواہر کو قائم رکھتے ہوئے تدریس کو عملی تجربہ کا رنگ دے سکتا ہے۔

جہاں روایتی نصاب اور پرانے طریقہ ہائے تدریس محض واقفیت اور واقعات ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں وہاں وحدتی طریق کا بنیادی یقین یہ ہے کہ تعلیم صرف کسی چیز کے جان لینے کا نام نہیں اصل تعلیم یہ ہے کہ سیکھنے والے کے طرز عمل میں تبدیلی پیدا ہو یعنی اس کے خیالات اس کے جذبات اور اس کے طریقہ ہائے کار بدل جائیں۔ ہمارے ثانوی مدارس میں اب تک سارا زور اس بات پر ہے کہ طلبہ کیا کچھ جانتے ہیں۔ حالاں کہ زیادہ قابل توجہ بات یہ ہونی چاہیے کہ وہ کیا کرتے ہیں لیکن کردار میں تبدیلی محض پسندیدہ کردار کی خوبیاں جان لینے سے نہیں ہوتی۔ لاکھوں انسان ہیں جو جانتے ہیں کہ تمباکو پینا صحت کے لیے نقصان دہ ہے لیکن ان کا یہ علم انہیں تمباکو نوشی سے باز نہیں رکھ سکتا

سیکڑوں والدین یہ جانتے ہیں کہ بچوں کو سب کچھ کیا کرایا مہیا کر دینا انہیں آنے والی زندگی میں نکما بنا دینے کا موجب ہوگا لیکن اس کے باوجود صاحب استطاعت والدین ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ اولاد کی ساری ضرورتیں خود ہی پوری کر جائیں۔ علم اکیلا عمل پر اکسانے کے لیے کافی نہیں اس کے لیے موزوں جذباتی تربیت بھی لازمی ہے، استاد کو چاہیے کہ سکھانے کا کام ایسے طور پر انجام دے کہ حقائق سمجھنے کے ساتھ ساتھ مناسب قسم کے جذباتی لگاؤ بھی پیدا ہو جائیں، اس کی موثر صورت یہ ہے کہ زندگی کے حقائق تجرباتی وحدتوں کے نتیجہ میں اخذ کیے جائیں محض سن سنا کر یا کتابیں پڑھ کر رٹ نہ لیے جائیں

مسائل کا حل

وحدتی طریق اس حقیقت کو پل بھر کے لیے نظر انداز نہیں کرتا کہ انسان نے آج تک جو کچھ سیکھا ہے، طرح طرح کے مسائل حل کر کے سیکھا ہے، اس طرح کا سیکھنا پائدار نوعیت رکھتا ہے ہر بچہ اسی طور پر سیکھتا ہے، وہ دنیا میں ہوش سنبھالتے ہی اپنے آپ کو مسائل سے دوچار پاتا ہے، دودھ کی بوتل کو ہوشیاری سے تھامے رکھنا۔ اپنے آپ کو بستر سے گرنے سے بچانا۔ جسم کو کپڑے سے ڈھانپے رکھنا۔ کھلونے کو پکڑنا، غرض یہ اور اس طرح کے ان گنت مسائل ہیں جن کا بچے کو نت نئے دن سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور لگاتار کوشش کی بدولت ان مسائل کے کامیاب حل تلاش کرتا جاتا ہے، وہ ان مسائل پر قابو پاتا اس پختگی کے ساتھ سیکھتا ہے کہ دوبارہ بھول جانے کا امکان ہی نہیں رہتا، سیکھنے کی یہ پائداری محض اس لیے ہے کہ اس نے یہ باتیں کسی سے سن سنا کر ذہن میں محفوظ نہیں کیں بلکہ عملی تجربہ سے سیکھی ہیں۔

تعلیم کے لیے اس مثال میں بہت بڑا سبق ہے، کیا تعلیم کی بڑی غرض بعض واقعات اور حقائق بچوں کے ذہن میں ٹھونسنا ہے، یا اس کی اصل غرض یہ ہے کہ بچے کامیابی کے ساتھ زندگی کے مسائل حل کرنا سیکھیں، اگر محض معلومات رٹوانے پر بس کر دی جائے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ معلومات زندگی میں کام بھی دیں گی؟ اگر ایک بچے کو ایک سے دس تک ہندسے لکھنے اور

پڑھنے سکھا دیئے گئے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ٹیلیفون پر اپنے باپ کو بھی بلا سکیں گا
ٹیلیفون سے کام لینا ایک مسئلہ ہے جو ہندسے یاد کرنے سے نہیں بلکہ ان ہندسوں سے
عملی کام لینے سے ہی حل ہو سکے گا۔

تدریس کو موثر بنانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ زندگی کا کوئی ایسا مسئلہ لیا جائے
جس میں بچوں کو حقیقی دلچسپی ہو، ایسا مسئلہ جو ان کی زندگیوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے
سب کے لیے دلچسپی کا سبب ہوگا، مثلاً ستمبر کے مہینے میں بہت سے لڑکے ملیریا کے چنگل میں
پھنس رہے ہیں، اس سے فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برسات کے موسم میں ملیریا کی شکایت عام
کیوں ہو جاتی ہے؟ اس کا مچھروں کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ مچھر کس طرح بڑھتے پھولتے ہیں؟ ان پر
قابو پانے کی کیا صورت ہے؟ ملیریا کے لیے دوسری حفاظتی تدابیر کیا ہیں اور اگر ملیریا ہو جائے
تو اس کا کامیاب علاج کیا ہے؟ ملیریا دنیا کے کن کن ملکوں میں ہوتا ہے اور کیوں؟ غرض اس
مسئلے کے کئی ایک پہلو ہیں جو ایک دوسرے سے خوب مربوط ہیں، اس مسئلہ کا اس طرح مطالعہ
کرنا دراصل تجربے کی ایک وحدت کا مطالعہ کرنا ہے، عملی زندگی کا ایک مسئلہ جس میں بچوں کو طبعی
دلچسپی ہے مطالعہ کے لیے لیا گیا ہے اور اس کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح دیکھا گیا ہے۔

اس مسئلہ کے حل کے ضمن میں نصاب کے ایک سے زیادہ مضامین کے ضروری حصے
پورے ہو جائیں گے، اس میں سائنس کا مطالعہ بھی آ جائے گا اور حفظان صحت کا بھی، اس میں
جغرافیہ بھی آئے گا اور زبان دانی بھی۔ ان مضامین کے اس طرح مطالعہ کرنے اور رسمی طور پر
پڑھنے میں فرق یہ ہے کہ موجودہ صورت میں طلبہ نے یہ معلومات اور لسانی مہارتیں اس لیے حاصل
کیں کہ انہیں ایک عملی ضرورت کے سلسلے میں ان کی ضرورت پیش آئی، رسمی تدریس میں ان کی ضرورت
استاد پر تو خوب واضح ہوتی ہے لیکن اکثر صورتوں میں طلبہ ان مضامین کے سیکھنے کی کوئی ضرورت
محسوس نہیں کرتے، اس کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ تجربے کی وحدت کے مطالعہ کی صورت میں جماعت
جو معلومات اور مہارتیں اخذ کرے گی ان کی نوعیت مستقل ہوگی جب کہ رسمی تدریس کے نتائج بہت

نے والے ثابت ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا اشکال تجربے کی ایک وحدت کی ہے۔ انسان بچپن سے لے مرنے دم تک زندگی کے مختلف طرح طرح کے تجربے حاصل کرتا رہتا ہے۔ لیکن یہ باتیں وہ علم کے بکھرے ہوئے غیر مربوط ٹکڑوں کی صورت میں اخذ نہیں کرتا بلکہ تجربے کی جامع اور نسبتاً مکمل بالذات اکائیوں کی صورت میں اخذ کرتا ہے۔ "وحدتی طریق تدریس" استادوں سے صرف یہی مطالبہ کرتا ہے کہ تدریسی مواد کو الگ تھلگ اور زندگی سے بے تعلق سبقوں کی شکل میں پیش کرنے کی بجائے اسے ایک ایسے مرکز دلچسپی سے متعلق کردیا کریں جو بچوں کے نزدیک حقیقی اہمیت رکھتا ہو وہ جو کچھ سیکھیں ایسی سرگرمیوں کے نتیجہ کے طور پر سیکھیں جو اس مرکز کے گرد منظم کی گئی ہوں، یہ سرگرمیاں باہم مربوط ہوں اور زندگی کے ساتھ بھی مربوط ہوں۔

غرض وحدتی طریق تدریس کو اکیلے استاد کا نہیں بلکہ استاد اور طلبہ دونوں کا مشترکہ معاملہ بنایا جاتا ہے۔ طلبہ اور استاد باہمی بات چیت کے نتیجہ کے طور پر کسی ایسے مسئلہ کو چن لیتے ہیں جس کا مطالعہ ان کے لیے دلچسپی کا سبب ہو اور ساتھ ہی جماعت کے مقررہ نصاب کی ضرورتوں کے بھی حسب حال ہو۔ اس مطالعہ کے لیے باہم مل کر ایک منصوبہ تیار کیا جاتا ہے۔ اب اس منصوبے کو پورا کرنے کے لیے ضروری مواد جمع کیا جاتا ہے، یہ تحقیق و مطالعہ کی منزل ہے جس میں ہر طالب علم اپنی افتاد طبع اور استعداد کے مطابق مسئلہ کے کسی پہلو کے متعلق مواد فراہم کرتا ہے۔ تیسری منزل مطلوبہ سرگرمیوں کی ہے، اس مرحلہ پر جمع شدہ مواد، معلومات اور مہارتوں کو کام میں لاکر ایسی سرگرمیوں میں حصہ لیا جاتا ہے جو مسئلہ کے فہم و ادراک میں اور اضافہ کرتی ہیں۔ یہ منزل دراصل دوسری منزل کے لیے نقطہ مرکز کا درجہ رکھتی ہے کیوں کہ تحقیق و مطالعہ کا کام اس تیسری منزل کو نگاہ میں رکھ کر ہی جاری رکھا گیا تھا۔ چوتھی اور آخری منزل قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کی ہے۔ اس منزل پر طلبہ باہمی بحث و مباحثہ سے اپنی کارکردگی پر نگاہ بازگشت ڈالتے ہیں۔ وہ اس بات کا اندازہ کرتے ہیں کہ آیا موجودہ وسائل سے پوری طرح کام لیا گیا ہے یا نہیں؛ کیا ان وسائل سے بہتر طور پر خدمت لینا بھی

ممکن تھا؟ کیا حاصل شدہ نتائج بالکل تسلی بخش ہیں؟ اگر کچھ کمی رہ گئی ہے تو اسے کیوں کر دور کیا جا سکتا تھا؟ طلبہ کی طرح استاد بھی اس "وحدت" کے نتائج کا اپنی جگہ اندازہ لگاتا ہے وہ اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ آیا طلبہ کے فہم و ادراک وہ تبدیلی پیدا ہو گئی ہے جو اس کے پیش نظر تھی؟ کیا انھوں نے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھ لیا؟ کیا جماعت کے افراد نے ایک دور کی کاوش سے فائدہ اٹھایا؟ قدر و قیمت کا یہ اندازہ "وحدتی طریق" کا ایک ضروری جزو ہے، کیوں اس کی بدولت آئندہ غلطیوں سے بچ کر کام کرنا زیادہ سہل ہو جاتا ہے۔

ایک مثال

وحدتی طریق کے متعلق اس نظری بحث کے بعد ایک مثال کا درج کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے:

کچھ روز ہوئے اردو کے مشہور اخبار "نوائے وقت" نے اپنے اداریہ میں دستور ساز اسمبلی کی کارکردگی اور متوقع رفتار کار پر تبصرہ کرتے ہوئے کچھ اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ پاکستان کے وسیع دیہاتی رقبوں میں اکثر اوقات بہتر ہزار کی آبادی کو بھی ایک اچھا شفاخانہ میسر نہیں آتا۔ مری میں دستور کے بہتر اراکین کے لیے تین شفاخانے بہم پہونچائے گئے، اس پر بھی ان کی اکثریت نے مری میں کام کرنے سے صحت کی بنا پر معذوری ظاہر کی، اب دستوریہ کراچی میں اجلاس منعقد کرے گی۔ ایک جلسہ صرف اس سوال کو طے کرنے کی نذر ہو گیا کہ ہمارے آئین ساز کس مقام پر اپنا کام کریں۔ کام کی اس رفتار دیکھ کر قدرتی طور پر یہ خوش فہمی ختم ہوتی نظر آتی ہے کہ ملک کو بہت جلد ایک دستور حاصل ہو جائے گا پہلی دستور ساز اسمبلی بھی اس لیے ناکام رہی تھی کہ اس نے بنیادی مسائل کو لگاتار کھٹائی میں ڈالے رکھا اور جزئیات میں الجھی رہی، ہم موجودہ آئین سازوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ سب سے پہلی فرصت میں بنیادی مسائل کو ہاتھ ڈالیں۔ یہ طے ہو جائیں گے تو باقی امور خود بخود طے ہو جائیں گے

فرض کیجیے تاریخ کا استاد یہ اداریہ جماعت کو پڑھ کر سناتا ہے، اس پر ایک دلچسپ بحث چل نکلتی ہے، آخر کار یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ جماعت اس مسئلہ کا جواب ڈھونڈے کہ پہلی دستور ساز اسمبلی اپنے مقصد میں کیوں ناکام رہی اور موجودہ دستوریہ کو اس کی ناکامی سے کیا سبق حاصل کرنا

ایک ایسا سوال ہے جس میں ہر طالب علم گہری دل چسپی کا اظہار کرتا ہے۔ اس سوال نے ہر ذہن میں خلش پیدا کر دی ہے وہ اس بات کی ضامن ہے کہ ہر طالب علم مقدور بھر اس مسئلہ کے مطالعہ کی شش کرے گا۔

مسئلہ کی تعیین کے بعد اصل کام شروع ہوتا ہے، اس کی پہلی منزل منصوبہ بندی ہے۔ یہاں س کی صورت یہ ہے کہ سوال زیر بحث کے مختلف پہلو جن کو صاف کرنا مقصود ہے بیان کر دیے جاتے ہیں۔ مثلاً :-

۱۔ پرانی دستوریہ کب اور کس طرح وجود میں آئی؟ اس کے اراکین کی تعداد کیا تھی، اور ہر صوبے کو رکنیت میں کتنا حصہ حاصل تھا؟ اس کی زندگی کی کل مدت کتنی تھی اور اس مدت میں اس نے کل کتنا عرصہ کام کیا؟ اس نے دستور سازی کا کتنا کام انجام دیا؟ اس کے تجویز کردہ آئینی قوانین کے متعلق عوامی ردِ عمل کیا تھا؟ وہ کون سے آئینی مسائل ہیں جن کے متعلق پاکستان کے مختلف حصوں میں اختلاف رائے موجود ہے؟ پرانی دستوریہ نے ان میں کن مسائل کو چھوا اور اس کوشش کے کیا نتائج نکلے؟ موجودہ دستوریہ کی رکنیت کن لوگوں پر مشتمل ہے؟ مری کے مختصر اجلاس پر کس قدر خرچ آیا؟ ہندوستان کا دستور کتنے عرصہ میں مکمل ہو گیا تھا؟ دوسرے مشہور ممالک مثلاً روس، امریکہ، فرانس، ترکی وغیرہ میں دستور سازی پر کتنا وقت اور روپیہ صرف ہوا تھا؟

دوسری منزل اس مسئلہ کے متعلق تحقیق و مطالعہ کی ہے، جماعت کے سارے لڑکے یکساں دل چسپیاں اور یکساں ذہنی استعداد نہیں رکھتے، اس لیے ان میں سے ہر ایک سوال کے کسی خاص پہلو کا مطالعہ کرنا پسند کرے گا، اس طرح جماعت چند گروہوں میں بٹ جاتی ہے، جو طالب علم پڑھائی لکھائی میں تاک نہیں وہ غالباً اپنے ذمے یہ خدمت لینا پسند کریں گے کہ پرانی اور نئی دستوریہ کے اراکین کے فوٹو اخباروں اور رسالوں میں سے جمع کر کے البم تیار کریں ان کی نشستوں کی ترتیب اور بعض اہم اجلاسوں کے پنسلی یا رنگدار چربے تیار کریں، ان تمام سابق اور موجودہ اراکین دستوریہ سے ملاقاتیں کریں جو آسانی سے مل سکتے ہوں اور ان ملاقاتوں کی روئدادیں زیادہ قابل طلبہ کی مدد سے تیار کریں۔

غرض تحقیق و مطالعہ کی بے شمار راہیں نظر آئیں گی، استاد اپنے وسیع تر علم اور پختہ تر تجربہ کی بنا پر اکثر اوقات ان راہوں کی نشان دہی کرتا رہے گا۔ تاکہ جماعت میں کوئی ایسا لڑکا نہ رہے جو کسی نہ کسی راہ کو اپنے لیے حسب حال نہ پائے۔

تیسری منزل ان سرگرمیوں کی وہ ہوگی جو حاصل شدہ معلومات کی بنا پر عمل میں آئیں گی:۔

۱۔ جماعت میں ایک آزادانہ بحث و مباحثہ ہوتا ہے، ہر گروہ اپنی کوشش کے نتائج کی رپورٹ پیش کرتا ہے، باقی طلبہ سوال پوچھتے ہیں بعض نکات کی وضاحت چاہتے ہیں . . . . بعض اوقات استاد بھی کسی نکتہ کے صاف کیے جانے کا مطالبہ کرتا ہے، اس بحث کی روشنی میں طلبہ ان بنیادی دستوری مسائل کی ایک فہرست تیار کرتے ہیں جن کا تسلی بخش حل ڈھونڈنا دستور سازی کے کام کے لیے ضروری ہے۔

۲۔ جماعت کے بورڈ پر ان رہنماؤں کے فوٹو چسپاں کیے جاتے ہیں جنہوں نے دستور سازی کے کام میں کوئی نمایاں حصہ لیا ہے۔ ہر فوٹو کے نیچے چند سطروں میں اس رہنما کی کارکردگی کا حال درج کیا جاتا ہے، اسی طرح پاکستان کی دستور سازی کے متعلق مشہور غیر ملکی اخباروں کی آراء کا خلاصے بھی چسپاں کیے جاتے ہیں۔

۳۔ جماعت دستوریہ کی ایک تمثیل پیش کرتی ہے، طلبہ پارلیمانی آداب اور طریق بحث سے عملی واقفیت حاصل کرتے ہیں۔

۴۔ موجودہ دستوریہ کے ہر رکن کے نام ایک خط لکھا جاتا ہے جس میں یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ قوم اس سے کس بات کی توقع رکھتی ہے اور کیوں۔

آخری اور چوتھی منزل قدر و قیمت کے اندازے کی ہے، اس کی صورت غیر رسمی بات چیت ہوگی، طلبہ اپنے میں سے ہر گروہ اور ہر فرد کے کام کے متعلق آزادانہ رائے زنی کرتے ہیں مشورے دیتے ہیں اور اپنے کام پر تنقید سنتے ہیں، استاد زیادہ تر ایک مبصر کے طور پر ہر طالب کی سرگرمی اور رد عمل پر نگاہ رکھتا ہے اور اس سے اندازہ کرتا ہے کہ طلبہ نے انفرادی طور پر اور من حیث الجما

بس حد تک مسئلہ زیر بحث کے متعلق ضروری سوجھ بوجھ پیدا کر لی ہے، جماعت نے جو تمثیل پیش کی تھی حاضرین کو اس نے کس حد تک متاثر کیا؟ دستوریہ کے اراکین کو جو خط لکھے گئے انھوں نے ان کو کس رنگ میں لیا وغیرہ۔

اہم خصوصیات

وحدتی طریق کی نمایاں خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں :۔

۱۔ وحدتی تدریس اس نفسیاتی حقیقت کا پورا پورا لحاظ رکھتی ہے کہ ادراک اور تعلّم کی نوعیت ایک وحدت کی ہے، جب ہم کسی صورت حال سے آگاہ ہوتے ہیں تو یہ آگہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کٹ کر ذہن میں داخل نہیں ہوتی، جہاں ان ٹکڑوں کو یکجا کر کے ایک وحدت کی شکل دی جاتی ہو۔ تازہ ترین نفسیاتی تحقیقات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ کسی چیز یا کسی صورت حال کا ادراک چھوٹی چھوٹی قسطوں میں نہیں بلکہ بیک وقت حاصل ہوتا ہے۔ ایک مسئلہ یا کسی چیز کی ماہیت پر سوچ بچار کرنے میں خواہ کتنا ہی وقت لگے جب اس کے معانی اور مطالب ذہن پر منکشف ہوں گے تو فوراً بجلی کی تیزی کے ساتھ ہوں گے، ذہن انسانی میں تجزیہ اور ترکیب کے عمل الگ الگ وقفوں میں نہیں بلکہ ایک ہی ساتھ جاری رہتے ہیں۔

جدید ترین تعلیمی فکر اس نکتہ پر زور دیتا ہے کہ سیکھنا نام ہے تجربہ کی تعمیر نو کا۔ یہ تعمیر پُرمعنی اور جامع وحدتوں کی صورت میں تشکیل پذیر ہوتی ہے، مثلاً اگر ایک بچے پر گھوڑے اور اونٹ کے درمیان فرق واضح کرنا ہو تو مفید طریق یہ نہیں کہ پہلے اسے گھوڑے کے قد، رنگ، جسامت، آنکھ، کان، دُم وغیرہ کے متعلق الگ الگ بتایا جائے، پھر اسی طرح اونٹ کے ایک ایک جسمانی حصے کی تشریح ہو اور آخر میں دونوں جانوروں کا فرق بچے پر کھلے، بلکہ یہ ادراک پیدا کرنے کی قدرتی اور آسان صورت یہ ہے کہ پہلے بچے کو گھوڑا دکھا دیا جائے اور بعد میں اونٹ، دونوں جانوروں کے جامع ادراک پیدا ہو جانے کے بعد بچہ دونوں کا فرق خود بخود سمجھ جائے گا۔

وحدتی طریق صرف اس قدر مطالبہ کرتا ہے کہ مطالعہ کے لیے پُرمعنی اور جامع صورتِ حال

پیش کی جائے مثلاً پاکستان میں آب پاشی اور اس کے معاشی، سیاسی اور بین الاقوامی پہلو" پاکستانی صنعتیں، موجودہ حالت اور ترقی کے امکانات۔ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات۔ پس منظر اور مستقبل"۔ "افغانستان اور پاکستان کے مراسم" ماضی اور حال۔ یہ اور اس قسم کے بیسیوں اور مسائل ہیں جو جامع وحدتوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ بے شک یہ مسائل زیادہ ہوشیار طلبہ کے مطالعہ کے لیے ہیں، چھوٹی جماعتوں میں آسان تر مسائل چنے جا سکتے ہیں، مثلاً "ہماری روزانہ خوراک"۔ اس کی غذائی قیمت اور اس میں توازن کی ضرورت"۔ "ہمارا لباس ۔ کن کن ہاتھوں اور مرحلوں میں سے گذر کر ہم تک پہونچتا ہے"۔ وہ خط جو ہم لکھ کر لیٹر بکس میں ڈالتے ہیں کس طرح منزل مقصود پر پہونچتے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ جو طلبہ ان جامع وحدتوں کے ضمن میں معلومات اخذ کرتے ہیں ان کی معلومات محض ذہنی بوجھ ہی نہیں بنتیں بلکہ کردار میں مناسب تبدیلی پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہیں۔

۲ - وحدتی طریق اس نکتہ کو خوب سمجھتا ہے کہ طلبہ کسی چیز کو اسی صورت میں مؤثر طور پر سیکھتے ہیں جب وہ مسئلہ زیر بحث کے مقاصد کو اچھی طرح سمجھ کر انہیں قبول کر لیں اور منصوبہ بندی اور مقاصد کی تحصیل میں آزادانہ اور سرگرم حصہ لیں، یہ تصور نہ صرف جمہوریت بلکہ شرف انسانی کی جان ہے اسلام وہ پہلا ضابطۂ حیات ہے جس نے انسانیت کو یہ شرف بخشا۔ اس نے مخالفوں سے کھلے کھلے لفظوں میں کہا کہ تم جن لکیروں کو پیٹ رہے ہو، ان کی سند تمہارے پاس کیا ہے؟ یہی نا کہ تم نے اپنے بڑوں کو ایسا کرتے دیکھا یا تمہارے سردار تمہیں ایسا کرنے کو کہتے ہیں۔ مگر ذرا ہوش سے کام لے کر سوچو کہ کیا یہ سندیں بھی کسی طرز عمل کو پسندیدگی کا درجہ دے سکتی ہیں؟ اگر تمہارے بڑے بوڑھے اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے رہے ہیں تو کیا تم بھی ان کے پیچھے چل کر اندھیرے کے گڑھے میں گر و گے اگر تمہارے سردار اپنی بڑائی کا رعب جمائے رکھنے کے لیے تمہیں لکیر کا فقیر بنائے رکھنا چاہتے ہیں تو آخر تمہاری اپنی سوجھ بوجھ کو کیا ہوا ہے کہ تم اپنی بھلائی کا راستہ نہیں دیکھ سکتے؟

غرض اسلام نے رسم پرستی، توہم پرستی، شخصیت پرستی اور اس قسم کی دوسری بھاری بھر کم زنجیروں کو جو صدیوں سے ذہن انسانی کو جکڑے ہوئے تھیں ایک ہی ٹھوکر سے پاش پاش کر دیا

فکر انسانی کو تاریخ میں پہلی بار یہ موقع ملا کہ ہر قسم کے ڈر اور بوجھ سے آزاد ہو کر فطرت کے پُر اسرار
سے پر نگاہیں گاڑے اور اس کے تعاقبوں کو ایک ایک کر کے پلٹتا جائے، معاملات پر ذاتی سوجھ بوجھ
غور و فکر کرنا اور اپنے کے لیے ذاتی طور پر ذمہ دار ہونا یہ وہ دو ستون ہیں جن پر انسانی شرف کی
رت قائم ہے، اسلام نے ان دونوں ستونوں کو پوری صحت مندی کے ساتھ بحال کیا اور ان پر
ے ایسی امت کی تعمیر کی جو خیر الامم کے لقب سے نوازی گئی۔

ہماری قومی تاریخ کا یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ شرف انسانیت کے جو مضبوط ستون
سلام نے نصب کیے تھے دوسروں نے ان پر سر بفلک عمارتیں کھڑی کر دیں، لیکن ہم نے ان
نوں کو اپنے ہاتھوں زمین کے برابر کر دیا، ذاتی سوجھ بوجھ اور تفکر کی جگہ تقلید اور بے چون و چرا
طاعت کو ملی اور اعمال کی ذاتی ذمہ داری مشائخ پرستی اور شخصیت پرستی کی نذر ہو کر رہ گئی "لہا
الکسبت وعلیہا ما اکتسبت" پر ایمان رکھنے والی قوم بے چون و چرا اطاعت کے گڑھے میں
یہاں تک دھکیل گئی کہ اس کے لیے کردار کا بہترین نمونہ حافظ شیرازی کے اس شعر میں پیش کیا گیا

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید ٭ کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

غرض انسانی شرف کے وہ سنہری اصول جن پر اسلامی زندگی کی تعمیر ہوئی تھی صدیاں گذریں
ہماری اجتماعی زندگی سے مٹ گئے، غلامی کے لیے عرصے نے ان کی رہی سہی یاد بھی باقی نہ چھوڑی
پاکستان کی نوزائیدہ جمہوریت ان اصولوں کو واپس لانے کی مدعی ہے، وہ ان اصولوں کو جمہوری
اقدار کا نام دے کر انہیں قومی زندگی کی اساس بنانا چاہتی ہے، ہمیں اس سے بحث نہیں ہونی
چاہیے کہ ان اصولوں کو جمہوری کہا جائے یا اسلامی، حقیقت یہ ہے کہ آج تک دنیا کی بڑی سے
بڑی جمہوریت نواز قوم بھی اخوت، مساوات، حق گوئی اور بے باکی کے اس درجہ کو نہیں پہونچتی جو
ابتدائی اسلامی سوسائٹی نے حاصل کیا تھا، اسلام جس اجتماعی زندگی کی داغ بیل ڈالنا چاہتا ہے
اس کی طرف اونچی سے اونچی جمہوریت بھی رشک کی نگاہوں سے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی، اس لیے
ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ سچی جمہوری اقدار کی بحالی اور ترویج کی طرف جو قدم بھی اٹھایا جائے گا، وہ

بالآخر یہی اسلامی اقدار کی سربلندی کی طرف ایک قدم ثابت ہوگا۔

اگر ہم ملکی زندگی میں جمہوری اقدار کی کارفرمائی دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کام کا آغاز مدر
کی زندگی سے ہونا چاہیے۔ اگر ہم طلبہ کو بدستور اس بات کا خوگر بناتے جائیں گے کہ استاد اپنے تقر
سبق میں جو کچھ کہہ دے اور درسی کتاب جو کچھ بیان کر دے اسے آنکھیں بند کر کے رٹ لینا ہ
تو یقینی طور پر ہم تدبر، تفکر اور تنقیدی نگاہ رکھنے والے شہری پیدا نہیں کر سکتے۔ ایسی تعلیم و تربیت
جو نوجوانی پیدا کرے گی وہ حاکم بننے پر جبر و تحکم کو شیوہ بنائیں گے اور ادنیٰ حیثیت میں خوشامد اور چاپلو
کو ذریعہ نجات سمجھیں گے۔ راقم کو ایک صاحب نظر امریکی ماہر تعلیم کے وہ لفظ نہیں بھولیں گے جو انہوں
گھوڑا گلی میں استادوں کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے کہے۔ انہوں نے کہا:۔

میں نے اپنے مختصر قیام پاکستان میں محسوس کیا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار
ان میں سے اکثر ایک کھوکھلے پندار کا شکار ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چند لوگ انہیں حسد کی نگ
سے دیکھتے ہیں اور ایک بھاری اکثریت نفرت کی نگاہ سے، خدا نہ کرے کہ امریکی تعلیم کبھی اس قسم کی
ذہنیت پیدا کرے۔ ہماری تعلیم کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ سوجھ بوجھ اور انکسار پیدا کرتی ہے انکسا
سوجھ بوجھ کی لازمی پیداوار ہوا کرتی ہے، پاکستانی استادوں کو چاہیے کہ اپنے طلبہ میں سوجھ بوجھ
اور ذاتی فہم کا ملکہ پیدا کریں، وہ ایسے نوجوان پیدا نہ کریں جو ہاں میں ہاں ملانے کو سب سے بڑا
کمال سمجھتے ہوں بلکہ ایسے نوجوان پیدا کریں جو حقائق کو دیکھنے کی صلاحیت اور انہیں بے لاگ
طور پر بیان کرنے کی جرات رکھتے ہوں"۔

وحدتی طریق تدریس کمرۂ جماعت اور مدرسے کی ساری زندگی میں سوجھ بوجھ کی حکمرانی
دیکھنا چاہتا ہے، وہ طلبہ کو خود سوچنے، معاملات پر غور کرنے، منصوبے تیار کرنے ان کو عملی جا
پہنانے اور انجام کار اس سارے کام کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے مواقع دے کر انہیں
صاحب نظر اور ذمہ دار شہری بنانا چاہتا ہے وہ انہیں شرف انسانی عطا کرنا چاہتا ہے جو نوع ا
کی سب سے قیمتی میراث ہے، یہ اس طریق کار کی سب سے بڑی خوبی ہے

جمہوری ملکوں اور بالخصوص ریاستہائے متحدہ امریکہ میں آزاد جستجو کا جذبہ نہ صرف صنعت اور
زندگی کے دوسرے میدانوں میں پوری طرح کارفرما ہے بلکہ مدرسوں اور اعلیٰ تعلیم گاہوں میں
ان ملکوں کی ترقی کا بڑا راز اسی جذبہ میں ہے، وہاں اس چیز کو بالکل بدیہی ضرورت خیال
کیا جاتا ہے کہ نئی پود کو خود آزادانہ طور پر سوچنے کے قابل بنایا جائے۔ ایشیائی ملکوں میں یہ
جذبہ بھی ناپید ہے، تاہم اسے پیدا کیے بغیر حقیقی ترقی کی طرف کوئی قدم اٹھانا ممکن نہیں، اس مہم کا
آغاز مدرسوں میں ہونا موزوں بھی ہوگا اور نتیجہ خیز بھی۔

وحدتی طریق کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں طلبہ کی مختلف دل چسپیوں کی نسلی اور مختلف
استعدادوں کی کارفرمائی کے لیے بڑی گنجائش موجود ہے۔ ہمارے مدرسوں کے موجودہ نصاب میں
طلبہ کے انفرادی اختلافات کے لیے کوئی گنجائش نہیں، یہ نصاب اس اصول پر وضع کیا گیا ہے
کہ تمام طلبہ ذہانت کے اعتبار سے اتنی یکسانیت رکھتے ہیں کہ ایک ہی رفتار سے اس نصاب کو پورا
کر سکیں اور ان کی دل چسپیوں میں اتنی یکسانیت موجود ہے کہ سب کے سب ایک ہی قسم کی ذہنی
سرگرمیوں کو توجہ کا مرکز بنا سکیں، یہ مفروضے واضح طور پر غلط ہیں، اگر خدا تمام انسانوں کو ایک سی ذہنی
استعداد اور ایک سی دل چسپیاں عطا کرتا تو دنیا کا رنگا رنگ حسن ختم ہو جاتا اور اس میں وہ جاذبیت
بھی پیدا نہ ہوتی جو اس وقت ہے۔

ایک بھرپور اجتماعی زندگی کے لیے طرح طرح کی استعدادوں کی ضرورت ہے۔ اگر مدرسے
بچوں کو استعداد کے ایک ہی سانچے میں ڈھالنے پر اصرار کریں تو قومی زندگی کی یہ مختلف ضرورتیں
کیسے پوری ہوں، ہر بچہ اپنے ساتھ بعض مخصوص صلاحیتیں لے کر دنیا میں آتا ہے، مدرسے کو مقدور بھر
کوشش کرنی چاہیے کہ ان انفرادی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے، اگر ایک طالب علم
رٹ کے لکھائے ہوئے نوٹوں یا درسی کتاب کو زبانی رٹنے کی استعداد سے عاری ہے تو اس سے یہ
لازم نہیں آتا کہ اس میں کچھ اور مفید کام سیکھنے کی صلاحیت بھی نہیں۔ ایسے طلبہ کو کم زور اور نکمے
قرار دے کر دھتکار دینا ایک بھاری قومی نقصان کے مترادف ہے +

سمندری عجائبات

ادریس احمد

عربوں کی سمندر نوردی دنیا بھر میں مشہور رہی ہے، وہ نڈر، بہت اور تلاش جس نے اس قوم کو دنیا کی رہنمائی کے مقام پر لا کھڑا کیا تھا، دوسرے اسباب کے علاوہ سمندری خطر پسندی کی بھی پیداوار تھی۔ جن مغربی عالموں نے قرآن حکیم کا مطالعہ کیا ہے انہیں اس بات پر تعجب ہوا ہے کہ اس الہامی کتاب میں سمندری زندگی، اس کے خطرات اور فوائد کی تصویر کس قدر وضاحت کے ساتھ کھینچی گئی ہے ان کا تعجب اس یقین کی پیداوار ہے کہ قرآن بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے، جنہوں نے عمر میں ایک مرتبہ بھی سمندری سفر اختیار نہیں کیا تھا لیکن صاحب بصیرت لوگ جانتے ہیں کہ یہ امر قرآن کے الہامی ہونے کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ جو کتاب نوع انسان کی ہدایت کے لیے بھیجی گئی ہو ناممکن تھا کہ اس میں کرہ ارض کے تین حصے تہائی سمندری حصے کے کرشموں اور عجائبات کا ذکر نہ ہوتا۔

عربوں کو بالخصوص اور مسلمانوں کو بالعموم اپنی عظمت کے زمانہ میں سمندر سے بڑی محبت رہی ہے۔ سچ یہ ہے کہ جب تک وہ سمندری قوت میں مضبوط رہے اس وقت تک کوئی آنکھ اٹھا کر ان کی طرف نہ دیکھ سکا۔ لیکن جوں جوں سمندروں کی سرداری ان کے ہاتھ سے نکلتی گئی وہ تجارتی اور سیاسی طور پر ناکارہ ہوتے گئے، آج مسلمان ملکوں کی بحری قوت بالکل برائے نام ہے، وہ ایشیا اور افریقہ کے وسیع و عریض اور جنگی اور سیاسی لحاظ سے اہم علاقوں کے مالک ہیں لیکن آس پاس کے سمندر غیروں کے ہاتھ میں ہیں۔ اسلام کی نشاط ثانیہ کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کی نئی پود سمندر میں پھر سے دلچسپی پیدا کرے اور سمندر نوردی میں اپنے اسلاف کی جگہ لے۔

آج دنیا کا ایک بہت بڑا مسئلہ خوراک کا مسئلہ ہے، پرانی دنیا کے اکثر ملکوں میں آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے لیکن خوراک کے وسائل محدود ہیں۔ بھوک کی دنیا نے اب خوراک کی

ندروں کی ان گہرائیوں کو بھی کھنگالنا شروع کر دیا ہے جو اب تک بغیر ذی روح ویرانے سمجھ کر
تک چھوئی نہیں گئی تھیں، یہ تلاش بڑی کامیاب ثابت ہو رہی ہے۔ بڑا تو جاپانی اور
ے ملاح اب ایسے گہرے سمندروں سے مچھلیوں کے ذخیرے حاصل کر رہے ہیں جہاں
ے ان کا وجود ناممکن سمجھا جاتا تھا، طرح طرح کی مچھلیوں کے علاوہ سمندر کی آغوش میں ان گنت
نباتات چھپے پڑے ہیں، ان میں سے بعض انسان کے دوست ہیں اور بعض دشمن۔ ذیل کی
روں میں ان عجائبات میں سے چند ایک کا حال بیان کیا جاتا ہے۔

لی مچھلی

جیلی انگریزی زبان میں چکنے لیسدار مادے کو کہا جاتا ہے۔ پھلوں سے عمدہ خوشبودار
لی تیار کی جاتی ہے جو بڑے شوق سے کھائی جاتی ہے، سمندری دنیا میں بعض ایسے جاندار بھی ہیں
ن کا جسم جیلی کے ایک تودے کے سوا کچھ نہیں، اس تودے میں سے بعض اوقات لمبی تاریں
ئی کئی فٹ لمبے بالوں کے گچھوں کی طرح پانی میں پھیلی رہتی ہیں، عام زبان میں اس چیز کو
لی مچھلی کہا جاتا ہے، لیکن سب جیلی مچھلیاں ایک سی نہیں ہوتیں، ان میں سے بعض خطرناک طور پر
ریلی ہوتی ہیں، ان کی زہریلی تاریں جال کی طرح پھیلی رہتی ہیں، بعض اوقات ان تاروں کی
ائی سو فٹ کو پہونچ جاتی ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ جس شے کو ہم نے جیلی مچھلی خیال کیا ہے
، نرم و نازک گلابی پنکھڑیوں والا سمندری گلاب ہو۔ جو جوار بھاٹا کے کسی جوہڑ میں اُگ رہا ہو۔

یر کی ایال

شہرۂ آفاق جاسوسی ناول نگار سر آرتھر کانن ڈائل نے اپنی ایک کہانی کا نام "شیر کی ایال"
نا ہے، اس میں وہ بیان کر رہے ہیں کہ شرلک ہومز ایک طوفانی رات کے بعد صبح سویرے انگلستان
ایک چٹانی ساحل پر گھوم رہا تھا کہ یکایک ایک آدمی پر نگاہ پڑی جو دم توڑ رہا تھا، اس کے آخری
لفاظ یہ تھے "شیر کی ایال"۔ متوفی کے جسم پر جگہ جگہ سرخ اور نیلی بدھیاں پڑی تھیں جس سے ہومز کو
ندازہ ہوا کہ اسے کوڑوں سے بری طرح پیٹ پیٹ کر مار دیا گیا ہے، قریب تھا کہ بعض بے گناہ

لوگوں کو شک میں دھر لیا جاتا۔ مگر مرنے والے کے آخری الفاظ اس بارے میں کچھ رہنمائی نہ کرتے تھے، آخر
ہومز کو یکایک خیال آیا کہ ان الفاظ کے معانی کی پوری پڑتال کرنی چاہیے، چناں چہ اس نے فوراً تاریخ فطرت کی
کتابوں کو چھان مارا اور دیکھا کہ "شیر کی ایال" ایک دیوہیکل جیلی مچھلی کا نام ہے جو کیانی کی جنس سے تعلق رکھتی ہے اسے
"شیر کی ایال" کا نام ملنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بھورے زہریلے بالوں کا گچھا شیر کی ایال کی طرح معلوم ہوتا ہے
اب ہومز کو معلوم ہوا کہ رات کا طوفان جو پانی ساحل کی طرف کھینچ لایا تھا، اس کے ایک جوہڑ میں متوفی نہانے کو
داخل ہوا، اور شیر کی ایال کے زہریلے چابکوں سے لپٹ گیا۔

حال ہی میں پرنسٹن یونیورسٹی (امریکہ) کے کچھ طالب علم ریاست مین کے ساحل پر گھو
رہے تھے، جوار بھاٹا نے ساحل پر جگہ جگہ جوہڑ اور کیچڑ پیدا کر رکھی تھی یہ ان میں چل ر
تھے کہ یکایک سرخ و زرد جیلی کا ایک تودہ پانی میں تیرتا نظر آیا، یہ بے حس و حرکت تھا اور
اس کے زہریلے بال غائب تھے غالباً طوفان کی تہ۔ اس نے اسے ساحل کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کے پا
کر دیا تھا، چناں چہ ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر اس چمکتے تودے کو اپنے ننگے ہاتھوں سے
ساحل پر دے مارا۔ ابھی تھوڑی دور آگے بڑھے تھے کہ لڑکے نے اپنے ہاتھوں کو شدت سے
ساتھ رگڑنا شروع کیا، ان میں ایک عجیب چبھن محسوس ہو رہی تھی، یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ
شیر کی ایال جھڑ چکی تھی، پھر بھی اس کی جلد زہریلے اثر سے پوری طرح پاک نہ ہوئی تھی، کو
آدھ گھنٹہ بعد یہ چبھن خود بخود ختم ہو گئی۔

جن عالموں نے "شیر کی ایال" جیلی مچھلی کی تاریخ اور عادتوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا کہ
کہ یہ کھلے سمندروں میں بعض اوقات پانی کی سطح کے قریب اور بعض اوقات اس سے کافی نیچے تیر
رہتی ہے بعض اوقات اس کے غول کے غول اکٹھے پھرتے ہیں، اور بعض اوقات یہ اکیلی کسی طر
جا نکلتی ہے۔ اس کا جسم ایک نصف دائرے کی شکل کا ابھرا ہوا تودہ ہوتا ہے، جس کی گولا
بعض اوقات سات فٹ کو پہنچ جاتی ہے اور موٹائی تین فٹ کو۔ اس کے زہریلے بال تعدا
آٹھ سو تک ہو سکتے ہیں، یہ کچھوے جیسے ابھرے ہوئے جسم کے نیچے لٹکتے رہتے ہیں اور پا

پیچھے دم کی طرح، جب کوئی جاندار شے ان بالوں سے چھوتی ہے تو ان سے زہر نکل کر شکار کی جلد میں داخل ہوتا ہے، یہ زہر خراش اور سوزش پیدا کرتا ہے، اگر شکار بے چین ہو کر ہاتھ پاؤں مارنے لگے اور اس طرح شیر کے چابک کو گرفت میں نہ آنے دے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ دوسرے ان گنت چابکوں کو اپنی جلد پر برسنے کی دعوت دے رہا ہے۔ تاہم "شیر کی ایال" کوئی تندخو شکاری نہیں جو شکار کے پیچھے بھاگتا پھرتا ہو، وہ تو آسانی سے پانی میں تیرتا رہتا ہے، اس کے زہریلے بال ادھر ادھر پھیلے رہتے ہیں، لیکن وہ حملے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں، انسان بہت شاذ اس کی زد میں آتے ہیں، اس کے زہریلے بالوں سے ٹکرانے والے زیادہ تر مچھلیاں اور دوسرے چھوٹے چھوٹے سمندری جانور ہیں، جب یہ شکار بالوں کے ڈنک سے بے بس ہو جاتے ہیں تو جیلی مچھلی انہیں اپنے پیٹ کے نچلے حصے کی طرف کھینچ کر ہضم کر جاتی ہے۔

"شیر کی ایال" بہر حال ایک خطرناک سمندری جانور ہے جس سے خبردار رہنا چاہیے بعض اوقات اس کا حملہ انسان کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے جیسا کہ ہومز کی کہانی میں مذکور ہے۔ اس کے زہر کی نوعیت باوجود کوشش کے ابھی اچھی طرح معلوم نہیں ہو سکی۔ یہ زہریلی جیلی مچھلی عام طور پر چھوٹی جسامت کی ہوتی ہے لیکن بحر منجمد اور کھلے اوقیانوس میں اس کے بہت عظیم الجثہ نمونے ملتے ہیں یہ دیو ہیکل جیلی مچھلی اپنے زہریلے چابکوں سے انسان کو ہلاک کر سکتی ہے۔

بحر اوقیانوس کے ساحلوں کے ساتھ ساتھ جو خاردار جیلی مچھلی پائی جاتی ہے وہ ایک اور قسم کی ہر یہ بہت نازک قسم کی جیلی مچھلی ہے جس کے چبھنے والے بال چند فٹ سے زیادہ لمبے نہیں ہوتے خلیج چسپیک میں نہانے والوں کا جسم بعض اوقات ایسے تیز چبھنے والے سمندری کانٹوں سے رگڑ کھا جاتا ہے جو انہیں عمر بھر یاد رہتے ہیں، یہ دراصل اسی جیلی مچھلی کے کانٹے دار بال ہوتے ہیں، چونکہ یہ جیلی مچھلی قد میں بڑی نہیں ہوتی اس لیے اس کی رگڑ کا اثر کوئی گھنٹہ بھر کی جلن کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ تاہم اگر کوئی نہانے والا بدقسمتی سے ان مچھلیوں کے غول میں جا پھنسے یا ان کے خاردار بال اس کے منہ اور آنکھوں پر لگ جائیں تو اس صورت میں زیادہ تکلیف ہونا یقینی ہے۔

نہ آنکھیں، نہ کان۔ نہ ہڈیاں

جیلی مچھلی کو فی الحقیقت مچھلی کا نام دینا درست نہیں، کیونکہ یہ مچھلی کی جنس سے نہیں ہے۔ یہ جانوروں کی اس بڑی قسم سے تعلق رکھتی ہے جو نظامِ حیات میں اسفنج سے اوپر اور کیڑے مکوڑوں سے نچلا درجہ رکھتی ہے، اس کے جسم کی ہر شے نظامِ ارتقا میں اس کے پست درجہ پر گواہی دیتی ہے، نہ اس کی آنکھیں ہیں اور نہ کان۔ اسے ماحول کا انتباہ۔ سادہ عدسہ۔ یا عدسات کے گچھوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہ عدسے روشنی، تھرتھراہٹ اور کیمیائی مواد کی اطلاع پہنچاتے ہیں، اندرونی اعضا ایک عصبی جال کے ذریعہ مربوط ہیں، اس میں نہ ریڑھ کی ہڈی ہے اور نہ ہڈیوں کا ڈھانچہ اس کی عصبی ساخت بھی بالکل ابتدائی رہتی ہے۔

اکثر جیلی مچھلیاں اپنی زندگی کا کچھ حصہ سمندر کے ساحل یا اس کی تہ پر کسی ایسی چیز سے چمٹ کر گزارتی ہیں جس سے سمندر کا پانی ٹکراتا ہے، اور زندگی کا کچھ حصہ آزادانہ طور پر تیر کر بسر کرتی ہیں۔ ان کے عضلات ناقابلِ یقین حد تک پھیل اور سکڑ سکتے ہیں، ان کی تمام اقسام چبھنے والے عدسات رکھتی ہیں، لیکن بعض اقسام کے عدسے انسان کے لیے بے ضرر ہیں۔ ان جانوروں کی اب تک نو ہزار سے زائد اقسام معلوم ہو چکی ہیں، لیکن ان کی غالب اکثریت سمندروں میں رہتی ہے اور عام لوگوں کے دیکھنے میں نہیں آتی۔

جیلی مچھلی آزادانہ تیرنے کی صورت میں پانی کے اندر سانس لیتی ہے، لیکن اس کی حرکات کا کوئی مقررہ اصول نہیں، وہ جب چاہے سمندر کی تہ پر جا سکتی ہے، مثلاً آندھی اور طوفان کی صورت میں، لیکن یہ اس قدر کاہل اور سست عناصر واقع ہوئی ہے کہ عموماً آندھیوں اور طوفانوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ بعض جیلی مچھلیاں اپنے بالوں کے ساتھ چمٹ جانے والے پاؤں بھی رکھتی ہیں، یہ قسم سمندر کی تہ پر رینگ سکتی ہے۔ اور سمندری نباتات پر چل پھر سکتی ہے۔ پانی میں تیرتے وقت جیلی مچھلی اپنے جسم کو سکیڑ اور پھیلا کر آگے پیچھے حرکت کرتی ہے۔ پہلے یہ جسم کو یکبارگی پھیلا دیتی ہے اور پھر جھٹ سکیڑ لیتی ہے، اس سے جسم حرکت کرتا ہے اور بالوں کے گچھے ساتھ ساتھ گھسٹتے چلے آتے ہیں۔ (باقی)

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

تاریخ کے متعلق سچی باتیں

تاریخ پڑھانے والے استادوں کی کانفرنس منعقدہ آکسفورڈ میں پروفیسر وی۔ ایچ۔ گالبریتھ نے بعض ایسی باتیں کہہ دیں جن پر کئی استادوں نے بہت لے دے کی۔ مثلاً پروفیسر موصوف نے کہا کہ مدرسوں کے لڑکوں کے لیے تاریخ کا مطالعہ ریاضی یا کلاسیکی زبانوں کے مطالعہ کی سی ذہنی افادیت نہیں رکھتا کیونکہ ان مضامین کے ذہنی اثرات کو درستی سے جانچا جا سکتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ تاریخ پڑھنے والے طلبہ کی ذہنی اور اخلاقی ترقی میں اس قدر تفاوت نظر آتا ہے کہ ایک طرفہ تماشا دیکھنے والے شرپسند کے تمام وظیفے حاصل کر لیتے ہیں حالانکہ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ایسے سمجھے ہوئے نوجوان تیار کرے جو خوش اطوار ہوں۔

ان خیالات پر شدید احتجاج کرتے ہوئے ایک عالم تاریخ نے کہا ہے کہ جو طالب علم اس سے تاریخ پڑھ کر گئے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہی پسندیدہ اخلاق کے مالک تھے جیسے ریاضی اور کلاسیکی زبانوں کے طلبہ۔ ان میں سے وظیفہ پانے والے طلبہ یقینی طور پر بلند اخلاق تھے اور ان کے یہ اعلیٰ اخلاق بڑی حد تک مطالعہ تاریخ کی پیداوار تھے۔

تعلیم بذریعہ ڈاک۔

فرانس کی قومی وزارت تعلیم نے ایک شعبہ اس غرض سے قائم کر رکھا ہے کہ جو طلبہ اور طالبات مخصوص مجبوریوں کے باعث درس گاہوں میں نہ جا سکتے ہوں انہیں ڈاک، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ تعلیم دی جائے۔ یہ تعلیم وزارت تعلیم کے مقرر کردہ نصاب کے مطابق دی جاتی ہے اور جب نصاب ختم ہو جاتا ہے تو اسی معیار کے مطابق امتحان لیا جاتا ہے۔ اس تعلیمی سہولت سے تین قسم کے طلبہ فائدہ اٹھاتے ہیں:۔ (ا) وہ جو غیر ملکوں میں ہیں (ب) وہ جو کسی کسی

وجہ سے تعلیم پوری کیے بغیر مدرسہ چھوڑ بیٹھے تھے اور اب ان کے وقت کام کاج میں معروف رہے ہیں۔ یہ تعلیمی خدمت بالکل مفت ہے، طالب علم کو خرچ ڈاک اور کتابوں کی قیمت کے علاوہ کچھ ادا کرنا نہیں پڑتا۔

جو فرانسیسی بچے انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں ان میں سے کئی برطانوی گھروں میں رہائش اختیار کر لیتے ہیں، اس طرح بعض برطانوی والدین کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ فرانسیسی نظام تعلیم کو قریب سے دیکھیں، یہ والدین اس بات پر متفق ہیں کہ فرانسیسی نصاب برطانوی نصاب کے مقابلے میں زیادہ بوجھل ہے، نوجوان طلبہ کو کتابی کام پر اتنا وقت صرف کرنا پڑتا ہے کہ ان کے پاس جسمانی تفریح اور مجلسی سرگرمیوں کے لیے بہت تھوڑا وقت باقی بچتا ہے، اس پس منظر میں فرانس کی تعلیم بذریعہ ڈاک کا مطالعہ اور بھی زیادہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔

قومی تعلیم کا یہ مرکز ہزاروں امیدواروں کی تعلیمی ضرورتیں پوری کرتا ہے، اس کی پیچیدہ تنظیم کا کچھ اندازہ ان ہدایات سے ہو سکتا ہے جو امیدواروں کو جاری کی جاتی ہیں، یہ بے حد واضح اور اکثر حالتوں میں سخت ہوتی ہیں، پچھلے سال غیر ملکوں میں رہنے والے طلبہ کو جو نصاب ختم کرایا گیا وہ تیس ہفتہ وار قسطوں میں منقسم تھا، یہ ۸ اکتوبر سے شروع ہو کر ۱۰ جون کو ختم ہوا۔ فرانسیسی مدرسوں کی میعاد تعلیم بھی یہی ہے، اس عرصہ میں ایک وقفہ تعطیلات کرسمس کا آتا اور دوسرا فروری کے آخر میں، ہر قسط کو حل کر کے یہ حل پہلے سے مقررشدہ تاریخ تک بھیجنا ضروری ہوتا ہے، اگر کسی وجہ سے تاخیر ہو جائے تو اس کے لیے تسلی بخش عذر پیش کرنا ہوتا ہے، پرچہ جات قومی مرکز کی فراہم کردہ کاپیوں پر حل کرنے ہوتے ہیں، نصاب کی ہر قسط کے لیے جن کتابوں کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے ان کی فہرست مہیا کر دی جاتی ہے اور طالب علم کو اتنا وقت دیا جاتا ہے کہ ان کتابوں کو پہلے سے فراہم کر لے۔

تعلیم کی وسعت کے اعتبار سے ایسی ہدایات ناگزیر نظر آتی ہیں لیکن امیدوار

یقیناً کرائی دکھائی دیتی ہوں گی۔ تاہم مرکز کی ڈائرکٹر مادام ۔ ایم ۔ ایچ ۔ جلینٹے کی طرف سے ہر
امیدوار کو جو خط موصول ہوتا ہے اس میں ذاتی مراسم کی جھلک پیدا کرنے کی کافی کوشش
کی جاتی ہے اور امیدوار کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مخصوص حالات سے مرکز کو
آگاہ رکھے۔ خط کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

"آپ کو معلوم ہے کہ یہ مرکز ایک بہت بڑی تنظیم ہے، جو ابتدائی ثانوی اور ٹیکنیکل تعلیم کا
اہتمام کرتی ہے اس کی بے شمار شاخیں ہیں۔" اس کے بعد سرکاری پروگرام کی تفصیلوں قسطوں
کی ترتیب۔ درستیوں اور رپورٹ کے متعلق ذکر ہوتا ہے، اس کے بعد یہ الفاظ آتے ہیں :۔
"ایک مہینہ گذر جانے پر آپ کو ساری جماعت کے مجموعی کام کے متعلق ایک رپورٹ بھیجی جائے گی۔
یہ رپورٹ آپ کو اس قابل بنا دے گی کہ آپ جماعت کے ایک فرد بن جائیں اور یہ محسوس کرنے
لگ جائیں کہ آپ ایک زندہ سماجی تنظیم میں ایک مقام رکھتے ہیں، لیکن ایک بات ان سرکاری
رپورٹوں میں درج نہیں ہو گی وہ یہ کہ تعلیمی مرکز فی الحقیقت ایک بہت بڑا کنبہ ہے، ہم آپ کو
بہت بڑی محبت سے خوش آمدید کہیں گے، بڑی دل سوزی اور ہمدردی کے ساتھ آپ کی دشواریاں
سمجھنے کی کوشش کریں گے، آپ کے استاد آپ کی رہنمائی کریں گے اور پوری تندہی کے ساتھ آپکی
مدد کریں گے، یہ بات نہ بھولیے کہ اگر پیرس میں آپ کا آنا ہو تو آپ کے استاد آپ سے
مل کر خوش ہوں گے" اس ذاتی اپیل کے بعد امیدوار سے درخواست کی جاتی ہے کہ مرکز کے قائم
کردہ خیرات فنڈ میں حصہ لے، جو بچوں کی سیاحت، تپ دق کی روک تھام اور سرطان کی تحقیق پر
خرچ کیا جاتا ہے۔

کیا یہ الفاظ ان کڑی ہدایات اور سخت انتباہات کے اثر کو زائل کر سکتے ہیں جو ہر امیدوار کو
پہلے ہی دن موصول ہو جاتی ہیں ؟ فرانسیسی طلبہ ان ہدایات کی درشتی سے گھبراتے نہیں کیونکہ
انہیں مدرسہ کی زندگی نے کڑے ضبط کا عادی بنا رکھا ہوتا ہے، ایک اوسط امیدوار ہر قسط کے
متعلق ضروری ہدایات کو غور سے پڑھتا ہے، کیونکہ اسے امتحان پاس کرنا ہوتا ہے لیکن

مادام کے خط اور دوسرے اساتذہ کی خط وکتابت کے ذاتی حصوں کو وہ عموماً دیکھتا تک نہیں۔

ہر قسط کے خاتمہ پر جن سوالوں کا جواب دینا ہوتا ہے وہ دو حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلے حصے کے سوالوں کا جواب ہر امیدوار کو دینا پڑتا ہے، دوسرے حصے کے سوال اختیاری ہوتے ہیں مخصوص عذر رکھنے والے طلبہ ان میں سے بعض سوالوں کو چھوڑ سکتے ہیں، مرکز کے اساتذہ ہر ہفتہ کے خاتمہ پر الگ الگ جلسہ منعقد کرتے ہیں جس میں پیرس میں رہنے والے یا باہر سے آئے ہوئے طلبہ شرکت کرتے ہیں اور اپنی اپنی مشکلات پیش کرکے انہیں رفع کراتے ہیں۔

ہر امیدوار کو مرکز کی جاری کردہ ہدایات کی سختی سے پابندی کرنا پڑتی ہے۔ اگر مرکز کو اس امر کا ذرا بھی ثبوت مل جائے کہ کسی ہدایت کو نظرانداز کیا گیا ہے تو امیدوار کا پرچہ قبول نہیں کیا جاتا۔ اور اس کی ساری محنت اکارت جاتی ہے۔ تاہم وہ امیدوار جو بیماری کے باعث لکھنے سے معذور ہوں وہ اس تعزیر کے خوف سے بالا ہیں، ان کے لیے اتنا کافی ہے کہ پرچے کے ہمراہ ایک خط میں اپنی معذوری کی نوعیت ظاہر کردیں۔

معذور امیدواروں کو مادام کی طرف سے جو خط ملتا ہے اس میں یہ الفاظ ہوتے ہیں:—

ہم ایک دوسرے سے خواہ کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں ہم اعتماد اور ہمدردی کے ماحول میں کام کرنے کے قابل ہو جائیں گے نہیں ہر وقت یہ اختیار حاصل ہے کہ ایک خط کے ذریعہ اپنی مشکلات بیان کرو اور مشورہ حاصل کرو۔ میں ان تمام امیدواروں کو جو بیمار ہیں یا محنت مزدوری پر مجبور ہیں یا حالات سے دوچار ہیں یقین دلاتی ہوں کہ وہ اُستادوں کی دوستانہ مدد پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ میں تمام خطوں کے جواب دوں گی جو مجھے لکھے جائیں گے۔ مجھے ان امیدواروں سے ملاقات کرکے بھی خوشی ہوگی جو بدھ کی شام کو مرکز میں آئیں گے۔

ڈاک کے نصاب کے ساتھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی امداد سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ اس غرض کے لیے مرکز اپنی نشریات سے بھی کام لیتا ہے اور دوسرے ریڈیو اسٹیشنوں کی خدمات بھی حاصل کی جاتی ہیں مثلاً انگریزی کے نصاب میں بی۔بی۔سی کے پروگراموں میں جگہ حاصل کی جاتی ہے۔

…یت ایک بوجھل تعلیمی نصاب میں خوشگوار تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔

…حبشیوں کی تعلیم

…نارتھ کیرولائنا کے یونیورسٹی چھاپہ خانہ سے ایک تازہ کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے "حبشی …ں کے مدرسے" یہ کتاب پروفیسر ہیری ۔ ایس ۔ ایش مور نے لکھی ہے، کتاب کے آغاز میں پروفیسر …نے لکھا ہے:۔ امریکی روایات میں سب سے قابل تعریف چیز امریکیوں کا تعلیم میں عملی اعتقاد ہے …کے لیے اس قوم میں بے پناہ جذبہ ہے۔ اڑتالیس ریاستیں، کروڑوں ڈالر اس پر خرچ کرتی …لڑکے اور لڑکیاں جو وہی ملازمت اختیار کر کے تعلیم کے اخراجات ادا کرتے ہیں، "ٹائم" جیسے …رسالے باقاعدہ اپنے صفحات تعلیمی موضوعات کے لیے وقف کر کے تعلیم میں عوامی اعتقاد کی …کرتے ہیں، اس طرح ہر ہفتے درمیانہ طبقہ کے امریکی قارئین کے سامنے یہ عقیدہ پوری وضاحت …تھ پیش کیا جاتا ہے کہ جمہوریت کے بقا کی ضروری شرط تعلیم ہے۔

…تاہم اس عملی عقیدہ میں ایک خلا بھی موجود ہے، ہر ملک کی طرح امریکہ میں بھی پہلے اور …سے درجہ کے شہری موجود ہیں۔ حبشی کو تعلیم بطور ایک ناقابل انکار شہری حق کے میسر نہیں۔ ۱۸۹۶ء …نامی ایک شخص نے جس کی رگوں کے خون کا آٹھواں حصہ حبشی خون تھا، سپریم کورٹ کے سامنے …ں کی علیحدہ تعلیم کے خلاف چارہ جوئی کی تھی، اس نے عدالت کے سامنے امریکی دستور اساسی …دفعہ کا واسطہ دیا تھا جس کی رو سے تمام امریکی شہریوں کو یکساں مواقع کا یقین دلایا گیا ہے …ورٹ نے اسے یہ جواب دیا تھا کہ حبشی الگ مدرسوں میں تعلیم پا کر بھی یکساں تعلیم حاصل کر سکتے …س وقت سے لے کر اب تک حبشی لگاتار اس عدالتی چارہ جوئی میں لگے رہے ہیں کہ پالیسی کا مطالبہ …جائے اور حبشی اور گورے بچے ایک ساتھ مدرسوں میں پڑھیں، آخر حبشی کامیاب ہوئے، ۱۷ مئی …ء کو سپریم کورٹ نے اپنا وہ تاریخی فیصلہ دیا جس کی رو سے حبشیوں کی علیحدگی کے اصول کو قطعی …لعدم قرار دے دیا گیا۔

حبشیوں کی جدوجہد کا اصل آغاز امریکی خانہ جنگی کے بعد سے ہوتا ہے جب جنوبی ریاستوں …
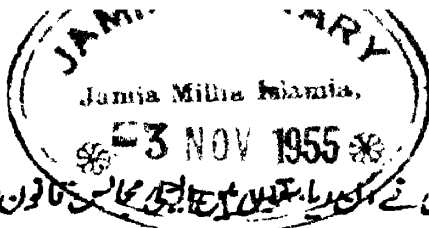
ہارموئی تو شمالی سپاہیوں کی سنگینوں نے الگ کر دیا تھیں ٹیلی مجالس قانون ساز قائم کرائیں جنہوں نے بیش کے لیے سرکاری مدرسے کھولے۔ ان مجالس میں گورے اور حبشی نمائندے ملے جلے تھے۔ اس سے حبشیوں کی امید بندھی لیکن ۱۸۷۷ء میں فیڈرل فوجیں واپس بلائی گئیں۔ جنوبی گوروں کو دوبارہ اقتدار حاصل ہوگیا۔ اگلی چند دہائیوں میں انہوں نے حبشیوں کو کلی طور پر حق رائے دہی سے محروم کر دیا۔ حبشی سرکاری صرف نام کو رہ گئے۔ اس صورت حال کے خلاف احتجاج کرنے والی اکیلی آواز مشہور حبشی عالم بکر ٹی واشنگٹن کی ہے۔

پہلی عالمی جنگ نے حبشیوں کو نئی امید دلائی۔ صدر ولسن دنیا کی ساری قوموں کے لیے حق خود ارادیت پرچار کر رہے تھے۔ اس لیے خود امریکہ میں آبادی کے خاص حصے کی علیحدگی ایک احمقانہ فعل نظر آنے لگا۔ عالم نے جن رجحانات کو حرکت دی تھی بعد جنگ کی عالمی کساد بازاری نے ان کو تقویت دی۔ جمہوری نعرہ نئی شکل دی گئی۔ ۱۹۳۵ء میں ڈانلڈ مرے نامی ایک حبشی نے یونی ورسٹی آف میری لینڈ کے مدرسہ وکالت داخلہ کے لیے درخواست دی۔ یہ درخواست ٹھکرا دی گئی۔ اس واقعہ کے بعد طلبیی کا اصول دوبارہ زندہ کیا گیا یعنی حبشیوں کو الگ مگر یکساں تعلیمی سہولتیں ملنی چاہئیں۔ ڈانلڈ کی طرح کے اور کئی واقعات پیش آئے۔ آخر کئی ریاستی یونی ورسٹیوں نے اپنی گریجوایٹ جماعتوں کا داخلہ موزوں قابلیت کے حبشیوں کے لیے کھول دیا۔ ۱۹۵۲ء تک حالت یہاں تک پہونچی کہ الاباما۔ فلوریڈا۔ جارجیا۔ مس سس پی اور جنوبی کی ریاستوں کو چھوڑ کر حبشی باقی تمام ریاستی یونی ورسٹیوں کی گریجوایٹ جماعتوں میں داخل ہو سکتے تھے۔

حبشیوں کو برابری دلانے میں ایک اور بات کو بھی بڑا دخل حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ پہلی عالمی جنگ کے بعد حبشیوں کی بھاری تعداد جنوب سے اٹھ کر شمال میں آنے لگی، جو حبشی شکاگو، منیاپولس اور دوسرے شہروں کی تنگ گلیوں میں آ بسے، انہوں نے فوراً دیکھا کہ وہ حق رائے دہی کے مالک ہیں اور سیاست ووٹ مانگنے کے لیے ان کے پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں۔ نیز جب حبشیوں کی غلیظ بستیاں ان بڑے شہروں کے لیے خطرہ بننے لگیں تو لکھ پتی امیروں اور اداروں نے ان کے لیے مدرسے قائم کرنے شروع کیے۔ فورڈ فاؤنڈیشن اور اس قسم کے دوسرے اداروں نے ان کے لیے بڑے بڑے تعلیمی پروگرام بنائے

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ھی تعلیمی رسالے ھیں۔ جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ھے۔

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں۔ جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں۔

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں۔ ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ھے۔

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھہ روپیہ (انگریزی) اور چھہ روپیہ (اردو) ھے۔ جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئے۔

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں۔

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل / اموزش

۲ کچہری روڈ۔ لاھور (پاکستان)

ماره ۷] لاهور [۱ اکتوبر

اس شمارہ میں

محرر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم - اے - مخدومی

معاونین { عبدالغفور چوهدری
فضل احمد

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

اکتوبر ۱۹۵۵ء

[ج]لد ——— ۸

[ش]مارہ ——— ۷

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی۔ خالد۔ پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

ادارِیہ

ایم۔ اے۔ مخدومی

صنعت کار اور سائنس کی تعلیم

پچھلے دنوں جنیوا میں ایٹمی سائنس دانوں کی جو عالمی کانفرنس ہوئی اس نے دنیا کو یہ چونکا دینے والا پیغام سنایا کہ ایٹمی دور جو اب شروع ہو رہا ہے موجودہ صنعتی دور سے اسی قدر مختلف ہوگا جس قدر موجودہ دور از منہ وسطیٰ سے مختلف ہے، اس کے ساتھ ہی پسماندہ ملکوں کو یہ مژدہ سنایا گیا کہ ان کے لیے یہ بالکل ممکن ہے کہ موجودہ پست معیشت سے نکل کر یک لخت ایٹمی دور میں داخل ہو جائیں اور اس طرح صنعت میں بہت آگے بڑھے ہوئے ملکوں کی صف میں جا ملیں۔

لیکن ایٹمی قوت کو رام کرنے اور اس سے معاشی خدمت لینے کے لیے ماہر سائنس دانوں کی ایک بہت بڑی جماعت کی ضرورت ہے، سائنسی تحقیق کے میدان میں پسماندہ ملک عموماً جس رفتار سے چل رہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو ملک صنعتی دوڑ میں سب سے آگے ہیں وہ ایٹمی دوڑ میں بھی اپنی برتری قائم رکھ سکیں گے، چند ہفتے گذرے برطانوی پارلیمنٹ میں سائنس دانوں کی ناکافی بہم رسانی کے مسئلہ پر جو بحث ہوئی وہ اس ضمن میں بڑی سبق آموز ہے، یکے بعد دیگرے ہر خیال کے اراکین پارلیمنٹ نے حکومت کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی کہ سائنس دانوں کی مانگ بے حد بڑھ چکی ہے لیکن ان کی بہم رسانی کے موجودہ انتظامات اس ضرورت کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔

بحث میں بعض ایسے حقائق بھی منظر عام پر آئے جن میں ہمارے لیے بہت بڑا سبق ہے مثلاً یہ بتایا گیا۔ کہ سائنس دانوں کی کمی کی اصل وجہ یہ نہیں کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پہلے سے کم طلبہ سائنس پڑھنے لگے ہیں، سائنس پڑھنے والے طلبہ کی تعداد اب پہلے سے کافی زیادہ ہے۔ کمی کا اصل سبب یہ ہے کہ صنعت کار سائنس دانوں کی خدمات سے پہلے کی نسبت بہت زیادہ فائدہ اٹھانے لگے ہیں۔ ان خدمات کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے وہ پُرکشش معاوضے پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جہاں سائنس کے

ایک گریجوایٹ کو معلمی میں خاص الاؤنس مل ملا کر کل ۹۴۱ پونڈ ملتے ہیں وہاں صنعت میں اسے کم سے کم ۱۴۲۷ پونڈ مل جاتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی ایک ہزار برطانوی سائنس ماسٹر معلمی چھوڑ کر صنعت میں جا چکے ہیں۔

ایٹمی دور میں آبرومند زندگی گذارنے کے لیے ہمیں سائنس دانوں کی جس قدر ضرورت ہے وہ ظاہر ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ہم سائنسی ترقی کی ساری ذمہ داری بھی حکومت پر ڈال دیتے ہیں۔ اس سے غالباً کسی کو انکار نہیں کہ قیام پاکستان کے بعد تدریسی سائنس کے لیے پہلے سے زیادہ سہولتیں بہم پہونچائی گئیں۔ سائنس کے گریجوایٹوں کو مدرسوں کی طرف کھینچنے کے لیے انہیں خاص الاؤنس دیا گیا لیکن سائنس کی تعلیم میں صحیح کشش اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب سائنس پڑھے ہوئے نوجوانوں کی مانگ اور ان کی اجرتوں میں ہر جگہ اضافہ ہو۔ سرکاری نوکریاں لامحالہ محدود ہیں۔ حکومت سائنس کی حوصلہ افزائی کے معاملے میں پہل کر سکتی ہے، لیکن اس کے بعد یہ کام زیادہ تر صنعت کاروں کے کرنے کا ہے، جب تک پاکستانی صنعت کار سائنس سے وسیع پیمانہ پر کام لینا نہیں سیکھتے اس وقت تک ملک میں ماہر سائنس دانوں کی وہ بڑی جماعت پیدا نہیں ہو سکتی جس کا وجود ایٹمی دور میں ہر ترقی پسند ملک کے لیے ضروری ہے، امریکہ اور برطانیہ میں سائنس اور ٹکنالوجی کے میدانوں میں آئے دن جو معرکتہ الآرا پیش قدمی ہوتی رہتی ہے، اس میں صنعت کاروں کی سرپرستی کو بہت بڑا دخل ہے۔ ہمارے مدرسے اور کالج سائنس کی تعلیم پر لاکھ زور دیں اگر ان کی پیداوار کی مانگ صنعت کاروں کے ہاں نہیں تو ان کی کوششیں ادھوری رہیں گی، موجودہ دور میں سائنس قومی زندگی کے لیے خون بدن کا درجہ رکھتی ہے، اس لیے جہاں ہم مدرسوں اور کالجوں سے درخواست کریں گے کہ وہ اس مضمون کی تدریس پر زیادہ سے زیادہ توجہ دیں وہاں ہم نوخیز پاکستانی صنعت کاروں سے بھی پرزور اپیل کریں گے تاکہ وہ سائنس دانوں کی خدمات سے فائدہ اٹھانا سیکھیں، اس میں خود ان کا اپنا بھی بھلا ہے اور ملک کا بھی ⁂

برطانوی ٹریننگ کالج

فضل احمد

۱۹۴۴ء کی مشہور میک نائر رپورٹ کے بعد برطانوی ٹریننگ کالج میں اہم تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، آج ان کی تعداد اس وقت سے بہت زیادہ ہے۔ دس برس گذرے بورڈ آف ایجوکیشن کے منظور کردہ ٹریننگ کالج تعداد میں ۸۳ تھے۔ آج ان کی گنتی ۱۴۷ کو پہونچتی ہے تعداد کے اضافہ کے ساتھ انتظامی جماعتوں کی نوعیت میں بھی اہم تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ ۱۹۴۴ء کے ۸۳ ٹریننگ کالجوں میں سے ۵۴ کالج پرائیویٹ انجمنوں کے قائم کردہ تھے۔ ان میں سے بیشتر مذہبی جماعتیں تھیں۔ صرف ۲۹ کالج ایسے تھے جو مقامی تعلیمی محکموں کے قائم کردہ تھے۔ آج پرائیویٹ کالجوں کی پہلی تعداد بدستور باقی ہے۔ لیکن مقامی تعلیمی محکموں کے بنا کردہ کالج ۲۹ کی بجائے ۸۳ ہیں ان کی تعداد میں تقریباً تین گنا اضافہ ہو چکا ہے۔

مقامی تعلیمی محکموں کے نئے کالجوں کی بیشتر تعداد عام نوعیت کی ہے، لیکن ان میں سے تین ایسے ہیں جو ٹیکنیکل استادوں کو تربیت دیتے ہیں۔ ۱۹۴۴ء میں ایسا کوئی ٹریننگ کالج موجود نہ تھا۔ پانچ کالج گھریلو سائنس کے استادوں کو تربیت دیتے ہیں اور پانچ کالج تربیت جسمانی کے لیے استانیاں تیار کرتے ہیں۔ عام کالجوں میں سے اکثریت زنانہ ٹریننگ کالجوں کی ہے مردانہ ٹریننگ کالجوں کی تعداد صرف سولہ سے بڑھ کر اٹھارہ ہوئی ہے۔ لیکن مقامی تعلیمی محکموں کے ٹریننگ کالجوں نے مخلوط تربیتی اداروں کی تعداد دو چند کر دی ہے۔ ۱۹۴۴ء میں ایسے تربیتی اداروں کی تعداد صرف سات تھی لیکن اب سولہ ہے۔

تعداد طلبہ:۔ ٹریننگ کالجوں میں تعداد طلبہ بھی پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ یہ بات ناگزیر تھی کیوں کہ کالجوں کی تعداد پہلے سے کچھ کم دوگنا ہوئی ہے۔ لیکن زیر تربیت اساتذہ کی تعداد اڑھائی گنا

ہو چکی ہے۔ پہلے یہ تعداد دس ہزار تھی اب پچیس ہزار ہے۔ اب تھوڑی تعداد کے طلبہ والے کالج رہ گئے ہیں، پہلے ۸۱ کالج ایسے تھے جن میں تعداد طلبہ سو سے کم تھی، اور ۴۰ ایسے جن میں ۵۰ سے کم۔ آج سو سے کم طلبہ رکھنے والے کالجوں کی تعداد صرف بارہ ہے اور ۱۵۰ سے کم طلبہ رکھنے والوں کی تعداد ۴۷۔ آج اکثر کالجوں میں تعداد طلبہ ۱۵۰ اور ۲۵۰ کے درمیان ہے، جو بعض کالج ایسے بھی ہیں جن میں تعداد طلبہ ۲۵۰ سے بھی اوپر ہے۔

ٹریننگ کالجوں میں تعلیمی سہولتیں بے حد بڑھ چکی ہیں ۱۹۲۸ء میں ہیک ناٹر رپورٹ نے ان سہولتوں کی تصویر ذیل کے حسرت ناک الفاظ میں کھینچی تھی۔ ان کالجوں میں سے آدھے ایسے ہیں جن میں تجربہ گاہوں، سٹوڈیوں، کتب خانوں اور دار الصحت کے انتظامات ناکافی ہیں۔ آدھے سے زیادہ ایسے ہیں جن کے ہاں موسیقی کا کوئی کمرہ نہیں، ایک چوتھائی سے زیادہ ایسے ہیں جن کے یہاں اسمبلی ہال کتب خانے، لیکچر کے کمروں اور دار الطعام کا تسلی بخش انتظام نہیں۔ صرف ستائیس کالج ایسے ہیں جہاں طلبہ کے رہائشی کمروں میں مطالعہ کا انتظام ہے۔ آدھے سے زیادہ کالج ایسے ہیں جن میں رہائشی عملے کے لیے دو کمرے فی کس مہیا نہیں کیے گئے۔ کئی کالجوں میں نہانے دھونے کا انتظام ناکافی اور نا تسلی بخش ہے۔ کئی کالجوں اور ان کے ہوسٹلوں میں باورچی خانے اور ان کا سازوسامان پرانی وضع کا ہے"

ابھی یہ کہنا تو شاید مشکل ہے کہ یہ تمام خامیاں کلی طور پر دور ہو چکی ہیں۔ تاہم یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ پچھلے دس سالوں میں ٹریننگ کالجوں اور ان کے ہوسٹلوں کی عمارتوں، سازوسامان اور دوسری سہولتوں میں اتنی اصلاح اور توسیع ہو چکی ہے کہ ان کی زندگی میں بالکل انقلاب آ گیا ہے ان کالجوں کے ہوسٹل اب رہائشی ہال کہلانے لگے ہیں۔ نام کی یہ تبدیلی بذات خود پُر معنی ہے، اس تعمیر نو پر کوئی معمولی خرچ نہیں آیا۔ ۱۹۵۴ء کے خاتمہ تک بڑے بڑے تعمیری منصوبوں پر جو خرچ ہو چکا تھا اس کی میزان چون لاکھ پونڈ تھی اور بائیس لاکھ پونڈ کے نئے منصوبے شروع ہو نیوالے تھے۔ خرچ کی اس میزان میں وہ گیارہ لاکھ پونڈ کا خرچ شامل نہیں جو ہنگامی ٹریننگ کالجوں پر خرچ ہوا تھا۔

ان میں سے کئی کالج اب مستقل ٹریننگ کالجوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

ٹریننگ کالجوں پر عام تبصرہ کرتے ہوئے میک ناٹر رپورٹ نے کہا تھا کہ ان کالجوں کی سب سے بڑی خامی ان کا افلاس ہے جو باقی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ آج یہ بات نہیں کہی جا سکتی، نہ صرف یہ کہ ان کالجوں کی مستقل املاک پر جی کھول کر خرچ کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کے مالی مصارف کے لیے بھی پہلے سے بہت بہتر انتظامات کیے گئے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے وزارت تعلیم پرائیویٹ کالجوں کو پہلے کی طرح زر اعانت دینے کی بجائے وہ تمام اخراجات دینے لگی ہے جو طلبہ کی پڑھائی اور رہائش پر ہوتے ہیں۔ اب طلبہ سے پڑھائی کی کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ مقامی تعلیمی محکمے جو ٹریننگ کالج چلا رہے ہیں ان کے اخراجات وزارت تعلیم اور تمام مقامی تعلیمی محکمے مل کر ادا کرتے ہیں، یہ اسی صورت حال کا نتیجہ تھا کہ کالجوں کی تعداد میں یک دم اضافہ ہو گیا۔

مزید نصاب:— ٹریننگ کالجوں میں پیش کیے جانے والے نصابوں میں بھی بہت وسعت آگئی ہے ۱۹۳۸ء میں ۸۳ کالجوں میں سے ۷۰ سے اوپر ایسے تھے جو دو سالہ نصاب پیش کرتے تھے بعض کالج چیدہ چیدہ طلبہ کے لیے تیسرے سال کے نصاب کا اہتمام بھی کرتے تھے، یہ نصاب عموماً خاص مضامین مثلاً تربیت جسمانی، دستکاری، موسیقی یا آرٹ میں خاص قابلیت بہم پہنچانے کے لیے پیش کیے جاتے تھے، بعض کالجوں میں طلبہ تین سال کا نصاب پورا کر کے یونیورسٹی کی ڈگری بھی حاصل کر سکتے تھے۔ آج حالت یہاں تک بدل چکی ہے کہ عام نوعیت کے ۱۰۹ ٹریننگ کالجوں میں سے صرف ۲۵ ایسے ہیں جو محض دو سالہ نصاب پیش کرتے ہیں، ۵۹ کالج (یعنی آدھے سے زیادہ) ایسے ہیں جو زیادہ پختہ طلبہ کے لیے ایک سالہ نصاب بھی پیش کرتے ہیں، ۲۹ کالج ایسے ہیں جو گریجوایٹ طلبہ کو ایک سالہ نصاب پیش کرتے ہیں ۱۲ کالج تیسرے سال کا زائد نصاب بھی پیش کرتے ہیں، چھ کالج گھریلو مضامین میں سہ سالہ نصاب مہیا کرتے ہیں، ایک کالج تربیت جسمانی میں سہ سالہ نصاب پیش کرتا ہے۔ اور ایک کالج مرد استادوں کے لیے دستکاری کا ایک سالہ نصاب پیش کرتا ہے، ۳ کالج ایسے ہیں جو تین یا تین سے زیادہ قسم کے نصاب پیش کرتے ہیں۔

دہ سالہ نصاب کی ہیئت بھی بدل گئی ہے۔ نصاب کے مضامین پہلے دو حصوں میں منقسم ہوتے تھے یعنی پیشہ ورانہ اور عام، اب ان کی تقسیم لازمی اور خصوصی مضامین میں ہو گئی ہے اول الذکر کا لینا ہر ایک کے لیے ضروری ہے۔ مؤخرالذکر میں سے ہر طالب علم ایک یا دو مضامین لیتا ہے اور ان کا خوب گہرا مطالعہ کرتا ہے، نصاب کے طریقوں اور قدر و قیمت کی جانچ کے طریقوں کے متعلق بہت سا تجرباتی کام ہو رہا ہے، ٹریننگ کالجوں کی مجلسی زندگی اب پہلے سے زیادہ خوش گوار اور آزاد ہے، طلبہ کو اس زندگی کے نظم و نسق میں اب کافی ذمہ داری حاصل ہے۔

میک نائر رپورٹ نے ایک اہم سفارش یہ کی تھی کہ ملک کے مختلف حلقوں میں توفیقی تنظیمیں قائم ہوں جن میں اس حلقے کے ٹریننگ کالج، یونی ورسٹی اساتذہ کے نمائندے اور تعلیمی محکموں کے نمائندے شامل ہوں۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۹ء میں تنظیمیں قائم ہو چکی ہیں۔ یہ غالباً اہم ترین تبدیلی ہے جو ٹریننگ کالجوں کے نظام کار میں واقع ہوئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تربیت اساتذہ کے متعلق ہر سوال کا فیصلہ کرنا اب ایک ایسی ملک گیر تنظیم کے ہاتھ میں ہے جو تعلیمی میدان میں کام کرنے والے تمام عناصر پر مشتمل ہے۔

عام معیار:۔ ٹریننگ کالجوں میں داخل ہونے والے طلبہ کی تعداد میں جو بھاری اضافہ ہوا ہے اس سے بعض لوگوں کے دلوں میں قدرتی طور پر یہ ڈر پیدا ہو گیا ہے کہ نئے تربیت یافتہ استادوں کی قابلیت کا عام معیار گر جائے گا۔ یہ خیال بہت عام ہے کہ جو امیدوار اب ان کالجوں میں داخل ہو رہے ہیں وہ خوبی کے اعتبار سے زمانہ قبل از جنگ کے امیدواروں کے ہم پلہ نہیں، تاہم اس خیال کی تائید کے لیے کوئی ثبوت موجود نہیں۔

کالجوں کے پرنسپل، پروفیسر تعلیمی انسٹی ٹیوٹوں کے ڈائرکٹر، ملک معظم کے انسپکٹر مدارس وزارت تعلیم، محکمہ تعلیم کے بڑے بڑے افسر، مقامی تعلیمی محکموں کے حکام اور استادوں کی انجمنوں کے نمائندے سب کے سب اظہار رائے میں بڑے محتاط ہیں، لیکن ان سب کی رائے یہ ہے کہ نئے استاد خوبی کے اعتبار سے زمانہ قبل از جنگ کے مقابلہ میں یقینی طور پر بہتر ہیں اور

دن بدن زیادہ بہتر ہو رہے ہیں بعض کی رائے میں یہ ترقی زیادہ تر پچھلے دو ایک سالوں میں ہوئی ہے، اس کی وجہ بے شک مدرسے کی وہ بہتر اور زیادہ پرسکون زندگی ہے جو ملازمت میں نئے آنے والوں کو میسر ہوئی ہے

چھپے اور برُے :- استادوں کی خوبی میں عام ترقی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قابلیت، ذاتی جوہر اور ذاتی اوصاف کے لحاظ سے سب استاد ایک ہی سطح پر ہیں، ان تمام امور میں اختلافات کی حد بہت وسیع ہے، اگر ایک تہائی وہ متعلم ہیں جو امتیازی ڈگری حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں (ان میں سے بعض تیسرا سال لگا کر آنرز ڈگری لے بھی لیتے ہیں) تو دوسری قسم ایسے بھی ہیں جنھوں نے جوں توں کر کے جنرل سارٹیفکیٹ آف ایجوکیشن کے امتحان میں پانچوں مضامین میں مشکل کامیابی حاصل کی ہو جعض ٹریننگ کالج ایسے بھی ہیں جو اس قابل ہیں کہ داخلہ کے لیے آنے والے آٹھ امیدواروں میں سے سات کو ٹھکرا دیں، لیکن دوسری طرف ایسے کالج بھی ہیں جو ہر اس امیدوار کو داخل کر لیتے ہیں جو آجائے، کیوں کہ اس کے بغیر ان کے پاس تعداد طلبہ پوری نہیں ہو سکتی۔ ایک ٹریننگ کالج ایسا بھی ہے جس میں داخل طلبہ میں سے کچھ نے یونی ورسٹی میں داخلہ اس لیے پسند نہیں کیا کہ وہ مزید پڑھائی میں تین لمبے سال صرف نہیں کرنا چاہتے تھے۔

برطانوی ٹریننگ کالجوں میں داخل ہونے والے طلبہ کس قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور وہ استاد کیوں بننا چاہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب اگر ایک جملے میں دیا جا سکتا ہے تو وہ یہ کہ یہ سب کے سب ایسے لوگ ہوتے ہیں جو کم آمدنی والے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک کالج میں جہاں ایک سو پندرہ طلبہ داخل تھے، والدین کی آمدنیوں کا پتہ کیا گیا تو یہ ۲۰۰ پونڈ سالانہ سے لے کر ۹۰۰ پونڈ سالانہ کے درمیان درمیان پائی گئیں، لیکن صرف پندرہ طلبہ ایسے تھے جن کے والدین کی سالانہ آمدنی ۵۰۰ پونڈ سالانہ سے اوپر تھی۔ اسی طرح ایک اور کالج کے متعلق اعداد و شمار کا مطالعہ کیا گیا، یہ کالج جس علاقے میں تھا وہ پہلے علاقے سے بالکل مختلف تھا، امیدواروں کی اکثریت ایسے گھرانوں سے آئی تھی جن کی سالانہ آمدنی ۳۰۰ پونڈ سے لے کر ۵۰۰ پونڈ تک تھی گنتی کے چند امیدوار ایسے تھے جن کے والدین ۹۰۰ پونڈ سالانہ سے زیادہ کماتے تھے۔

مالی لحاظ سے باقی ٹریننگ کالجوں کے طلبہ کی حالت بھی یہی ہے۔

معلمی کا پیشہ اختیار کرنے کے لیے طلبہ آج بھی وہی وجوہ رکھتے ہیں جو زمانہ قبل از جنگ میں رکھتے تھے، استانیاں عام وجہ یہ بتاتی ہیں کہ انہیں بچوں کے ساتھ غیر معمولی انس ہے، وہ استانیاں یہ وجہ زیادہ خصوصیت کے ساتھ بیان کرتی ہیں جن کا ارادہ زیادہ چھوٹے بچوں کو پڑھانے کا ہو، مرد با یہ وجہ کم بیان کرتے ہیں، ان کا ایک بہت عام جواب یہ ہے:- "میرا خیال تھا کہ معلمی میرے لیے حسب حال رہے گی" اس جواب کے پردے میں وہ غالباً کسی طرح کے تقاضے کو چھپانا چاہتے ہیں، مردوں میں اکثر یہ جواب بھی دیتے ہیں کہ انہیں معلمی میں اس لیے کشش محسوس ہوئی کہ یہ پیشہ انسان کو مزید مطالعہ کا موقع دیتا ہے، کئی استانیاں بھی یہ جواب دیتی ہیں، لیکن وہ استانیاں جنکی پسند چھوٹی جماعتوں کو پڑھانا ہو عموماً یہ جواب کم دیتی ہیں، ایک اور عام جواب یہ ہے کہ یہ پیشہ آدمی کو یہ موقع دیتا ہے کہ نئی پود کے کردار کی معیاری تعمیر کی جا سکے، اس طرح ایک عام جواب یہ بھی ہے کہ معلمی انسان کو مجلسی خدمت کے مواقع عطا کرتی ہے، مرد استادوں میں ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ انہوں نے معلمی کو اس لیے پسند کیا کہ یہ بڑا پیشہ ہے۔ زیادہ جرح کرنے پر بعض امیدوار کچھ اور اسباب بھی بیان کرتے ہیں۔

ٹریننگ کالجوں کے پرنسپل اکثر یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ معلمی ایک ایسا پیشہ ہے جس کی پسند ترقی کر سکتی ہے، اور یہ پسند زیر تربیتی زمانہ میں خصوصیت کے ساتھ ترقی پاتی ہے، بہت سے امیدوار خاص طور پر عورتیں جو داخلہ کے وقت اس پیشہ سے بے تعلق سی نظر آتی تھیں یا اس کے متعلق بہت کم سرگرمی رکھتی تھیں تربیت کے زمانہ میں بڑی دلچسپی اور سرگرمی اخذ کر لیتی ہیں۔ اور ان کی استعداد بہت بڑھ جاتی ہے۔ بیرونی ممتحنوں کی ایک جماعت نے اس معاملہ میں جو رائے ظاہر کی وہ بڑی دلچسپ ہے، ذیل میں مختلف ممتحنوں کی آراء کے اقتباس درج ہیں جو انہوں نے مختلف امیدواروں کے متعلق ظاہر کی ہیں۔

"اوسط درجہ کے طلبہ کا کام بھی قوت اور ہمت کا حامل ہے"۔ (نرسری اسکول)

"صدر معلم نے اس سرگرمی کی تعریف کی جس کے ساتھ نوجوان استادوں نے کام کیا، انہوں نے مدرسے اور بچوں کے معاملہ میں بڑی ذمہ داری کا اظہار کیا" (ابتدائی مدرسہ)

"بہت سے طلبہ نے قوت تخیل، جرأت عمل اور جذبۂ خطر پسندی کا ثبوت دیا" (جونیئر سکول)

"دوبارہ اس امر سے خوشی ہوئی ہے کہ قابل استادوں کی اتنی بڑی تعداد عنقریب مدرسوں میں جا کر کام سنبھالنے والی ہے" (ثانوی جدید مدرسہ)

صدر معلم تقریباً اسی قسم کے خیالات ان استادوں کے کام کے متعلق کرتے ہیں جو تربیت کے بعد نئے نئے ملازم ہوئے ہوں، مثلاً ایک صدر معلم کے الفاظ یہ ہیں:-

جو نوجوان استاد ہمارے پاس آتے ہیں وہ عموماً تدریسی طریقوں سے خوب واقف اور سرگرمی سے بھرپور ہوتے ہیں"

نئے استادوں کے متعلق جو شکایات بہت عام ہیں وہ یہ ہیں کہ اول انہیں اپنی آواز پر قابو حاصل نہیں اور بعض اوقات وہ جماعتوں کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکتے، دوسرے یہ کہ ان کا انداز گفتگو شستہ نہیں، تیسرے یہ کہ وہ درسی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں کے مطالعہ کا شوق نہیں رکھتے، اس لیے ان کا ذہنی افق محدود ہے۔ چوتھے یہ کہ وہ اپنے آپ اور اپنے کام پر تنقید کی نگاہ نہیں ڈالتے۔ ان خامیوں میں سے بعض ایسی ہیں جو نوجوانی اور خام طبعی کے ساتھ وابستہ ہیں اور بعض ایسی ہیں جن کی ذمہ داری ٹریننگ کالجوں پر ہے۔

خاص داخلہ:- داخلہ کے لیے جو تعلیمی قابلیت عموماً ضروری قرار دی گئی ہے اس کی عدم موجودگی میں بھی بعض طلبہ کو خاص حالتوں میں داخل کر لیا جاتا ہے، اس بارہ میں استادوں کی بعض جماعتوں نے خدشے کا اظہار کیا ہے لیکن یہ خدشہ بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔ خاص طور پر داخل کیے جانے والے طلبہ تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں اور اب ان کا تناسب متواتر گھٹتا چلا جا رہا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں ان کا تناسب ۷ء۷ فی صد تھا اور ۱۹۵۳ء میں ۲ فی صد۔ پھر ان کے انتخاب میں عام طلبہ کی نسبت بہت زیادہ احتیاط برتی جاتی ہے، وہ عمر میں بھی بڑے ہوتے ہیں، کالجوں کے پرنسپلوں کا کہنا ہے کہ ان کی

موجودگی باقی نو عمر طلبہ پر بہت اچھا اثر ڈالتی ہے۔ ملازمت میں داخلہ کے بعد ان استادوں کا جو مطالعہ کیا گیا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ بالکل ایسے ہی اچھے استاد ثابت ہوتے ہیں جیسے دوسرے استاد۔
اساتذہ :- اگر ٹریننگ کالجوں کے طلبہ کے متعلق کوئی عام بات کہنا مشکل تھا تو انہیں پڑھانے والے پروفیسروں کے متعلق کوئی عام نتیجہ اخذ کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ موسیقی، آرٹ، اور دستکاری وغیرہ جیسے خاص مضامین کو جز وی وقت پڑھانے والے استادوں کو چھوڑ کر ٹریننگ کالجوں کے دوسرے استادوں میں اکثریت ان کی ہے جنہیں مدرسوں میں پڑھانے کا لمبا تجربہ ہے۔ ان کی بڑی اکثریت گرامر اسکولوں سے آئی ہے۔ اگرچہ سابق پرائمری مدرس بھی ٹریننگ کالجوں میں موجود ہیں۔ اب ثانوی جدید اسکولوں کے استاد بھی ان کالجوں کے اسٹاف میں شامل ہو رہے ہیں۔ ٹیکنیکل کالجوں کے عملہ کی صورت استثنائی ہے، ان میں پڑھانے والے سب کے سب استاد ایسے ہیں جنہیں صنعتی کام کا تجربہ حاصل ہے۔
ان استادوں کی پیشہ ورانہ قابلیت ایک مقررہ معیار کے مطابق ہے۔ موسیقی۔ آرٹ دستکاری اور ورزش جسمانی کے اساتذہ اپنے خاص مضامین میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں۔ بہتیوں کے پاس سیکنڈ کلاس آنرز ڈگری ہے۔ مثلاً ایک کالج کے اسٹاف میں سولہ میں سے چار کے پاس فرسٹ کلاس آنرز ڈگری ہے اور بارہ کے پاس سیکنڈ کلاس آنرز ڈگری، یہ کالج اس معاملہ میں اکثر کالجوں سے زیادہ خوش نصیب ہے گو سب سے چوٹی پر نہیں۔ ایک کالج ایسا بھی ہے جس کے بارہ پروفیسروں میں سے سات آکسفورڈ اور کیمبرج کے گریجوایٹ ہیں۔ جو کالج ابتدائی استادوں کی تربیت کے لیے مخصوص ہیں یا جن میں اس نصاب کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، ان میں پڑھانے والے اکثر استاد نیشنل فروبل یونین کی اعلیٰ سند حاصل کیے ہوئے ہیں، ان کے بعض استادوں کے پاس عام مدریسی سند ہے۔
تمام ٹریننگ کالجوں میں ٹیوٹروں کی زیر نگرانی گروہی کام ہوتا ہے ٹیوٹروں میں سے ہر ایک کا طریق کار جداگانہ ہے، لیکن مجموعی طور پر اب طلبہ کو پہلے کی نسبت بہت زیادہ کام کرایا جاتا ہے۔ روایتی مثالی سبق اب بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ تاہم بعض کالج اب بھی اس کی تاثیر کے قائل ہیں بعض کالج خاص سبقوں کے لیے بچوں کے گروہوں کو کالج میں لاتے ہیں۔ کالجوں کے پروفیسر عموماً مدرسوں میں

ت کم تدریسی کام کرتے ہیں، ایک کالج ایسا ضرور ہے جہاں ہفتہ میں ایک بار متعلم اساتذہ اور پروفیسر
ے مدرسے میں جاتے ہیں اور سارا دن مل کر تدریسی کام کرتے ہیں۔

ٹریننگ کالجوں کے پروفیسر عموماً زیادہ حرکت نہیں کرتے بعض ایسے ضرور ہیں جو ترقی کے
انفع سے فائدہ اٹھانے کے لیے چند مرتبہ ادھر ادھر چلے جاتے ہیں اور بالآخر پرنسپل کا درجہ
صل کر لیتے ہیں بعض انسپکٹر بن جاتے ہیں اور چند ایک صدر معلم۔ اب صدر معلم بننے والوں کی تعداد بڑھتی
لوم ہوتی ہے۔ ایک بہت تھوڑی تعداد یونیورسٹی کے لکچرر کی بھی بن جاتی ہے۔ اکثریت ایسے لوگوں
ہے جو بہت کم اپنی جگہ چھوڑتے ہیں۔ علمی مضامین کے لکچراروں کی آسامیوں کے لیے مقابلہ
ب کرتا ہے۔ اگرچہ یہاں بھی سائنس اور ریاضی کے لکچرار کم ملتے ہیں، اسی طرح خانگی مضامین
ے استادوں کی کمی بھی ابھی دور نہیں ہوئی۔ جس آسامی پر کام کرنا سب سے زیادہ مشکل ہے، وہ
م التعلیم کے لیکچرار کی آسامی ہے، اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس کے لیے امیدواروں کی کمی ہے
ں میں کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ غالباً یہ صورت حال ہمیشہ اسی طرح رہے گی۔

ماب کے مضامین:— دو سالہ ٹریننگ نصاب کی تفصیلوں میں گو مختلف کالجوں کے درمیان اختلاف
ائے گا۔ لیکن اس نصاب کا عام خاکہ تقریباً ہر جگہ ایک سا ہے۔ ہر کالج کا نصاب تین قسم کے مضامین
کرتا ہے یعنی (۱) لازمی مضامین (۲) خصوصی مضامین اور (۳) تدریسی مشق۔ کئی کالجوں میں بعض
ید یا ذیلی مضامین بھی پیش کیے جاتے ہیں جن کی غایت بعض مخصوص ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔ بعض میں
گروہی نصابوں“ کا بندوبست بھی ہے اور چند ایک میں خصوصی مضامین کے اختیاری نصابوں کا بھی۔

لازمی مضامین کی تعداد دو سے نو تک ہے۔ یہ صورت حال اتنی ناتسلی بخش نہیں جتنی
اہر دکھائی دیتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ علم کی جس شاخ کو ایک کالج نے ایک مضمون قرار
ے رکھا ہے۔ دوسرے نے اسے دو تین یا چار حصوں میں بانٹ کر اتنے ہی الگ الگ مضامین کا نام دے
ا ہے۔ مثلاً ایک کالج نے علم التعلیم کو محض یہی ایک نام دے رکھا ہے تو دوسرے نے اسے
اموں یعنی اصول تعلیم اور ان کی عملی صورت ”تعلیم صحت“ اور جسمانی تعلیم کے ماتحت ظاہر کیا ہے۔ پھر
اگر ایک کالج نے صرف علم التعلیم اور انگریزی زبان ہی کو لازمی قرار دے رکھا ہے تو دوسرے کالج کے

لازمی مضمونوں کی فہرست میں ان دو مضامین کے علاوہ انگریزی ادب اور تقریری انگریزی، مذہبی تعلیم (ضمیر کے اجازت دینے کی شرط کے ماتحت) جسمانی تعلیم، آرٹ، دست کاری، طبیعی سائنس، ریاضی اور موسیقی بھی شامل دکھائی دیں گے۔ عام طور پر چھ یا سات مضامین لازمی ہوتے ہیں۔

جو مضمون تمام ٹریننگ کالجوں میں بلا استثنا لازمی ہے وہ علم التعلیم ہے۔ انگریزی زبان بھی اکثر کے ہاں لازمی ہے، لیکن تین کالج ایسے ہیں جنہوں نے اسے لازمی قرار نہیں دیا۔ پھر ایسے کالج بھی ہیں جو اسے پورے دو سال کے عرصہ کے لیے لازمی قرار نہیں دیتے۔ مقامی تعلیمی محکموں کے چند کالج اور پرائیویٹ انجمنوں کے سب کالج مذہبی تعلیم کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ بعض نے ریاضی اور بالخصوص حساب کو لازمی قرار دے رکھا ہے، اور کئی کالجوں نے ایک بنیادی نصاب جس میں مدرسے کے تمام مضامین آجاتے ہیں لازمی قرار دیا ہے۔

خاص مضامین کی اصل غایت متعلم استاد کی اپنی مزید تعلیم ہے۔ کالج عام طور پر سات سے بارہ خاص مضامین پیش کرتے ہیں، جن میں سے ایک کا لینا ضروری ہوتا ہے۔ بعض کالج دو خاص مضامین کا لینا لازمی قرار دیتے ہیں۔ بعض اوقات طالب علم کو اجازت ہوتی ہے کہ چاہے ایک خاص مضمون لے لے چاہے دو۔ یا شرط یہ ہوتی ہے کہ کم از کم ایک خاص مضمون ضرور لیا جائے۔ بعض صورتوں میں جہاں ایک سے زیادہ خاص مضامین لینے کی اجازت ہو، پسند کردہ خاص مضامین میں سے ایک لازمی ہوتا ہے۔ بعض کالج جو دو خاص مضامین کو لازمی قرار دیتے ہیں ساتھ یہ شرط لگا دیتے ہیں کہ ان میں سے ایک کا مطالعہ اعلیٰ سطح تک ہونا چاہیے اور دوسرے کا معمولی سطح تک۔ دو سالہ تربیتی نصابوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو دو سے زیادہ خاص مضامین کا مطالبہ کرتا ہو۔

جو مضامین خاص مضامین کی فہرست میں شامل ہیں، وہ تقریباً سب کے سب روایتی نصاب کے مضمون ہیں، اگرچہ ایک کالج نے اس فہرست میں "حرکت کا فن" دوسرے نے ناچ کی حرکات اور لندن کے ایک کالج نے "دیہی علوم" بھی شامل کر رکھے ہیں۔ زائد مضامین کی فہرست میں ایسے مضامین بھی ہیں جن کا تعلق مدرسے کے نصاب سے ہے اور ایسے بھی جن کا اس سے تعلق نہیں

آخری قسم کے مضامین میں کئی قسم کے ملے جلے شامل ہیں۔ مثلاً ایک کالج میں عہدِ حاضر کے معاشرہ" کا مطالعہ
شامل ہے جو پورے دو سال تک چلتا ہے اور سب طلبہ کے لیے لازمی ہے۔ ایک اور کالج میں
طلبہ خواہ "جان بچانے والی شاہی انجمن" کی سند کے لیے تیاری کریں اور خواہ "دلیری اور کھیلوں کے
استاد" کا نصاب پورا کرلیں۔ زاید مضامین کی فہرست میں عام طور پر جو دوسرے مضامین نظر آتے ہیں وہ یہ
ہیں :- بصری امدادیں۔ جذباتی تعلیم۔ خوش نویسی۔ تپلیوں کے کھیل۔ تھیٹر۔ مقامی مطالعہ۔ مذہب
فلسفہ اور غیر زبانیں، ان نصابوں کی لمبائی چند ہفتوں سے لے کر پورے دو سال تک ہے۔

گروہی مطالعہ :- گروہی مطالعہ جس کا دوسرا نام مجموعی اور مربوط نصاب بھی ہے نسبتاً ایک
نئی چیز ہے، یہ زیادہ عام نہیں کیوں کہ ابھی تجرباتی سطح پر ہے اور تمام لوگ اس کے قائل نہیں
اسے بیان کرنے کے لیے کئی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں، جن میں سے پروجیکٹ زیادہ عام
ہے۔ اگرچہ پروجیکٹ کی اصطلاح اس کی پوری ترجمانی نہیں کرتی تاہم اس کا طریق کار بہت کچھ
پروجیکٹ سے ملتا جلتا ہے، مسٹر سی۔ اے۔ رچرڈسن نے یونیسکو کی طرف سے انگلستان۔
فرانس اور ریاست ہائے متحدہ میں تربیت اساتذہ پر جو مقالہ تیار کیا ہے اس میں وہ گروہی مطالعہ
کا ذکر ان جامع الفاظ میں کرتے ہیں :-

طلبہ تحقیقی امور کا عملی مطالعہ کرتے ہیں، اس طرح وہ انسانی زندگی اور فطرت کے ان پہلوؤں سے
دوچار ہوتے ہیں جن کا ذکر رسمی مضامین میں نسبتاً مجرد صورت میں کر دیا جاتا ہے۔ اس کام سے قدرے
طریقہ ہائے تدریس کی مشق ہوتی ہے اور قدرے متعلم اساتذہ کی عام ذہنی تربیت کو ترقی ملتی ہے۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ طلبہ اس منصوبے کو بیک وقت دو ذہنی سطحوں پر مکمل کرتے ہیں، اول اپنی عمر
اور ذہنی پختگی کی سطح پر دوسرے ان بچوں کی ذہنی سطح پر جن کو انہیں پڑھانا ہے۔

رضاکارانہ لیے جانے والے نصاب تعداد میں بہت کم ہیں، تیسرے سال کے زائد نصاب توقع
سے کم ہیں۔ ان نصابوں کی سب سے زیادہ تعداد ذہنی تعلیم میں ہے، یہاں یہ گنتی میں آٹھ ہیں۔ اوسط
درجہ جسمانی تعلیم کا ہے جس کے نصابوں کی تعداد چھ ہے تیسرے درجے پر سائنس کے پانچ نصاب ہیں

دیہی علوم کے نصابوں کی گنتی چار ہے۔ جغرافیہ کی تین۔ ان کے علاوہ کوئی ایسا مضمون نہیں جس کے نصابوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہو۔

مدرسے کی مشق:۔ اس عملی کام کو بعض اوقات تدریسی مشق بھی کہا جاتا ہے، لیکن مدرسے کی مشق زیادہ درست اصطلاح ہے۔ یہ کام چند ایک مختلف عناصر پر مشتمل ہے (۱) مشاہدہ یعنی متعلم اساتذہ مدرسوں میں اس لیے جائیں کہ اس کی تنظیم۔ عام طریق کار اور طریقہ ہائے تدریس کو دیکھیں، بچوں کے طرز عمل کا نفسیاتی مطالعہ کریں (۲) نمونے کے اسباق کا مشاہدہ اور ان کا تنقیدی تجزیہ (۳) تدریسی مشق جب متعلم اساتذہ جماعت یا جماعتوں کی جزوی یا کلی ذمہ داری اختیار کرتے ہیں۔

مشاہداتی مطالعہ عموماً نصاب کے آغاز میں شروع ہو جاتا ہے۔ گو بعض اوقات ایسا نہیں بھی کیا جاتا تدریسی مشق کا ایک چھوٹا وقفہ پہلے سال کی تربیت میں آتا ہے اور ایک لمبا وقفہ دوسرے سال کے اختتام کے قریب۔ اس عملی کام کی صورتیں مختلف ہیں۔ مدرسے کی مشق کے متعلق وزارت تعلیم کے ضوابط اب باقی نہیں۔ اس کام کی نگرانی بھی حلقاتی تنظیموں کو سونپی جا چکی ہے۔ ان کی طرف سے عام پابندی صرف اس قدر ہے کہ دو مختلف وقفوں میں کم از کم بارہ ہفتے کی تدریسی مشق ہو۔

قدر و قیمت کا اندازہ:۔ طلبہ کے کام کی قدر و قیمت کا اندازہ کئی طریقوں پر کیا جاتا ہے۔ لیکن ہر صورت میں یہ اندازہ تین عناصر پر مشتمل ہوتا ہے (۱) تحریری امتحان کے پرچوں کی خوبی (ب) تدریسی مشق کی خوبی (ج) کالج کے دو سالوں میں کام کی عام خوبی۔ قدر و قیمت کے اندازہ میں جو فرق دیکھنے میں آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف کالج ان تینوں عناصر کو مختلف اہمیت دیتے ہیں یا ان عناصر کے مختلف پہلوؤں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ یہ بات کالج کے کام کے بارہ میں خصوصیت کے ساتھ درست ہے بعض حلقاتی تنظیمیں یا کالج تحریری مقالے کو خاص اہمیت دیتے ہیں یہ مقالہ ذاتی تحقیق و مطالعہ کی پیداوار ہوتا ہے، ہر طالب علم اپنے لیے کوئی موضوع چن لیتا ہے اور اس پر علمی نہیں علمی مقالہ تیار کرتا ہے بعض حلقاتی تنظیمیں اور کالج سارا بیرونی نصابی کام پر کرتے ہیں۔ اور یہ چیز تربیتی اداروں کے درمیان موضوع بحث بنی ہوتی ہے۔

نصاب کی یہ رسمی ہیئت جو کالجوں کے مطالعاتی بورڈوں اور پیشہ ورانہ بورڈوں نے مل کر وضع کی ہے اور حلقاتی تنظیموں نے منظور کی ہے، ابھی تجرباتی منزل پر ہے۔ ٹریننگ کالجوں کی

ام زندگی میں اور بھی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ابھی تجرباتی مگر بہت پُرقیمت ہیں ۔
بعض عام پہلو :۔ بہت سے کالج اس بات کا باقاعدہ اہتمام کرتے ہیں کہ بیرونی لوگ آکر لیکچر
یں۔ اسی طور پر موسیقی، ناچ اور ڈراما کی نمائش کا بندوبست بھی کیا جاتا ہے۔ کئی کالج اپنے طلبہ
د بیرونی لیکچر سننے، کھیل اور ناچ دکھانے لے جاتے ہیں اور بیرونی کتب خانوں، عجائب گھروں ۔
آرٹ گیلریوں، تاریخی مقامات اور قدرتی مناظر کی سیر کا بھی بندوبست کرتے ہیں۔ بعض کالج بیرونی
عملی تدریس کے مشاہدہ کا انتظام کرتے ہیں بعض براعظم یورپ کی سیاحت کا پروگرام پورا کرتے ہیں اور
ایک کالج ایسا بھی ہے جو یورپ کے ساتھ طلبہ کا تبادلہ بھی کرتا ہے۔ ان تمام سرگرمیوں کا جزوی انتظام
یا مکمل انتظام طلبہ خود کرتے ہیں، یہ کام طلبہ کی یونین کرتی ہے یا ان کی چند ایک تنظیمیں باہم مل کر انجام
دیتی ہیں۔ کالج یونین ابھی ایک نئی چیز ہے۔ اس لیے تمام کالجوں میں اس کا وجود موجود نہیں ۔
لیکن بعض کالجوں میں طلبہ کی یونین بہت طاقتور ہے اور بہت سی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہے ۔

اکثر کالجوں میں وقتاً فوقتاً طلبہ کے کام کی نمائش ہوتی رہتی ہے، ان نمائشوں میں بعض اوقات
ان مدرسوں کے بچوں اور استادوں کو دعوت دی جاتی ہے ۔ جہاں منظم اساتذہ مشق کرتے ہیں متعلم
اساتذہ کے والدین بھی بلائے جاتے ہیں، کئی کالج بچوں کو ڈرامے تیار کر کے دکھاتے ہیں، اس مقصد کے لیے
ایک کالج کھلی ہوا کا تھیٹر استعمال کرتا ہے۔ ایک کالج فلمیں تیار کرتا ہے، ایک کالج مقامی میونسپل کمیٹی
کے ساتھ تعلیمی مجلسی اور صحت عامہ کے کام میں سرگرم تعاون کرتا ہے، کئی کالج چھوٹے یا بڑے پیمانے پر
مجلسی مسائل کا جائزہ لیتے ہیں۔

کئی انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن ہر سال ایک ایسی تقریب کا اہتمام کرتے ہیں جس پر اس
حلقہ کے ٹریننگ کالجوں کے طلبہ اور اساتذہ یکجا ہو سکیں، اس کی صورت یہ ہے کہ بعض کسی
گرجے میں خاص دعا کا اہتمام کر لیتے ہیں بعض یونیورسٹی میں انسٹی ٹیوٹ کا دن منا لیتے ہیں، اس
پروگرام میں کئی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ جن میں وائس چانسلر کا خطاب بھی شامل ہوتا ہے ۔
غرض ہر انسٹی ٹیوٹ یہ کوشش کرتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کے حلقے کے تمام ٹریننگ کالج

ایک دوسرے کے متعلق با خبر رہیں، اس غرض کے لیے خبر نامے شائع کیے جاتے ہیں، طلبہ کی یونینوں کے ساتھ مراسم قائم کیے جاتے ہیں اور اس امر کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ طلبہ انسٹی ٹیوٹ کو دیکھنے آئیں۔ ایک حلقہ میں اس غرض کے لیے ایک فنڈ قائم کیا گیا ہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن نے تعلیمی دنیا میں اب تک جو کام کیا ہے اس سے ٹریننگ کالجوں کے طلبہ کی بجائے ان کے اساتذہ نے زیادہ اثر قبول کیا ہے، طلبہ میں سے بہتوں کو ابھی تک اس بات کا بہت دھندلا تصوّر ہے کہ انسٹی ٹیوٹ کے مقاصد کیا ہیں اور یہ کیا تعلیمی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

حرف آخر :- میک نائر رپورٹ نے آج سے دس گیارہ برس پہلے برطانوی ٹریننگ کالجوں کی جو تصویر کھینچی تھی اس کی ایک ہلکی سی جھلک اس کے ایک اقتباس میں دیکھی جا چکی ہے۔ پچھلی ایک دہائی میں ان کالجوں کی کایا جس طرح پلٹی ہے اس کی معمولی سی تفصیل اوپر کی سطروں میں پیش کی گئی ہے۔ ہم میں سے اکثر اس بات کے عادی ہیں کہ اپنے نظام تعلیم کی ساری خرابیوں کے لیے ملک کے انگریز حاکموں کو ذمہ دار گردانیں مگر حقیقت یہ ہے کہ خود برطانوی تعلیم میں سب سے بڑا انقلاب دوسری عالمی جنگ کے بعد آیا ہے، یہ انقلاب پیدا کرنے کے لیے برطانیہ نے تجرباتی طریقہ کو شعار بنایا ہے، کسی تعلیمی نظام کی اصلاح کے لیے صرف اتنا کافی نہیں کہ پرانی خرابیوں پر واویلا کیا جائے۔ بلکہ تعمیر کی اصل راہ وہ "آزمائش اور سہو" کا راستہ ہے۔ اصلاح حال کے لیے جراءت کے ساتھ مفید تجربے آزمائے جانے چاہئیں اور کامیاب تجربے مستقل طور پر اختیار کر لینے چاہئیں۔

اساتذہ کی سماجی اور مالی حیثیت

محمد عبدالعزیز سلسل نمبر۳

مدارس کے مالی وسائل کہا جاتا ہے کہ آج کل اساتذہ کی جو کانفرنس منعقد ہوتی ہے اس میں پہلے تو اصولوں پر بحث ہوتی ہے، لیکن اس کا اختتام مشاہرے کے مسائل پر ہوتا ہے، ہر محفل اور ہر مجلس میں کچھ اس قسم کی بحثیں ہوتی ہیں کہ اساتذہ کو بہت کم مشاہرہ ملتا ہے، یہ بحثیں بالعموم نجی ہوتی ہیں کیوں کہ اس ملک میں اساتذہ کی انجمنیں بہت ہی کم ہیں اور جو دو ایک صوبائی انجمنیں قائم بھی ہیں تو ان کا وجود اور عدم وجود برابر۔ سرکاری مدارس کا معلم تو ارباب تعلیم کے ڈر کے مارے اس کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا، دوسرے ممالک میں البتہ اس قسم کی انجمنیں بہر صورت سرگرم عمل ہیں، المختصر ان مذاکرات میں یہی کہا جاتا ہے کہ اگر اساتذہ کی تنخواہیں بڑھا دی جائیں تو نظام تعلیم کی ایک نہیں سیکڑوں خرابیاں دور ہو جائیں، یہ مفروضہ ایک حد تک صحیح ہے کیوں کہ اگر مدرس کو اس جھمیلے سے فرصت مل جائے تو وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں نجی معلمی کی بجائے قوم کے بچوں کی اصلاح و تربیت میں صرف کر سکتا ہے لیکن عملاً یہ نظریہ بھی اتنا نتیجہ خیز معلوم نہیں ہوتا، اس وقت ہمارے صوبے میں ثانوی مدارس میں پڑھانے والوں کو ان کے کام کا جو معاوضہ ملتا ہے وہ اتنا ناکافی ہے کہ اس سے ان کی گذر اوقات مشکل ہو جاتی ہے، مہینے کے شروع میں جب وہ اپنی آمدنی اور اخراجات کا میزانیہ تیار کرتے ہیں تو انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس قدر رقم اور میسر آ جائے تو پھر اخراجات پورے ہوتے نظر نہیں آتے۔ اس وقت مدرس کی مایوسی اور اس کا اضمحلال دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

اس طرح یہ تو ایک بدیہی بات ہے کہ اسے اپنے خاندان کی کفالت کے لیے آمدنی کے دوسرے وسائل کی طرف مجبوراً بھاگنا پڑتا ہے تاکہ وہ اپنی روزمرہ ضروریات کو تو پورا کر سکے۔ آمدنی کے ان مختلف وسائل میں نجی معلمی آسان ترین وسیلہ ہے، اور اساتذہ اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے اس طرف تیزی سے

بھاگتے ہیں کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن یہ بات ضرور غور طلب ہے کہ یہ نظریہ ایک عالمگیر شکل اختیار کر رہا ہے، یا اس کا تعلق محض ایک محدود طبقے سے ہے۔ لیکن اگر فی الواقع نجی معلمی کی خواہش بڑھتی جاتی ہے تو ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا ہوگا کہ یہ مناسب بھی ہے یا نہیں۔

مگر کیا آمدنی میں معتدبہ اضافے کے بعد اساتذہ کے عزت و احترام میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے، یہ ایک متنازعہ فیہ امر ہے اور اس کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ میرے سامنے ایسے اساتذہ کی بھی مثالیں ہیں جن کی آمدنی معقول اور وسائل و ذرائع اچھے لیکن پھر بھی ان کی سماجی حیثیت یہی کہ انہیں ہر مجلس میں صفِ آخر ہی میں جگہ ملتی، بلکہ میں نے تو یہ محسوس کیا کہ حصول زر کے سلسلے میں وہ اس قدر دیوانے ہو جاتے ہیں کہ معلمی کا رہا سہا وقار بھی باقی نہیں رہتا۔ میں نے والدین کے تعاون کے سلسلے میں جو دوسری مثال پیش کی اس میں میرے بچاؤ کا صرف ایک ہی پہلو تھا کہ میں کبھی ان سے ایک پیسے کا روادار نہیں ہوا، ورنہ شاید مجھے بھی یہی تلخ گھونٹ پینے پڑتے۔ یہ درست ہے کہ دوسرے محکموں اور پیشوں میں آمدنی کے وسائل و ذرائع لامحدود ہیں، بہتی گنگا میں لوگ اطمینان سے ہاتھ دھوتے ہیں، یہاں دولت کی وہ فراوانی نہیں اس لیے عزم و حوصلے والے اس پیشے میں آنے سے عمداً کتراتے ہیں، یہاں تو صرف تعلق کے راندے ہوئے اور دنیا کے ٹھکرائے ہوئے لوگ آتے ہیں، اور اگرچہ یہ بات بالکل تو نہیں لیکن ایک حد تک صحیح ہے کہ نہ ہم خود اپنی قدر کرتے ہیں اور نہ دوسروں سے اپنی قدر کرانا جانتے ہیں۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ معاشرہ استاد کے حقوق اور اس کی بلند و بالا شخصیت کا احترام نہیں کرتا تو اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم معاشرے سے اپنی عزت کا مطالبہ کب کرتے ہیں۔ ہم نے دوسروں کو کب اور کس وقت یہ محسوس کرایا کہ ہم بھی معاشرے کے رکن ہیں البتہ کہ ہماری حیثیت ایک اساسی رکن کی ہے، ہم تو خود پراگندہ روزی اور پراگندہ دل ہیں، نہ ہماری کوئی تنظیم ہے نہ ہم میں اخلاص و محبت۔ نہ مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت، پھر ہم کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ دوسرے ہماری عزت کریں، یہ تو ایک واہمہ، ایک سراب ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ ہماری معاشری زندگی میں یہ نقص صرف اساتذہ کے گروہ تک ہی محدود نہیں اس کا احاطۂ عمل بہت وسیع ہے، دوسرے طبقوں میں تو اس سے زیادہ گھناؤنے دردناک واقعات دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں۔ لیکن اس سے مدرس کے بد طینت ہونے کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں، اس کا مقام بہت اونچا ہے اور اسے اپنے مقام کی قدر کرنی چاہیے، میرے خیال میں اگر مدرسین کی پوری جماعت منظم طور پر اپنی عظمت و بلندی کے قائم رکھنے کا فیصلہ کر لے تو اسے دنیا کی کوئی طاقت اس سے محروم نہیں رکھ سکتی۔

انگلستان کی مثال

دوسرے ملکوں میں بھی مشاہرے میں اضافہ کے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں مثلاً پچھلے دنوں انگلستان میں اساتذہ کی مختلف انجمنوں نے زیادہ تنخواہ اور زیادہ الاؤنس کا مطالبہ کیا۔ برن ہم رپورٹ کے مطابق اساتذہ کے جو مشاہرے مقرر ہوئے یا مزید کام کرنے کے سلسلے میں انہیں جو الاؤنس ملے گا اس کی تفصیلات ہر مقامی تعلیمی حکومت خود طے کرے گی اساتذہ یہاں بھی تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن انہیں اس سے بھی انکار نہیں کہ ان کے پڑوسی جو دوسرے محکموں میں کام کرتے ہیں ان سے بہتر نہیں بلکہ ان کی مالی حالت بعض صورتوں میں زیادہ سنگین اور بدتر ہے۔ ان کے یہاں آج کل سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ مدارس میں دو قسم کے اساتذہ ہوتے ہیں ایک وہ جو اپنی مدرسی زندگی پر قانع ہو کر اس ماحول میں کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے عزائم کی دنیا، مدرسہ، طلبہ اور اس کا ماحول ہوتا ہے اور ان ہی کی فلاح و بہبود میں وہ اپنی ساری قوت صرف کر دیتے ہیں۔ دوسرا گروہ ان اساتذہ کا ہے جن کے حوصلے بلند اور جن کے جذبات میں تلاطم خیزی ہوتی رہتی ہے، وہ اپنی موجودہ حالت پر قانع ہو کر نہیں بیٹھتے بلکہ بہتر سے بہتر مواقع کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں اور جب انہیں کوئی اچھا اور نادر موقع مل جاتا ہے تو وہ اس پیشے کو ترک کر کے اس نئے ماحول کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں جس میں انہیں آگے بڑھنے کے بیشتر وسائل میسر آتے ہیں۔ انگریزی معاشرہ اساتذہ کی

اس تحریک کو غیر پسندیدہ تصور نہیں کرتا کیوں کہ اس طرح دوسرے محکموں کو زیادہ پڑھے لکھے، زیادہ سمجھ دار اور زیادہ اچھے کارکن مل جائیں گے، اس طرح وہ اپنی حالت کی بھی اصلاح کر لیتے ہیں اور اپنی ہمت و ساعی کی مثال پیش کر کے دوسروں میں بھی کام کرنے کا ولولہ پیدا کر دیتے ہیں اور یہ ایک بہت بڑی خدمت ہے جو اساتذہ کا یہ گروہ برطانوی معاشرے کے لیے انجام دے رہا ہے۔

برنہم کمیٹی نے اساتذہ کی تنخواہ اور مشاہرے کے متعلق جو رپورٹ پیش کی ہے اس کے مطابق مقامی تعلیمی حکومتوں کو اپنی اپنی تفصیلات اور تجویزیں ایک متعین وقت میں وزیر معارف کے پاس بھیجنی ہوں گی۔ لندن۔ مڈلسیکس اور دوال سال کی مجوزہ اسکیمیں شائع ہو چکی ہیں، ان کے اختلافات کے پیش نظر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وزیر معارف کو اس سلسلے میں سوچ بچار کے لیے ایک اچھی خوراک مل جائے گی۔ اساتذہ کے الاؤنس میں اس سے جو عظیم اختلاف پیدا ہوگا، اس کے نتائج کیا ہوں گے، اس کے متعلق ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا، لیکن صرف اس لیے کہ ہمارے سامنے دوسرے ملکوں میں اساتذہ کی مالی حیثیت اور ان کے ساجی وقار کا ایک مفصل خاکہ ہو تو نسبتاً اپنے حالات کے تجزیے میں آسانی ہوتی ہے۔ ہم اپنے حالات کو ان واقعات اور ان اسباب و علل کی روشنی میں کس طرح سدھار سکتے ہیں، چناں چہ یہاں برنہم کمیٹی رپورٹ کے مطابق لندن کی سفارشات کا ایک مختصر سا خاکہ درج ذیل ہے۔

۱۔ زیادہ اعلیٰ کام کرنے والے اساتذہ کے نئے اور زیادہ الاؤنس حسب ذیل اصولوں کے مطابق ہوں گے۔

تعلیم مزید کے پیریڈ	سالانہ الاؤنس
۵ - ۷	۷۵ پونڈ
۸ - ۱۱	۱۰۰ پونڈ
۱۲ - ۱۵	۱۵۰ پونڈ
۱۶ یا اس سے زیادہ	۱۷۵ پونڈ

۲۔ ایک ایسے مدرسے میں جہاں صرف دو درجے میں داخلے کی گنجائش ہے ان میں سے ان اساتذہ کے الاؤنس کی شرح ڈیڑھ سو پونڈ، دو سو پونڈ اور ڈھائی سو پونڈ ہو گی جو مزید پیریڈ پڑھاتے ہیں اور مضمون کے درس و تدریس کی تنظیم کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ اس مضمون کی تدریس میں ایک سے زیادہ مدرس کام کر رہے ہوں۔ الاؤنس کی شرح کام کی مقدار اور اس کی نوعیت کے مطابق ہو گی ۔

۳۔ ایک تین یا اس سے زیادہ درجے کے مدرسے میں نئے الاؤنس کی شرح دو سو۔ ڈھائی سو تین سو، اور ساڑھے تین سو پونڈ سالانہ ہو گی۔ لیکن الاؤنس ملنے کی شرائط بعینہ وہی ہیں جن کا ابھی ذکر ہو چکا ہے۔

یہ تجویزیں مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں ہیں۔

ان تجویزوں کے پیش نظر مدرسے کے گورنر نئے الاؤنس کے متعلق سفارش کریں گے، لیکن جہاں تک کسی مضمون کے صدر مدرس کا تعلق ہے گورنروں پر یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ اونچی شرح کے مطابق اسے ایک وقت میں چار الاؤنس سے زیادہ نہیں مل سکتا۔ یعنی دو درجے والے مدرسے میں دو سو یا ڈھائی سو پونڈ اور تین درجے والے مدرسے میں تین سو یا ساڑھے تین سو پونڈ۔ مگر بعض حالات میں اسے بدلا بھی جا سکتا ہے۔ اساتذہ کے ان نئے الاؤنسوں پر تخمیناً ۱۴۳۰۰۰ اس سال خرچ ہو گا ۔

مڈل بورو مقامی تعلیمی حکومت کی تجویزیں یہ ہیں ۔

(۱) مزید اور اعلیٰ کام

اپنے روزمرہ فرائض کے علاوہ جو اساتذہ مزید کام کریں گے انھیں مندرجہ ذیل شرح کے مطابق الاؤنس دیا جائے گا ۔

(نقشہ دوسرے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

اوقات تدریس		الاؤنس
۴۰ پیریڈ	۳۵ پیریڈ	
۶ - ۹	۵ - ۸	۷۵ پونڈ
۱۰ - ۱۳	۹ - ۱۳	۱۰۰ "
۱۷ - ۱۸	۱۳ - ۱۶	۱۲۵ "
۱۹ - ۲۳	۱۷ - ۲۰	۱۵۰ "
۲۴ - ۲۸	۲۱ - ۲۵	۱۷۵ "

اگر یہ مزید کام سائنس یا ریاضی کا ہوگا تو اس الاؤنس کی شرح میں ۲۵ پونڈ کا مزید اضافہ ہوگا الاؤنس میں اس وقت تک کوئی اضافہ یا تخفیف نہیں کی جائے گی جب تک پیریڈز کی تعداد ایک سلسلے کے کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ پیریڈ سے ایک سے زیادہ کم یا زیادہ نہ ہو جائے ۔

(ب) اہم مضامین کے اساتذہ ۔

(۱) اگر ایک مدرس سارے مدرسے کے لیے ایک مضمون کی درس و تدریس کا کلی طور پر ذمہ دار ہو تو اسے اسکول میں اس مضمون کے جملہ تدریسی پیریڈ کے پیش نظر حسب ذیل اصولوں کے مطابق الاؤنس ملیگا

طبقے	مضمون کے کل تدریسی پیریڈ		الاؤنس
	۴۰ پیریڈ	۳۵ پیریڈ	
i	۱۰۴ یا زیادہ	۹۱ یا زیادہ	۲۵۰ پونڈ
ii	۸۱ - ۱۰۳	۷۱ - ۹۰	۲۰۰ "
iii	۵۸ - ۸۰	۵۱ - ۷۰	۱۵۰ "
iv	۴۰ - ۵۷	۳۵ - ۵۰	۱۰۰ "

(۲) ہر طبقے میں ہر مضمون کے لیے ایک صدر مدرس ہوگا۔ اس کے علاوہ ہر اسکول میں ہر مضمون میں ایک اور مدرس ہونا چاہیے جو کم سے کم ایک ہفتے میں ۵ پیریڈ پڑھاتا ہو۔

۳۔ دوسرے تیسرے اور چوتھے طبقے میں صدر مدرس بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مضمون میں کچھ مزید اور اعلیٰ کام کرے اور حقیقۃً اول میں کچھ اعلیٰ تدریس ہونی چاہیے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ صدر مدرس بھی پڑھائے۔

۴۔ سائنس یا ریاضی کے صدر مدرس کو اپنے دوسرے الاؤنسوں کے علاوہ ۷۵ پونڈ کی مزید رقم ملے گی۔

۵۔ جب تک ایک سلسلے کے پیریڈز میں ۵ کی کمی یا اضافہ نہیں ہو جاتا۔ اس وقت تک الاؤنس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکا۔

(ج) سکنڈ ماسٹر

مخصوص ذمہ داری کا الاؤنس جو ایک سکنڈ ماسٹر کو ملتا ہے اس کی شرح سوا دو سو پونڈ سے تین سو پونڈ تک ہو گی، لیکن یہ رقم اس الاؤنس کا ایک جزو ہو گی جو سکنڈ ماسٹر کو بحیثیت کسی مضمون کے صدر مدرس یا دوسری تعلیمی تربیت کی وجہ سے ملتا ہے اور جن کا ذکر د اور ب میں کر دیا گیا ہے۔

دال سال مقامی تعلیمی حکومت کی تجویزیں مندرجہ ذیل ہیں۔

(د) ملکہ میری گرامر اسکول (۴۲،۴۲ یونٹ)

جوزف لیکی کا میری ہنیبو اسکول (۷۷،۷۷ یونٹ)

سکنڈ ماسٹر	۳۰۰ پونڈ	(۲۲۵ پونڈ	اگر وہ کسی دوسرے اہم شعبے کا
سکنڈ اسسٹنٹ ماسٹر	۲۵۰ پونڈ	(۱۷۵ پونڈ	صدر بھی ہو۔

اہم شعبوں کے صدر

سائنس	۲۵۰ پونڈ
ریاضی	"
انگریزی	"
السنۂ جدیدہ	"
کلاسکس	"

کم اہم شعبوں کے صدر

آرٹ	۲۰۰ پونڈ
کیمیا	"
کلاسکس	"
فرانسیسی	"
جغرافیہ	"
جرمنی	"
یونانی	"
تاریخ	"
لاطینی	"
طبیعات	"
انسانی علوم	"
حیاتیات	"

(ب) ملکہ میری ہائی اسکول (۱۱۹۵ یونٹ)

ایل مورگرین ہائی اسکول (۱۱۰۵ یونٹ)

ایڈورڈ شیلی ہائی اسکول (۹۴۷ یونٹ)

	ملکہ میری - ایل مورا سکول		ایڈورڈ شیلی	
سکنڈ ماسٹر	۳۰۰ پونڈ	(۲۲۵ پونڈ	۱۷۵ پونڈ	(۲۰۰ پونڈ)
سینئر اسسٹنٹ ماسٹر	۱۵۰ پونڈ	(۱۷۵ پونڈ)	۱۲۵ پونڈ	(۱۵۰ پونڈ

اگر یہ کسی اہم شعبے کے صا

بھی ہوں

اہم شعبوں کے صدر

	ملکہ میری ایل مور	ایڈورڈ شیلی
سائنس	۱۵۰ پونڈ	۱۳۵ پونڈ
ریاضی	۱۵۰ "	" "
انگریزی	۱۵۰ "	" "
السنہ عادیہ	۱۵۰ "	

کم اہم شعبوں کے صدر

تاریخ	۱۲۵ پونڈ	۱۰۰ پونڈ
جغرافیہ	" "	" "
فرانسیسی	" "	" "
حیاتیات	" "	" "
دست کاری	" "	" "

(ج) مزید اور اعلیٰ کام کے الاؤنس کی شرح

پیریڈ کی ہفتہ وار تعداد		
درجہ اول	۵ - ۹	۷۵ پونڈ
" اول کے	۵ - ۹ (اسکالرشپ ورک)	۱۰۰ "
" دوم	۱۰ - ۱۶	۱۲۵ "
" دوم کے	۱۰ - ۱۶ (اسکالرشپ ورک)	۱۵۰ "
" سوم	۱۶ سے دوپہر	۱۷۵ "

اس تفصیل کے پیش کرنے کی غرض وغایت یہ ہے کہ چوں کہ ہمارے ملک میں ثانوی تعلیم کی طرف بہت کم اور ثانوی مدارس کے معلمین کی مالی حالت بھی بہت زیادہ شکستہ ہے، اس لیے دوسرے ملکوں کی مثالوں سے فائدہ اٹھا کر ہم بھی اپنے مدرسوں میں زندگی کی نئی سرگرمی پیدا کر سکتے ہیں۔ ہم زندگی کے ہر شعبے میں مغرب کی نقالی کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان کی تہذیب و تمدن۔ ان کی چال ڈھال، اور ان کی بول چال۔ غرض ہر چھوٹی بڑی بات میں ہم ان کی پیروی کے دعویدار ہیں اور ہمارا نظام تعلیم تو تمام تر انہی کے نظام ہائے تعلیم سے مستعار ہے۔ اس لیے ہمیں استاد کی سماجی اور مالی حیثیت کے سلسلے میں بھی سبق حاصل کرنا چاہیے۔

سبقوں کے خاکے

جغرافیہ — آسٹریلیا کی سطح

عبدالغفور چوہدری سلسلہ نمبر ا

تربیتی درس گاہوں میں پڑھنے والے متعلم اساتذہ کو اس بات کی خاص دھن رہتی ہے کہ کہیں سے بنے بنائے مثالی سبقی اشارے مل جائیں۔ یہ تلاش مذہبی طور پر عبث ہے، کیوں کہ ہر سبق مخصوص حالات کے مطابق تیار کیا جاتا ہے۔ تاہم کام یاب استادوں کے عملی سبقوں کا مشاہدہ کرنے سے ہر نو آموز استاد بہت کچھ اخذ کر سکتا ہے، اس مہینہ سے ہم ایک کام یاب تجربہ کار استاد کے دیے گئے اسباق کے خاکوں کا ایک سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ یہ خاکے کمرۂ جماعت میں بیٹھے ہوئے ایک مختصر نویس نے تیار کیے تھے اگرچہ یہ خاکے مختلف ماحول کے کمرہ ہائے جماعت میں نمونہ نہیں بن سکتے تاہم ان کی افادیت ناقابل انکار ہے۔ امید ہے متعلم اساتذہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے (نائب مدیر)

جماعت چھٹی :— لڑکوں کی اوسط عمر ۱۱ - ۱۲ سال

ذیل میں چھٹی جماعت کے لیے آسٹریلیا کی سطح پر ایک سبق کی روداد پیش کی جا رہی ہے، اس جماعت آسٹریلیا پر یہ پہلا سبق ہے۔ سبق میں متعلقہ امور مثلاً معدنیات وغیرہ کا بھی سرسری ذکر کیا گیا ہے۔ استاد نے "معلوم سے نامعلوم" کے اصول کو خاص طور پر مدنظر رکھا ہے۔ اہم معلومات نقشہ کی مدد سے اخذ کرانے کی کوشش کی تختۂ سیاہ پر جو خاکہ کھینچا گیا ہے سبق کے دوران میں رنگین چاکوں سے پُر کیا گیا ہے۔ خلاصے کے اثنا تختۂ سیاہ پر ساتھ ساتھ درج کیے گئے ہیں بعض لڑکوں نے تلخیصی اشارات نقل کر لیے ہیں، دوسرے سبق میں آب و ہوا، اور پیداوار کا مطالعہ کیا جائے گا۔ اور تیسرے سبق میں صنعت و حرفت اور تجارت کو زیر بحث لا درسی کتاب یا اسی موضوع پر کسی اور کتاب کا مطالعہ لڑکے گھر پر کریں گے، دوسرے سبق سے پہلے دس منٹ

تحریری آزمائش ہوگی۔ حاصل شدہ معلومات کو پختہ کرنے کے لیے گھر پر شکلیں، خاکے اور نقشے کھنچوائے جائیں گے۔

اٹلس تقسیم کی گئیں ہر لڑکے کے پاس ایک اٹلس ہے۔

استاد:۔ یہ آسٹریلیا کا خاکہ ہے (تختہ سیاہ پر آسٹریلیا کا خاکہ کھینچتے ہوئے) پہلی بات جو میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں وہ اس کا محل وقوع ہے۔ اپنی اٹلسوں کو غور سے دیکھو اور بتاؤ کہ عرض بلد کا کونسا خط آسٹریلیا میں سے گزرتا ہے۔

لڑکا:۔ ۲۰ درجے عرض بلد

استاد:۔ بھئی یہ جواب تو کچھ ایسا ویسا ہی رہا، ذرا سوچ کر ٹھیک ٹھیک بتا یئے۔

لڑکا:۔ جنوبی عرض بلد

استاد:۔ دیکھو یہ دس درجے جنوبی عرض بلد ہے۔ چوں کہ آسٹریلیا خطِ استوا کے جنوب میں واقع ہے اس لیے ہم اس کے موسموں کے بارے میں کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔ اگر ہمارے ہاں سردی ہو تو آسٹریلیا میں کونسا موسم ہوگا؟ ابھی موسم گرما میں میرے ایک دوست نیوزی لینڈ سے واپس آئے تھے، بتا نیوزی لینڈ میں اس وقت کونسا موسم تھا۔

لڑکا:۔ بہار کا موسم

استاد:۔ تو گویا یہاں لوٹنے پر میرے دوست کو ایک ہی سال میں دو موسم سرما گذارنے پڑے۔ آسٹریلیا کے کھیل معلوم کر کے وہاں کے موسم جان سکتے ہیں۔ بھلا بتاؤ تو آج کل وہاں کونسا کھیل کھیلا جارہا ہے۔

لڑکا:۔ کرکٹ۔

استاد:۔ بالکل ٹھیک۔ ہاں تو آسٹریلیا کا عرض بلد کیا ہوا۔ دس درجے جنوبی عرض بلد اور ۴۰ درجے عرض بلد۔ شمال سے جنوب تک کتنے درجے ہوئے؟

لڑکا:۔ تیس درجے۔

استاد:۔ ایک درجے میں کتنے میل ہوتے ہیں؟

لڑکا :- ستّر۔

استاد :- تو پھر شمال سے جنوب تک اندازاً کتنے میل ہوئے؟

لڑکا :- دو ہزار ایک سو میل۔

استاد :- ہاں۔ دوسرے الفاظ میں

لڑکا :- یعنی تقریباً دو ہزار میل

استاد یہ عدد تختۂ سیاہ پر لکھ دیتا ہے۔

استاد :- ہم مغرب سے مشرق کی طرف فاصلے کا اندازہ یا تو آنکھ سے لگا سکتے ہیں اور یا نقشے کے پیمانے سے معلوم کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں۔ نقشے پر دیکھ کر بتاؤ کہ مشرق سے مغرب تک تمہارے خیال میں کتنا فاصلہ ہوگا؟

لڑکا :- دو ہزار پانچسو میل۔

استاد :- بالکل ٹھیک۔ آسٹریلیا کا رقبہ تیس لاکھ مربع میل ہے اور اتنے بڑے وسیع رقبہ میں آبادی بہت تھوڑی ہے۔ اب اگر تم اس آبادی کو کل رقبہ پر تقسیم کرو تو فی مربع میل کتنے آدمی ہوں گے۔

لڑکا :- دو۔

استاد :- ہم اسے فی مربع میل آبادی کہتے ہیں۔ پاکستان کے مقابلہ میں یہ بہت کم ہے۔ ہماری اوسط آبادی اس سے بہت زیادہ ہے۔ طول بلد کا خط اپنے نقشے پر دیکھو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس شہر (میلبورن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کا طول بلد معلوم کرو۔ کیا ہے؟

لڑکا :- ایک سو پینتالیس درجے۔

استاد :- ایک درجہ کتنے منٹ کے برابر ہوتا ہے؟

لڑکا :- چار منٹ کے

استاد :- اگر تمہیں اس میں کچھ شبہ ہو تو اسے معلوم کرنے کا ایک آسان طریقہ بھی ہے۔ (گلوب گھماتے ہوئے) ایک پورا چکر لگانے میں زمین کتنا وقت لیتی ہے؟

لڑکا :- ایک دن

استاد:- اور ایک دن کتنے گھنٹے کا ہوتا ہے؟

لڑکا:- چوبیس گھنٹے کا

استاد:- ایک پورے چکر میں زمین کتنے درجے گھومتی ہے؟

لڑکا:- تین سو ساٹھ درجے

استاد:- ہم تختہ سیاہ پر اس سوال کو ایسے حل کر سکتے ہیں

تین سو ساٹھ درجے - چوبیس گھنٹے - اس لیے ایک درجہ = ۲۴/۳۶۰ × ۶۰/۱ = ۴ منٹ

اگر پھر کبھی یہ بات تمہیں بھول جائے تو اس طرح حساب لگا کر نکال لینا"۔

میلبورن اور لندن کے وقتوں میں کیا فرق ہوگا؟ اسے اپنی کاپیوں میں حل کرو۔ یہ بہت آسان ہے۔ جو لڑکا اسے حل نہیں کر سکتا وہ کھڑا ہو جائے۔ وقت کا فرق، گھنٹوں اور منٹوں میں؟

لڑکا:- پانچ گھنٹے

استاد:- پورے پانچ گھنٹے؟

لڑکا:- پانچ گھنٹے سے ذرا کم

دوسرا لڑکا ۵ ۲/۳ گھنٹے

استاد:- (اپنی گھڑی دیکھ کر) اس وقت گیارہ بج کر پچیس منٹ ہوئے ہیں۔ اس میں ہمیں ۵ ۲/۳ گھنٹے اور بڑھانا ہے (تختہ سیاہ پر حل کرتے ہوئے) یعنی تقریباً ساڑھے پانچ بجے شام۔ اس وقت تم دوپہر کا کھانا کھانے والے ہو۔ لیکن آسٹریلیا میں لوگ اس وقت شام کے کھانے کی فکر میں ہوں گے۔ اب ذرا آسٹریلیا کی سطح کو دیکھو (تختہ سیاہ پر خاکہ کھینچتے ہوئے) دیکھو مغرب کی طرف ایک بڑی سطح مرتفع ہے، یہ بہت وسیع اور بہت اونچی ہے، ہم اسے مغربی سطح مرتفع کہتے ہیں۔ اب مشرق میں دیکھو۔ جہاں تم کیا دیکھتے ہو، یہاں پہاڑ ہیں، جو پہاڑ شمال میں ہیں ان کا کیا نام ہے؟

لڑکا:- سلسلہ کوہ ہو ہنڈرن

دوسرا لڑکا :- تقسیم کرنے والا سلسلہ عظیم

استاد :- ہاں ۔ اور جو یہاں نیچے ہیں ۔

لڑکا :- نیو انگلینڈ کے پہاڑ

استاد :- ان کا نام کیا ہے ؟

لڑکا :- ایلپس

استاد :- جو سڈنی کے بالمقابل ہیں ؟

لڑکا :- دی بلیو ماؤنٹین (نیلے پہاڑ)

استاد :- اب تمہیں آسٹریلیا کے پہاڑوں کے نام معلوم ہو گئے ۔ یعنی دی گریٹ ڈیوائڈنگ رینج دی نیو انگلینڈ ماؤنٹین ۔ دی بلیو ماؤنٹین اور آسٹریلین ایلپس ۔ اب دیکھو اس میں میدانی علاقہ بھی ہے ، اس میدانی علاقے کا نام بڑی خلیج کے نام پر ہے ۔ اس کا کیا نام ہے ؟

لڑکا :- خلیج کارپینٹریا

استاد :- اس لیے ہم اسے کارپینٹریا کا میدان کہتے ہیں ۔ اس جگہ (نقشہ پر محل وقوع دکھاتے ہوئے) میدان کا ایک اور سلسلہ ہے ۔ اور اس کے بیچ میں ایک جھیل ہے ، اس کا کیا نام ہے ؟ ۔

لڑکا :- جھیل آئر

استاد :- میدان کے اس حصہ کا نام اس جھیل کے نام پر ہے ۔ اور اسے جھیل آئر کا طاس کہتے ہیں ۔ اس کے علاوہ ایک میدانی خطہ ہے اور اس میں ایک دریا بھی ہے ، اس دریا کا کیا نام ہے ؟

لڑکا :- مرے ۔

استاد :- دریائے مرے کا ایک بڑا معاون ڈارلنگ ہے ، اور اس لیے ہم اسے مرے اور ڈارلنگ کا طاس کہتے ہیں ۔ اب ہمیں معلوم ہو گیا کہ آسٹریلیا کے مشرق میں پہاڑ ہیں ۔ مغرب میں

سطح مرتفع ہے۔ اور وسط میں شمال سے جنوب تک گیا ہے!

لڑکا:۔ میدان۔

استاد:۔ یہ ہیں آسٹریلیا کے طبعی خدوخال (استاد انہیں تختہ سیاہ پر لکھ دیتا ہے)

۱۔ مغربی سطح مرتفع:۔ اب میں اس کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتاؤں گا جو تم نقشے کی مدد سے نہیں بتا سکتے۔ مغربی سطح مرتفع پرانی سخت چٹانوں سے بنی ہے، البتہ کہیں کہیں چونے کے پتھر کی نرم چٹانیں ہیں۔ اگر ایسی چٹانیں ساحل کے پاس پائی جائیں تو ساحل کیسا ہوگا؟

لڑکا:۔ کٹا پھٹا۔

استاد:۔ میرے دوست نے بتایا تھا کہ فری منیٹل تک پہونچنے سے پہلے ہمیں بڑا دشوار گذار سفر کرنا پڑا سمندری سفر اتنا دشوار تھا کہ بہت سے لوگوں نے طبورن پہونچنے کے لیے ریل کا سفر اختیار کیا بعض لوگ ایڈی لیڈ میں جہاز سے اتر گئے۔ وہاں کی بڑی خلیج کا کیا نام ہے؟

لڑکا:۔ گریٹ بائٹ

استاد:۔ تم ایک ہزار میل ریل میں سفر کر سکتے ہو، اور تمہیں کہیں بھی ہمیشہ بہنے والے دریا سے گذرنا نہیں پڑے گا، اس کی کیا وجہ ہے کہ مغربی سطح مرتفع میں کوئی ہمیشہ بہنے والا دریا نہیں ہے؟۔

لڑکا:۔ کیوں کہ پانی چونے کے پتھر میں جذب ہو جاتا ہے۔

استاد:۔ آسٹریلیا کی سطح کا پہلا حصہ ختم ہوا۔ تم نے دوسرا کون سا حصہ بتایا تھا؟

لڑکا:۔ وسطی میدان

استاد:۔ آئیے اس براعظم کو قدرتی حصوں میں تقسیم کریں۔ پہلا حصہ کون بنائے گا؟

لڑکا:۔ خلیج کارپنیٹریا۔

استاد:۔ دوسرا؟

لڑکا:۔ آئر کا طاس

استاد:- دریا اس رخ بہتے ہیں۔ نقشہ پر اکثر انہیں نقطوں والے خطوں میں ظاہر کیا جاتا ہے، وہاں کیا ہے؟ -

لڑکا:- وہاں ایک دریا تھا جواب خشک ہو چکا ہے -

دوسرا لڑکا:- بعض اوقات دریا بہتا رہتا ہے اور کبھی خشک بھی ہو جاتا ہے -

استاد:- دریا خشک کب ہوتا ہے!

لڑکا:- گرمی کے موسم میں

استاد:- جھیل آئر کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ایک جھیل ہرگز نہیں ہے۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ اس کا کون سا حصہ جھیل ہے؟ -

لڑکا:- وسطی حصہ

استاد:- بالکل وسطی حصہ تو نہیں، وسطی حصہ میں تم (LAKE DISPPOINTMENT) دیکھتے ہو کہتے ہیں ایک سیاح نے جسے سخت پیاس لگ رہی تھی دور سے جھیل کو دیکھا، چنانچہ اس طرف لپکا۔ لیکن قریب پہونچ کر اس نے کیا دیکھا؟

لڑکا:- نمک کا ایک تالاب

استاد:- اس جھیل آئر کے اردگرد سچ مچ نمک کا ایک تالاب ہے۔ اس کا بہت سا حصہ خشک ہے وہ کون سا حصہ ہے -

لڑکا:- دریائے مرے اور ڈارلنگ کا طاس -

استاد:- دیکھو وہاں ایک اور نشیب ہے اور یہاں ایک اور جھیل بھی تو ہے

لڑکا:- جھیل ٹارنس (Torrens)

استاد:- اگر تم جھیل ٹارنس سے آگے بڑھتے جاؤ تو اس سے ایک خلیج بن جاتی ہے -

لڑکا:- خلیج سپنسر

استاد:- طبقات الارض کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اصل میں ہوا یہ کہ اس جگہ ایک بہت بڑا

پڑگیا۔ اگر تم اٹلس کو دیکھو تو تمہیں خلیج آئر کے متعلق ایک بات اور معلوم ہوگی۔

لڑکا :۔ اس کا کچھ حصہ سمندر سے نیچا ہے۔

استاد :۔ اور چونکہ یہ حصہ نیچے بیٹھ گیا ہے۔ اس لیے اس کو شگاف دار وادی کہتے ہیں۔ اب ہم تیسرے حصہ کی طرف آتے ہیں وہ کونسا ہے؟

لڑکا :۔ مشرقی سلسلہ کوہ یا مشرقی پہاڑ۔

استاد :۔ مشرقی پہاڑوں کو ا ب ج د میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم اسے بعد میں مشق کے طور پر چھوڑتے ہیں۔ آسٹریلیا کے طبعی خدوخال کے سلسلے میں دوسری چیز یہ ہے کہ ہم اس کی معدنیات معلوم کریں اب ہم اس کی چٹانوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ بھلا دیکھیں تو کہ سطح کے نیچے ہمیں کیا کیا چیزیں ملتی ہیں ان پہاڑوں کی تہوں میں کئی معدنیات ملتی ہیں، جنوب میں چونے کے پتھر کی چٹانوں کے سوا ہمیں کوئی معدنی چیز نہیں ملتی اور اس سارے خطے میں ہی زیادہ معدنیات نہیں ملتیں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ آسٹریلیا کی ترقی زیادہ تر کس دھات کی وجہ سے ہوئی؟ ۔

لڑکا :۔ سونے کی وجہ سے۔

استاد :۔ بجا ہے۔ شروع میں سونے کی بڑی اہمیت تھی (تختہ سیاہ پر خاکہ کھینچتے ہوئے) سونا کس کس جگہ ملتا ہے! کال گرلی۔ کول گارڈی (مغربی آسٹریلیا) شروع شروع میں آسٹریلیا کی ترقی میں سونے کی بڑی اہمیت تھی۔ بھلا بتاؤ وہ کیسے؟ ۔

لڑکا :۔ لوگ وہاں کوشش کر کے سونا حاصل کرنے جاتے تھے۔

استاد :۔ آہ کیا تمام لوگ سونا حاصل کر لیتے تھے؟

لڑکا :۔ نہیں۔

استاد :۔ اور جو لوگ سونا حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں کوئی اور کام کرنا پڑتا تھا؟ ۔

لڑکا :۔ کھیتی باڑی

استاد :۔ ہاں ٹھیک ہے۔ لوگ آسٹریلیا کیوں بھیجے جاتے تھے؟ ۔

لڑکا :- وہ ولایت کا کالا پانی تھا۔

استاد :- ہاں ۔ وہاں مجرم لوگ بھیجے جانے تھے ۔ آسٹریلیا کے لوگ بڑے با مذاق ہیں، وہ کہتے ہیں ہمارے آباؤ اجداد اونچے مرتبہ والے تھے، ان کا انتخاب بہترین ججوں نے کیا تھا (اس پر ہنستے ہیں) بہت سے لوگ جو وہاں اپنی مرضی سے گئے سونے کی تلاش میں گئے تھے۔ لیکن ان میں سے اکثر مایوس ہوئے اور بعض پُر امید واپس آئے ، دوسرے لوگ جو وہاں گئے انہوں نے دیکھا کہ سونے کی تلاش میں جانے والے لوگوں کو اور چیزوں مثلاً کھانے پینے کی چیزوں کی ضرورت ہو گی اور اس طرح وقت گذارنے پر دوسری صنعتوں کو بھی ترقی ہوئی ۔ اِن دنوں آسٹریلیا میں سونا اتنا اہم نہیں رہا ۔ کال گرلی کی کانوں کے ذخیرے ختم ہو رہے ہیں ۔ ایک نئے ملک کو زیادہ ترقی دینے کے لیے ان دنوں کس دھات کی ضرورت ہے ؟

لڑکا :- چاندی کی

استاد :- نہیں میرے خیال میں چاندی زیادہ مفید ثابت نہیں ہو سکتی ۔

لڑکا :- کوئلہ ۔

استاد :- بالکل ٹھیک ۔ آسٹریلیا میں کوئلہ کثرت سے ملتا ہے ، وہاں کوئلہ کی سب سے بڑی کان کہاں ہے؟

لڑکا :- کوئلہ نیو ساتھ ویلز میں ملتا ہے ۔

استاد :- جس خط کو میں نے نقشہ پر ظاہر کیا ہے اس میں کوئی ایسا نام تلاش ضرور کرو جو کوئلہ کی وجہ سے مشہور ہے ، برطانیہ کے متعلق تمہاری معلومات تمہیں اس میں مدد دے گی ۔

لڑکا :- نیو کاسل ۔

استاد :- کوئینز لینڈ میں کوئلہ کی چھوٹی کانیں بھی ہیں ، نقشہ میں دیکھ کر ان کے نام بتاؤ ۔

لڑکا :- کیرنز (CAIRNS)

دوسرا لڑکا :- کک ٹاؤن (COOK TOWN)

استاد :- اچھا اب کوئلہ کے ساتھ کوئی اور ایسی دھات بتاؤ جس کی صنعت میں خاص ضرورت ہو تی

لڑکا :- لوہا ۔

ناد:- ہاں۔ لوہا کئی جگہ ملتا ہے۔ تم دیکھو گے کہ لوہا کوئلے سے دور فاصلہ پر ملتا ہے اس لیے
اسے وہاں لے جانا پڑتا ہے جہاں کوئلہ ہو۔ تم کوئلہ کو اس جگہ کیوں نہیں لے جاتے جہاں لوہا
ملتا ہے ؟ ۔

کا:- اس لیے کہ ایک ٹن لوہے کو پگھلانے کے لیے تین ٹن کوئلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لوہا صاف
کرنے کے کارخانے ساحل کے پاس واقع ہیں ۔

ناد:- اچھا کسی اور دھات کا نام بتاؤ ؟

کا:- چاندی اور جست ۔

ناد:- ان کے علاوہ ایک اور دھات بھی ہے ۔

کا:- جی ہاں ۔ تانبا ۔

ناد:- تانبے کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جب نرخ تیز ہوتا ہے تو تانبا پورے
زور شور سے نکالا جاتا ہے۔ لیکن جب نرخ گر جاتا ہے تو کان کنی بند کر دی جاتی ہے ۔
اچھا آج کا سبق تو ختم ہو گیا۔ اب آئندہ سبق میں ہم اس کی قدرتی پیداوار کے بارے
میں پڑھیں گے ۔

امریکہ میں اعلیٰ تعلیم اور غیر ملکی طلبہ

شاہد اشرف

مسلسل نمبر ۱

ریاستہائے متحدہ امریکہ بلا شبہ آج دنیا کا سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ملک ہے۔ جہاں تک تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد کا تعلق ہے دنیا کا کوئی دوسرا ملک اس کا لگا نہیں کھاتا۔ مثلاً برطانیہ کلاں میں صرف اٹھارہ یونیورسٹیاں ہیں جو اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں بہم پہونچاتی ہیں۔ ان کے مقابلہ میں ریاستہائے میں یونیورسٹیوں کی تعداد سترہ سو کو پہونچتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی دوسری قوم تعلیم افادیت میں غالباً اس قدر یقین نہیں رکھتی جتنی امریکی قوم۔ اخباروں، رسالوں اور ابلاغ عامہ دوسرے وسائل اظہار دن رات ایک نکتہ پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں، وہ یہ کہ تعلیم ہی جمہوریت کے بقا اور ترقی کی سب سے بڑی ضمانت ہے، ایسی تعلیم جو کسی خاص طبقہ کے لیے مخصوص نہ ہو بلکہ جس کے دروازے ہر شہری کے بچوں کے لیے ایک سے کھلے ہوں، جس طرح ایک کار ایشیا اور دوسرے پسماندہ ملکوں میں تعیش کا درجہ رکھتی ہے۔ یورپی ملکوں میں ایک کار آمد سہولت کا اور ریاستہائے متحدہ میں ایک ناگزیر ضرورت زندگی کا قریباً قریباً یہی مقام اعلیٰ تعلیم کو دنیا کے ان تین خطوں میں دیا جا سکتا ہے۔

حال ہی میں ایک جرمن طالب علم نے جو امریکہ میں پڑھائی کے لیے آیا تھا اپنے ملک اور امریکہ کے نظام تعلیم کا موازنہ کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا:۔

امریکی نظام مدارس اور جرمن مدرسوں کے درمیان موازنہ کرنا بڑا مشکل ہے، جرمنی میں آبادی بھرمار ہے لیکن آسامیوں اور مواقع کی کمی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امریکی مدرسوں کے مقابلے ہمارے مدرسوں کی بنیاد انتخاب کا طریقہ ہے، اس طریقہ میں کئی ایک خامیاں ہیں اور اس سے بعض اوقات بڑی سختی ہوتی ہے، اس کے برعکس جرمن مدرسے اپنے طالب علموں کو زیادہ علم دے

تے ہیں، امریکی مدرسوں میں یہ پہلو قدرے نظرانداز رہتا ہے۔ لیکن امریکی مدرسہ اپنے طلبہ کی پوری زندگی
حاوی ہوتا ہے۔ اور اس طرح انہیں زیادہ پائدار جذباتی رجحانات عطا کرتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا
ہے کہ بڑے ہوکر یہ طلبہ اپنے ایام مدرسہ پر خوشی اور تشکریہ کے جذبات کے ساتھ نگاہ ڈالتے ہیں۔

غیر ملکیوں کے لیے امریکی نظام تعلیم کو پہلی نگاہ میں سمجھنا عموماً ایک مشکل کام ہے، اس کی وجہ
یہ ہے کہ ایک مدرسے یا ایک کالج کو دیکھ کر سارے ملک کے متعلق کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا
کیوں کہ یہاں کوئی یکساں قومی نظام تعلیم موجود نہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ امریکی تعلیمی ادارے باقی
ملکوں کے اسکولوں اور کالجوں سے بہت کچھ مختلف ہیں، ان حالات میں امریکی مدرسوں کے متعلق کوئی
عام نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں، ان کے متعلق اگر کوئی بات عمومی طور پر کہی جاسکتی ہے تو یہ کہ انہوں نے
ثانوی درجہ تک کی تعلیم کو ہر شہری کے لیے آسان اور لازمی بنا دیا ہے اور یہ تعلیم جمہوری تصورات
کے عین مطابق ہے۔

تعلیم اور معاشرہ

دراصل تعلیم کو اس کے معاشرتی ماحول سے الگ سمجھا ہی نہیں جاسکتا، کسی ملک کے نظام تعلیم کو
سمجھنے کے لیے اس سماجی تعمیر کو سمجھنا بھی ضروری ہے جس کا یہ ایک اہم جزو ہے، جب تعلیم کا ذکر وسیع تر
معنوں میں کیا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ تمام تعلیمی مؤثرات ہوتے ہیں جو لوگوں کی زندگیوں کو متاثر کرتے
ہیں، اس میں کنبے کے موزوں ماحول سے لے کر قوالی کی ایک محفل میں شمولیت تک اور کمرہ جماعت میں اعلیٰ
ریاضی کے سبق تک ہر چیز شامل سمجھی جائے گی۔ ان معنوں میں تعلیم پوری زندگی پر حاوی ہے۔ ان معانی میں
تمام تہذیبیں پُرقدر و قیمت ہیں۔

جو معاشرتی قوتیں امریکی قوم کی زندگی پر اثر انداز ہیں وہ بے حد مختلف اور بعض اوقات متصادم
قسم کی ہیں، یہاں طرح طرح کی تہذیبوں کے لوگ آکر آباد ہوئے ہیں، جو اپنے ساتھ خانگی زندگی، مذہب،
آرٹ، اور معاشیات کے مختلف تصورات ساتھ لائے ہیں۔ امریکن نوجوانوں پر طرح طرح کے تعلیمی مؤثرات
اثر انداز ہوکر ان کی زندگیوں کو ایک مخصوص شکل دیتے ہیں، ان مؤثرات میں زیادہ قابل ذکر اخبارات

رسالے، متحرک تصویریں، نشریات، ٹیلی ویژن، سیاسی جماعتیں، مذہبی ادارے، مزدور جماعتیں آرٹ کے ادارے، عجائب گھر اور کتب خانے ہیں، یہ وہ مرکز ہیں جہاں سے رنگارنگ موثرات ذہنوں پر اثر ڈالتے ہیں۔ جو نوجوانوں کو ان گنت پسندوں کے مواقع پیش کرتے ہیں اور جو ان کے دلوں میں لاتعداد سوالات پیدا کرتے ہیں۔ امریکی نظام تعلیم کا ذکر کرتے وقت ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے یہ نظام اس پیچیدہ اور ترقی پذیر سماجی نظام کی پیداوار ہے جس کا پس منظر یہ رنگارنگ موثرات ہیں۔

یہ امر بالکل فطری ہے کہ جو تعلیمی ادارے رنگارنگ ثقافتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے قائم کیے گئے ہوں وہ آج بھی امریکی ثقافت کے تنوع کی آئینہ داری کریں۔ ملک میں ایسے مدرسے بھی ہیں جو پرائیویٹ یا غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر قائم ہیں اور ان کے پہلو بہ پہلو پبلک مدرسے ہیں یہ صورت حال کنڈر گارٹن مدرسے سے لے کر یونی ورسٹی کے درجے تک دیکھی جا سکتی ہے۔ ان اداروں کے معیار باہم کافی مختلف ہیں، اس لیے ایک یا دو اداروں کو دیکھ کر باقی سب کے متعلق کوئی رائے قائم کر لینا بالکل غلط ہوگا۔ امریکی تعلیم کی صحیح تصویر کا اندازہ کرنے کے لیے مختلف قسموں کے اچھے برے اداروں کو بیک نگاہ دیکھنا چاہیے۔ غیر ملکوں کے جو لوگ بالخصوص طلبہ جو ریاست ہائے متحدہ میں آتے ہیں وہ عموماً ملک کے کسی خاص حصے کے تعلیمی اداروں یا کسی مخصوص مدرسے اور کالج کو بنا قرار دے کر سارے ملک کے تعلیمی نظام کے متعلق اندازہ کر لیتے ہیں یہ طریق کار درست نہیں۔

امریکی زندگی میں آج جو بنیادی وحدت اور جذبہ تبدیلی موجود ہے اس کی عکاسی بھی اس ملک کے مدرسے کرتے ہیں، ماہرین تعلیم کی ایک کوشش یہ رہی ہے کہ امریکی ثقافت کی مشترک اقدار کا کھوج لگایا جائے، یہ وہ اقدار ہیں جو قومی وحدت کی بقا کی ذمہ دار ہیں یہی وہ اقدار ہیں جو مدرسے کی تربیت کی سمت معین کرتی اور اسے ہم آہنگی عطا کرتی ہیں، دوسری عالمی جنگ کے عرصہ میں اور اس کے بعد امریکی تعلیم پر بے تحاشہ کتابیں لکھی گئی ہیں، ایک عظیم الشان جمہوری ملک کے عام شہریوں کے تعلیمی مسائل کا اتنا گہرا تحقیقاتی مطالعہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اس کی وجہ امریکی جمہوریت کا یہ بنیادی اصول ہے کہ اچھی تعلیم کے مساوی مواقع ہر شہری کو ملنے چاہئیں۔

جنگ کے نازک زمانے اور اس کے بعد یہ احساس بہت شدت پکڑ گیا کہ اگر یہ جمہوری اصول فی الواقعہ بنیاد عمل بنے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر بچے کو یہ موقع ملنا چاہیے کہ اپنی امکانی بالیدگی کو حاصل کرے اس ضمن میں ہارورڈ جیسی مشہور یونی ورسٹی نے تحقیقاتی مطالعے کیے جن کا نتیجہ وہ بیش قیمت کتاب ہے جس کا نام "ایک آزاد معاشرے میں عام تعلیم" ہے۔ اس طرح کے مطالعے حکومت کی طرف سے بھی کیے گئے ہارورڈ رپورٹ نے امریکی نظام تعلیم کی موجودہ حالت اور اس کے تاریخی پس منظر کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد ان اقدار کی واضح طور پر تعیین کی جن کو تعلیمی عمارت کی بنیاد بننا چاہیے، جن بارہ ماہرین تعلیم نے یہ رپورٹ مرتب کی تھی انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ کم از کم پچھلے پچاس برسوں میں امریکی تعلیم کا بڑا مقصد یہ رہا ہے کہ آزاد خیالی اور انسانیت نوازی کی روایت کو قائم رکھا جائے۔ امریکی ثقافت کے تمام پہلوؤں کے متعلق ایک وسیع فہم پیدا کیا جائے اور شہریت کے فرائض اور حقوق کا احساس پیدا کیا جائے۔ الغرض اس کا مقصد یہ رہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ شہریوں کو ایک عام وسیع المشرب تعلیم مہیا کی جائے اور ایک محدود تعداد کے لیے پیشہ ورانہ اور فنی تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔

اکثر غیر ملکی طلبہ امریکی نظام تعلیم کے ان بنیادی مقاصد کو خوب سمجھ جاتے ہیں، مثلاً ویٹ نام کے ایک طالب علم کے الفاظ یہ ہیں:- "امریکی تعلیم کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ ہر کم عمر بچہ بشرطیکہ وہ بے حد کند ذہن نہ ہو تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے برعکس ویٹ نام میں تعلیم چیدہ چیدہ طالب علموں کا حصہ ہے۔ اعلیٰ تعلیم صرف گنتی کے طالب علم حاصل کر سکتے ہیں"۔

امریکی تعلیم نے اپنے سامنے جو مقاصد رکھے ہیں ان کی راہ میں دشواریاں بھی موجود ہیں، پہلی دشواری معاشرتی انقلاب کی رفتار ہے۔ پہلے ہر جگہ حالت یہ ہوا کرتی تھی کہ بچہ اپنے ماں باپ اور بڑے بوڑھوں کے ثقافتی ماحول میں پل کر جوان ہوتا تھا، آج ہر امریکی اپنی زندگی ہی میں ان دور رس ٹیکنیکل اور سماجی تبدیلیوں کا سامنا دینے پر مجبور ہے جو بجلی کی تیزی کے ساتھ چلی آ رہی ہیں، اس برق رفتار تبدیلی کی مثالیں کئی ہیں، ایسے امریکی لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں جنہوں نے اپنی زندگی ہی میں گھوڑا گاڑی کی جگہ موٹر اور ہوائی جہاز کو لیتے دیکھا، اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ

علم طلب نے جو قدر بیش قدمی پچھلے تیس برسوں میں کی ہے، وہ پہلے تین ہزار سال میں نہ کی تھی، تعلیم کے سامنے دوسرا کٹھن سوال یہ ہے کہ طلبہ کو مستقبل کی زندگی کے لیے تیار کرنے کے ساتھ ہی پرانی پسندیدہ اقدار کو کس طرح زندہ رکھا جائے، ان دونوں مسائل کے ضمن میں تیسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عام تعلیم اور خصوصی تعلیم میں سے زیادہ توجہ کی حق دار کون ہے، ایک اور الجھا ہوا سوال یہ ہے کہ غیر معمولی قابلیت کے طلبہ کو زیادہ مواقع کس طرح دیے جائیں کہ اوسط طلبہ کی سطح بھی بلند تر ہو جائے، ان تمام مشکلوں کے باوجود ریاست ہائے متحدہ میں تعلیم اپنے کام میں جس حد تک کام یاب ہی ہے وہ قابل تعریف ہے۔

ناخواندگی اور بے خبری کا خاتمہ

امریکی تعلیم کا سب سے بڑا کارنامہ وہ حیرت انگیز کامیابی ہے جو اسے ناخواندگی اور بے خبری کا خاتمہ کرنے میں حاصل ہوئی ہے، یہ خیال نہ کر لینا چاہیے کہ امریکی دستور اساسی کی دفعات نے خود بخود تعلیم کو مفت اور جبری بنا دیا ہے۔ بلکہ یہ چیز ایک پوری صدی کی جد و جہد کا نتیجہ ہے، دستور میں یہ قانون مدتوں سے موجود چلا آرہا ہے کہ عوامی تعلیم کا بندوبست حکومت کی ذمہ داری ہے، لیکن یہ قانون محض کاغذ پر تحریر تھا تعلیم عملی طور پر اونچے طبقہ ہی کے لیے مخصوص تھی، لیکن جب صنعت کی ترقی کے ساتھ شہروں میں محنت کشوں کی آبادی کے بڑے بڑے جماؤ پیدا ہوئے تو نادار لوگوں کی طرف سے آواز اٹھائی گئی کہ ان کے لیے سرکاری خرچ پر تعلیم کا بندوبست کیا جائے تاکہ ان کی بے خبری دور ہو، برسوں کے مطالبہ کے بعد مشرقی ریاستوں نے سرکاری ابتدائی مدرسے قائم کرنے شروع کیے۔ لیکن لازمی ابتدائی تعلیم کی تمام ریاستوں میں باقاعدہ اور مکمل ترویج سنہ ۱۹۲۰ء سے پہلے نہ ہو سکی۔

پبلک سکولوں کی بڑھتی ہوئی گنتی اور تعلیم پر دن بدن بڑھنے والے سرکاری اخراجات نے تعلیم کو اعلیٰ طبقہ کا اجارہ نہیں رہنے دیا اور ناخواندگی کو بڑی حد تک ختم کر دیا ہے۔ مردم شماری کے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ سنہ ۱۸۵۰ء میں چودہ برس یا اس سے اوپر کی عمر کی آبادی میں ناخواندگی کا تناسب ستره فی صد تھا، سنہ ۱۹۰۰ء میں یہ تناسب تیرہ رہ گیا، سنہ ۱۹۳۰ء میں یہ صرف چھ فی صد تھا، اور سنہ ۱۹۴۷ء میں بقدر اڑھائی فی صد باقی رہ گیا تھا۔ یہ اعداد و شمار بڑی تاثیر پیدا کرنے والے کہانی

دیتے ہیں لیکن یہ پوری کہانی نہیں سنانے۔ مثلاً ڈاکٹر دہندوں میں سے کوئی دو کروڑ ایسے ہیں جنہوں نے چھے سال سے کم عرصہ تک تعلیم پائی۔ چھے سے سولہ سال کی عمر کے بچوں میں بیس لاکھ ایسے ہیں، جو مدرسے میں نہیں جاتے۔ یہ حقائق اس بات کا ثبوت ہیں کہ امریکی قوم نے تعلیم میں بڑی ترقی کی ہے، پھر بھی وہ ابھی تمام شہریوں کے لیے مفت اور جبری تعلیم کی مہم میں مصروف ہے۔

ایک اہم فرق

امریکی نظام تعلیم اور دوسرے ملکوں کے نظام ہائے تعلیم میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ جہاں دوسرے ملکوں میں عموماً یہ نظام مرکزی حکومت کی نگرانی میں ہے، امریکہ میں اس کی دیکھ بھال اُن اڑتالیس ریاستوں کے ہاتھ میں ہے جو باہم مل کر امریکی وفاق بناتی ہیں، اس لیے جہاں ناروے یا فرانس کے نظام تعلیم کا ذکر کیا جا سکتا ہے وہاں امریکی نظام تعلیم کی بجائے ریاست نیویارک یا ریاست مشی گن کے نظام تعلیم کا ذکر کرنا زیادہ موزوں ہے۔

ہر ریاست اپنی تعلیم کی خود ذمہ دار ہے، اس کا اپنا مجموعہ قوانین سرکاری اور غیر سرکاری مدرسوں کے طریق کار کی تعیین کرتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف ریاستوں کے مدرسے بعض اہم امور میں اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود ان سب میں ایک بنیادی یگانگت بھی موجود ہے۔ ہر ریاست نے اپنے مدرسوں کی دیکھ بھال اور رہنمائی کے لیے ایک انتظامی محکمہ کھول رکھا ہے، بعض ریاستوں نے یہ کام براہ راست اپنے ہاتھوں میں رکھا ہے اور بعض نے یہ کام مقامی انتظامیہ اداروں کو سونپ رکھا ہے۔

پبلک مدرسوں سے وہ مدرسے مراد ہیں جو عوامی ٹیکسوں کے سہارے چلتے ہیں ابتدائی اور ثانوی تعلیم زیادہ تر انہی مدرسوں کے ہاتھ میں ہے، صرف دس فی صد بچے ایسے ہیں، جو پرائیویٹ مدرسوں میں پڑھتے ہیں۔ پرائیویٹ مدرسوں میں بھاری تعداد رومن کیتھولک مدرسوں کی ہے۔ پرائیویٹ مدرسوں میں پڑھنے والے طلبہ میں سے کوئی نوے فی صد ان مدرسوں میں پڑھتے ہیں، اعلیٰ تعلیم میں کیفیت مختلف ہے، کیونکہ ایسے کالجوں اور یونی ورسٹیوں کی تعداد جو پرائیویٹ

انجمنوں یا مذہبی اداروں کے ہاتھ میں ہیں، سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے، اس کے باوجود سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد کل تعداد کے نصف سے کچھ زیادہ ہے۔

امریکہ کی مرکزی حکومت تعلیم میں جو کردار ادا کر رہی ہے وہ کچھ عرصہ سے موضوع بحث بنا ہوا ہے، بعض ریاستیں اور کچھ شہر اور قصبے مالی طور پر اتنے کم زور ہیں کہ وہ جدید وضع کے مدرسے خود قائم نہیں کر سکتے۔ بعض سیاسی رہنما اور ماہرین تعلیم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس مشکل کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ مرکزی حکومت انہیں مالی مدد دے، اس کے ساتھ ہی یہ ڈر بھی موجود ہے کہ اگر مرکز نے مدد دی تو مرکز کچھ دیکھ بھال کرنا بھی ضروری سمجھے گا یہ چیز کسی امریکی کو گوارا نہیں، کیوں کہ اس کا خیال ہے کہ آزادی برقرار رکھنے کے لیے مدرسے کی دیکھ بھال مقامی ہاتھوں میں ہونی چاہیے، تاہم مرکزی حکومت نے تعلیم میں ہمیشہ گہری دل چسپی لی ہے، اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ۱۸۸۹ء کے بعد جو ریاستیں فاق میں داخل ہوئی ہیں ان سب کے لیے داخلہ کی ایک شرط یہ تھی کہ اپنے دستور میں مفت اور جبری تعلیم کا قانون شامل کریں، حالیہ سالوں میں مرکزی حکومت کی پالیسی یہ رہی ہے کہ ریاستوں اور تعلیمی اضلاع کو خاص مقاصد مثلاً عمارتیں، بچوں کے لیے دوپہر کھانے یا پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے مالی مدد دے، دوسری عالمی جنگ کے بعد مرکزی حکومت سابق فوجیوں کو گیارہ بلین ڈالر اس غرض کے لیے دے چکی ہے کہ وہ باقاعدہ تعلیم جاری رکھ سکیں، اگرچہ امریکی کانگرس نے ۱۸۶۷ء میں ایک قانون منظور کر کے ایک مرکزی محکمہ تعلیم قائم کیا تھا، لیکن اس محکمہ کو مرکزی وزارت میں کوئی قلمدان حاصل نہیں، اس لیے اسے ملکی تعلیم کے طریق کار پر براہ راست کوئی قابو نہیں، اس کا کام صرف یہاں تک محدود ہے کہ تحقیقاتی مطالعوں اور دوسرے ذرائع سے مفید تعلیمی معلومات اور اعداد و شمار فراہم کرے اور ان کی اشاعت و تشہیر سے پسندیدہ تعلیمی سرگرمیوں کی ترقی میں مدد دے۔

ابتدائی اور ثانوی تعلیم | اکثر ابتدائی مدرسے چھے سے بارہ برس کی عمر کے بچوں کو چھے جماعتوں تک

ر دیتے ہیں، اگلے چھے سالوں کی تعلیم ثانوی مدرسے کے ذمّہ ہے، ثانوی تعلیم کے چھے سال عموماً
درجوں میں بانٹے جاتے ہیں، پہلے تین سال یعنی ساتویں سے نویں جماعت تک کو جونیر ہائی
ول کا نام دیا جاتا ہے اور اگلے تین سال یعنی دسویں سے بارھویں جماعت کو سینیر ہائی اسکول کا۔
۶-۳-۳ کا نظام کہلاتا ہے بعض نظام اس سے مختلف ہیں، مثلاً ۸-۴ کا نظام اس
ام میں پہلے آٹھ سال کی پڑھائی ابتدائی درجہ میں شامل ہے اور آخری چار سال کی ثانوی درجہ میں۔

چوں کہ ابتدائی مدرسوں میں آئندہ تعلیم کی بنیاد رکھی جاتی ہے اس لیے ان میں اس بات کا بہت
ال رکھا جاتا ہے کہ طلبہ کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے۔ نوآبادی زمانے میں امریکی ابتدائی مدرسے لکھائی
ھائی اور گنتی کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتے تھے۔ لیکن آج ان کا نصاب بہت وسیع ہو چکا ہے
اس نصاب میں تاریخ جغرافیہ۔ نقشہ کشی۔ مطالعہ قدرت۔ موسیقی۔ خطاطی، دست کاری
نہ داری اور دوسرے کئی مضامین شامل ہیں، بچے کی انفرادیت کو بہت توجہ ملتی ہے، نہ صرف
ں کی بدنی اور ذہنی ترقی کا اہتمام کیا جاتا ہے، بلکہ جذباتی اور سماجی ہم آہنگی کا بھی تعلیمی مواد میں
ابوں کے علاوہ رسالے، متحرک تصویریں۔ ریڈیائی نشریات شامل ہیں، بچوں کی ہر ممکن حوصلہ افزائی
جاتی ہے کہ ان ذرائع سے جو معلومات اور خیالات اخذ کریں ان پر آزادانہ بات چیت کریں۔

غالباً سب سے اہم معاشرتی تبدیلی جس نے امریکی تعلیم پر بے حد اثر ڈالا ہے اس قوم کا دیہاتی
ندگی کو خیرباد کہہ کر شہری زندگی اختیار کرنا ہے، اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ شہروں کے مدرسوں
تعلیم دینے کے علاوہ اس باہمی میل جول اور قریبی یگانگت کا اہتمام بھی کرنا پڑا، جو دیہی اور
صباتی زندگی کا خاصہ تھے، مدرسوں نے یہ اہتمام کھیلوں، فنون لطیفہ، ڈرامہ، مجلسی تقریبوں اور
ر قسم کی دوسری سرگرمیاں بہم پہنچا کر کیا، بڑے شہروں کے اکثر مدرسے اوقات تعلیم کے بعد بھی
ھلے رہتے ہیں، چھٹی کے دن بھی اور تعطیلات گرما میں بھی، غرض یہ ہوتی ہے کہ ان بچوں کے لیے
فریح اور دل چسپی کے مشغلے بہم پہنچائے جائیں جو بصورت دیگر اپنے وقت کا پورا فائدہ نہ
ٹھاتے۔ کئی مدرسوں کے طلبہ سماجی زندگی میں حصہ لینے کے لیے کارخانوں میں سائنسی تجربہ گاہوں ۔

تعمیری منصوبوں، بڑی بڑی تجارتی دکانوں۔ فارموں، میونسپل دفتر اور ریاستی قانون ساز مجلس کے کام کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ طلبہ مدرسے میں بھی قانون ساز مجلس کا نمونہ تیار کرکے آئینی بحث سیاسی طریقہ سیکھتے ہیں۔

امریکہ میں ابتدائی مدرسوں کی تعداد جس تیزی سے بڑھی ہے اور ان کے نظام میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ ابھی اور ترقی کریں گے۔ آج ابتدائی مدرسوں کو دو شدید سوالوں کا سامنا ہے، پہلا استادوں کی کمی اور ان کی تھوڑی تنخواہ۔ دوسرا بچوں کی شرح پیدائش میں اضافہ، اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائی مدرسے جو پہلے ہی تعداد طلبہ کے بوجھ تلے دبے ہیں، ہر سال ہزاروں نئے بچوں کی تعلیمی ضرورتوں کے لیے ذمہ دار ہوتے جائیں گے۔ ان کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ آبادی اب تک بھی مغرب کی طرف کھنچی جا رہی ہے اور دیہات چھوڑ کر شہروں کا رُخ کر رہی ہے، اس سے نئی ضرورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

امریکی تعلیم میں آج ثانوی مدرسے کو جو اہم مقام حاصل ہے اس کے لیے کئی عوامل ذمہ دار ہیں مثلاً انیسویں صدی میں عوامی تعلیم کی ترویج۔ مدرسوں میں زیادہ بڑی عمر تک حاضری کا لازمی قرار دیا جانا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد تعلیم کی مانگ کا ایک دم بڑھ جانا۔ اور دوسرے سماجی دباؤ جن کا ذکر اوپر گذرا ہے۔ لیکن ثانوی مدرسے کی یہ اہمیت بالکل حال ہی کی بات ہے۔ ۱۸۷۰ء میں ثانوی مدرسوں کے طلبہ کی تعداد اتنی کم تھی کہ ان میں سے تین چوتھائی کالج کا رخ کرتے تھے۔ آج گو ان میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد بہت بڑھ چکی ہے، پھر بھی ثانوی مدرسے سے فارغ التحصیل ہونے والوں کی اکثریت کالج کی بجائے کام کاج کی طرف رُخ کرتی ہے، اس صورت حال نے مدرسے پر ذمہ داریاں عائد کی ہے کہ وہ نہ صرف کتابوں کے دھنی طلبہ کی ضرورتوں کو پورا کریں بلکہ پڑھائی لکھائی میں کم چلنے والے اور کام کاج کے دھنی طلبہ کی ضرورتوں کو بھی، اس ضمن میں گو ابھی معیاری کامیابی حاصل نہیں ہوئی تاہم مدرسوں نے یہ فرائض پورے کیے ہیں، اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اس بات کا اہتمام بھی کیا ہے کہ جمہوری اقدار کو ترقی دی جائے اور جذبات رفاقت کو مضبوط بنا کر جمہوریت کی

تری سے تو می ترکی جائیں ۔

مخصوص قسموں کی تعلیم

بعض مخصوص تعلیمی ضرورتیں ایسی ہیں جو عام مدرسے پوری نہیں کر سکتے، مثلاً پیشہ ورانہ مشورہ تعلیم بالغان، بدنی اور ذہنی طور پر معذور بچوں کی تعلیم یہ ایسی تعلیمی ضرورتیں ہیں جو بعض اوقات خود مختار تعلیمی اداروں سے پوری کرتے ہیں اور بعض اوقات ان کا بندوبست نصاب مدرسہ کے ساتھ ہی کر دیا جاتا ہے، حالیہ برسوں میں مخصوص پیشہ ورانہ رہنمائی اور تربیت کی ضرورت کا احساس بہت زور پکڑ گیا ہے، اس لیے مدرسوں اور کالجوں میں پیشہ ورانہ مشیر کا کردار بہت اہمیت حاصل کر گیا ہے، ماہرین نے ایسی آزمائشیں وضع کی ہیں جن کی بنا پر پیشہ ورانہ رجحان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اگرچہ یہ پیشگوئی کلی طور پر تسلی بخش نہیں تاہم اس کی روشنی میں پیشہ ورانہ تربیت کا انتظام کرنے میں سہولت رہتی ہے ۔

ایک آزاد جمہوری معاشرے میں عوامی تعلیم کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ شہری کے مدرسہ یا کالج چھوڑنے کے بعد بھی اس کی لگاتار تعلیم کا بندوبست کرے بشتہ ۱۹ء کے بعد امریکی قوم میں بالغ آبادی کی تعلیمی سطح تیزی سے بلند ہوئی ہے، اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم بالغان کے تصور اور اس کے احاطہ کار میں بڑی وسعت پیدا ہوئی ہے ۔ بے شمار آبادیوں نے عملی طور پر ثابت کر دکھایا ہے کہ تعلیم بالغان کی وساطت سے کتنا ٹھوس تعمیری کام کیا جا سکتا ہے، یہ کام بعض اوقات مقامی وسائل کے بل بوتے پر انجام دیا گیا ہے اور بعض اوقات معمولی سرکاری مدد بھی حاصل کی گئی ہے ۔

دوسرے ملکوں کی طرح امریکہ میں بھی کئی لوگ ایسے ہیں جو بدنی یا دماغی طور پر اس حد تک معذور ہیں کہ انہیں مسلسل علاج اور دیکھ بھال کی ضرورت ہے تیس سے چالیس لاکھ کے درمیان بچے ایسے ہیں جن کی بینائی سماعت گویائی یا کسی دوسرے جسمانی عضو میں سخت نقص ہے یا جو ذہنی طور پر ضعیف ہیں لیکن پھر بھی مدرسے میں جانے کے قابل ہیں یا جو جذباتی اور مجلسی طور پر ہم آہنگ نہیں، یہ سب بچے ایک ایسے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جسے مدرسے کی عام پڑھائی سے فائدہ نہیں پہونچ سکتا، حالیہ سالوں میں کئی ایسی تدبیریں زیر عمل لائی گئی ہیں جن کی مدد سے ان بچوں کی مشکلوں کا حل ڈھونڈا گیا ہے بعض خاص

مدرسے اس قسم کے بچوں ہی کے لیے قائم کیے گئے ہیں لیکن ان ساری کوششوں کے باوجود ابھی معذور بچوں کا مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوا۔

اعلیٰ تعلیم

اب تک صرف مدرسوں کی تعلیم کا ذکر تھا، یہ تمہید اس لیے ضروری تھی کہ اس کو سامنے رکھے بغیر اعلیٰ تعلیم کے بعض پہلوؤں کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نیچے کی سطروں میں امریکہ کے اعلیٰ تعلیمی اداروں پر تفصیلی نگاہ ڈالی جائے گی۔

اعلیٰ تعلیم سے مراد وہ تعلیم ہے جو ثانوی تعلیم کے بعد جاری رکھی جائے خواہ یہ تعلیم کسی کالج میں وسیع المشرب فنون یا سائنس کا نصاب ہو یا کسی مخصوص فنی یا پیشہ ورانہ درس گاہ کی تعلیم ہو۔ امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کے ادارے بے حد مختلف قسموں کے ہیں اور ان کی ترقی کی تاریخ امریکی ثقافت کی آئینہ دار ہے۔ اعلیٰ تعلیمی ادارے طرح طرح کے ہیں، مثلاً وسیع المشرب فنون کے کالج، یونیورسٹیاں، جونیئر زراعتی کالج، تجارتی کالج، انجینئرنگ کالج، اساتذہ کے کالج اور دوسرے ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ کالج۔

اداروں کی مالی ذمہ داری مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک کے کندھوں پر ہے :-

۱. ریاست کا خزانہ یا میونسپل کمیٹی کا خزانہ

۲ پرائیویٹ ایجنسیں ۔

۳ ۔ مذہبی جماعتیں ۔

ان اداروں کے مقاصد، نصاب ہائے تعلیم اور طریقہ ہائے تدریس میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اس کا اندازہ ان دو فرانسیسی طلبہ کے تاثرات سے ہو سکتا ہے جنہوں نے دو مختلف اداروں میں تعلیم پائی تھی۔ ان میں سے ایک کی رائے یہ ہے "جب میں ریاستہائے متحدہ میں آیا تو مجھے امریکی کالج کے طریق کار کے متعلق تقریباً کچھ خبر نہ تھی، مجھے صرف اس قدر بتایا گیا تھا کہ یہاں پڑھائی کا کام بہت سہل ہوگا بلکہ اس کے برعکس مجھے یہ کام بے حد دشوار معلوم ہوا بالخصوص شروع شروع میں۔"

اس کے مقابلے میں ایک اور فرانسیسی طالب علم نے جو دوسرے کالج میں پڑھتا تھا اپنے

زات اس طرح بیان کیے ہیں :-

"میرے خیال میں امریکی اور فرانسیسی یونی ورسٹیوں کی تعلیمی سطح پر زیادہ توجہ دینی چاہیے، امریکہ کے
رٹس کالجوں میں جو نصاب رائج ہیں وہ فرانس کے مقابلے میں بہت گھٹیا ہیں"۔

امریکی تعلیمی مباحث میں عام طور پر کالج اور یونی ورسٹی کو متبادل الفاظ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے
جس سے فہم مطالب میں بڑی گڑبڑ ہوتی ہے۔ مطالب کی وضاحت کے لیے دونوں الفاظ اپنے الگ الگ
معانی میں استعمال ہونے چاہئیں۔ ایک کالج ثانوی مدرسہ کے بعد چار سالہ نصاب پیش کرتا ہے جس کے
خاتمہ پر بی۔اے کی ڈگری ملتی ہے، اور طالب علم آگے گریجوایٹ اسکول میں داخل ہوسکتا ہے، کئی کالج
یونی ورسٹیوں ہی کا ایک حصہ ہیں لیکن کئی اپنی جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں، جونیئر کالج صرف دو سالہ نصاب
پیش کرتا ہے جو آرٹس کالج کے پہلے دو سالہ نصاب کے برابر ہوتا ہے۔ کالج کے برعکس یونی ورسٹی میں نہ صرف
آرٹس کالج کی تعلیم ہوگی بلکہ پوسٹ گریجوایٹ تعلیم بھی اور چند فنی اور پیشہ ورانہ ادارے بھی۔

بعض ادارے ایسے بھی ہیں جو آرٹس کالج کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ صرف ایک یا ایک سے زائد مضامین
میں مخصوص پیشہ ورانہ تعلیم دیتے ہیں، مثلاً وکالت۔ مذہب یا موسیقی کی تعلیم۔ ایسے ادارے پیشہ ورانہ مدرسے
کہلاتے ہیں، یونی ورسٹیوں میں بھی ان مضامین کے خاص شعبے موجود ہوتے ہیں۔ اساتذہ کے کالج پیشہ ورانہ
مدرسوں کی ایک قسم ہے۔

ریاستہائے متحدہ کے دفتر تعلیم نے ۱۹۴۹-۵۰ء میں اعلیٰ تعلیمی اداروں کی تعداد کے متعلق جو اندازہ
لگایا تھا اس کے مطابق یہ تعداد ۱۸۵۸ ہے۔ ان میں سے ۸۲۹ کالج اور یونی ورسٹیاں ہیں ۲۷۰
ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ مدرسے ہیں، ۲۱۸ اساتذہ کے کالج ہیں اور ۵۴۱ جونیئر کالج ہیں۔ اس تعداد میں
صرف وہ اعلیٰ تعلیمی ادارے شامل ہیں جو ثانوی درجہ کے بعد دو یا دو سے زیادہ سال کا نصاب پیش کرتے ہیں
لہذا یہ ان اداروں کی پوری تعداد نہیں جو ثانوی درجہ سے اوپر تعلیم دیتے ہیں۔ (باقی)

سمندری عجائبات

ادریس احمد — مسلسل نمبر

کنگھی نما جیلی

جیلی مچھلی سے ملتے جلتے شفاف جسم کے جانور سمندری ساحلوں پر تقریباً ہر جگہ نظر آتے ہیں، یہ دراصل جیلی مچھلی نہیں بلکہ انہیں کنگھی جیلی کہا جاتا ہے، یہ تقریباً شیشے کی طرح شفاف جسم رکھتے ہیں، ان کے جسم پر آٹھ جگہ کنگھی جیسے دندانے ابھرے ہوتے ہیں، یہ ان کی مدد سے حرکت کرتے ہیں، ان آٹھ کنگھیوں کا ہر دندانہ چپو کا کام کرتا ہے اور جانور کو تیزی سے تیرنے میں مدد دیتا ہے، چاندنی میں تیرتے وقت ان چپوؤں کی حرکت ایک ایسی نیلگوں چمک پیدا کرتی ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ کنگھی جیلی اس قدر نرم و نازک ہوتی ہے کہ اگر اسے ہاتھ میں اٹھایا جائے تو اس کا شفاف جسم پاش پاش ہونے لگتا ہے، جسامت میں یہ جانور ایک انگور کے دانے سے لے کر ایک بڑی ناشپاتی تک ہو سکتا ہے، اس کی چند ایک اقسام ہیں۔ پانی سے باہر نکالو تو اس کے دندانے دار چپو خوب جگمگانے لگتے ہیں۔

ان کی ایک قسم شکل میں تقریباً گول ہوتی ہے، اس کے جسم سے نیچے دو لمبے روئی دار بال لٹکتے نظر آتے ہیں۔ یہ قسم خاص دلچسپی کا باعث ہے، کیوں کہ حقیقی جیلی مچھلی کی طرح اس کے لمبے بال ہوتے ہیں گو ان کی تعداد صرف دو ہے، انہیں حسب منشا اوپر یا نیچے کیا جا سکتا ہے۔ ان بالوں میں کاٹنے والے غدے تو نہیں البتہ ان کی بجائے قدرت نے انہیں ایک اور ہتھیار دے رکھا ہے۔ ان میں ایک چپکنے والی گوند سی نکلتی ہے جو ہر چھونے والی چیز پر چپک جاتی ہے، چھوٹے چھوٹے سمندری کیڑے اس گوند کے ساتھ چپک چپک کر جمع ہوتے رہتے ہیں، جب ایک اچھا خاصہ نوالہ تیار ہو جاتا ہے تو بال سکڑ کر اسے کنگھی جیلی کے پیٹ میں ٹھونک دیتا ہے۔

پرائے نیش سمندری ساحلوں کے کم گہرے پانی کی تہ پر ایک اور عجیب و غریب جانور پایا جاتا ہے

ں میں یہ ایک موٹے کیڑے سے ملتا جلتا ہے۔ بچپن میں اس کے جسم پر ایک خول ہوتا ہے لیکن
نی میں یہ خول گر جاتا ہے۔ اس جانور کی لمبائی اور موٹائی انگلی کے برابر ہوتی ہے۔ اس لمبوترے جسم
خری سرے سے نرم و نازک عضلات کی شاخیں باہر نکلتی ہیں۔ ان نرم و نازک عضلاتی شاخوں
دیواروں میں سے یہ جانور اپنے خون میں اردگرد کے پانی میں سے ہوا جذب کرتا ہے۔ بظاہر یہ جانور
ے لبادے دکھائی دیتے ہیں لیکن جب ان کی جسمانی ساختوں اور ان کے افعال پر غور کرو تو یہ
ن الخالقین کی صنعت کا عجیب و غریب کرشمہ نظر آتے ہیں۔

ان کیڑوں کی عام غذا وہ ننھی ننھی جیلی مچھلیاں ہیں جو سنگچیروں کے ساتھ سمندری کائی کی شکل
ں چپٹی رہتی ہیں۔ جیلی مچھلی کی نیلش کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جیلی مچھلی کا نیش نہ
نہ اس کیڑے کو کوئی اذیت نہیں دیتا بلکہ اس کے معدے میں سے کسی پُراسرار طریقہ پر اس کے جسم پر
ل آتا ہے اور اس جگہ بچاؤ کی وہی خدمت انجام دینے لگتا ہے جو جیلی مچھلی کے جسم پر دیتا تھا۔ مدتوں
ے علم الحیوانات کے ماہروں پر یہ راز نہ کھل سکا کہ اس کیڑے کی جلد پر یہ نیلش کہاں سے آ گیا کیونکہ
س کی اپنی ساخت اس کی حقیقی متقاضی نہیں۔ بالآخر جب اس کیڑے کی غذائی عادتوں کا مطالعہ کیا
یا تو یہ بھید کھلا کہ یہ نیش اس کا اپنا نہیں پرایا ہے۔

دار بھاٹا کے چھوٹے جوہڑ

جب جوار بھاٹا ساحل سے دور ہٹتا ہے تو اپنے پیچھے جگہ جگہ پانی کے چھوٹے چھوٹے جوہڑ چھوڑ
جاتا ہے۔ اول اول اس شفاف پانی میں ٹھنڈی سی کائی اور چند گھونگوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں
دیتا۔ تھوڑی دیر گزرنے پر اس کی تہ پر عجیب و غریب چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں جن کو چھوٹے پتھر
یا کنکریاں سمجھا گیا تھا وہ ہلنے لگتی ہیں، دیکھتے دیکھتے کچھ پھول کھل آتے ہیں۔ لیکن یہ چیزیں بس
جوار بھاٹا کے ان جوہڑوں میں دکھائی دیں گی جو ساحل سے کافی پرے عام آمدورفت سے دور ہوں
ہذا یہ جوہڑ وہی ہو سکیں گے جو پست جوار بھاٹا نے پیدا کیے ہوں۔ اور جوار بھاٹا خشکی کے اندر دور تک
چلا آتا ہے۔

سمندری پھول

جوار بھاٹا بعض سمندری لوادر کو پانی کے چھوٹے چھوٹے جوہڑوں میں پھینک جاتا ہے ان میں ایک حیرت انگیز شے سمندری پھول ہیں، فی الحقیقت یہ نباتات نہیں بلکہ حیوانات کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ جیلی مچھلی کی جنس سے ہیں۔ جیلی مچھلی آزادانہ تیرتی پھرتی ہے۔ لیکن یہ پھول کسی چٹان وغیرہ سے چمٹے رہتے ہیں، ان کی پتیاں اور نرم و نازک بالوں سے بھری پنکھڑیاں دراصل جیلی مچھلی کی طرح نیش سے بھرے ہوئے پھندے ہیں، جو سمندر کے ننھے ننھے جانوروں کو پھانس پھانس کر پھول کے لیے غذا مہیا کرتے رہتے ہیں۔

شمالی نصف کرہ کے سمندری پھول عام طور پر انسان کے لیے بے ضرر ہیں۔ جہاں کہیں جوار بھاٹا کے جوہڑ میں کوئی سمندری پھول کھلا نظر آئے اسے غور سے دیکھو۔ اب ذرا سے ہاتھ سے چھوؤ۔ پھول جھٹ بند ہو کر ایک بے شکل چکنے تودے کی صورت اختیار کر لے گا۔ اب چند قدم پیچھے ہٹ کر کچھ دیر تک دیکھتے رہو۔ تھوڑی دیر بعد یہ غنچہ پھر کھلنے لگے گا اور آہستہ آہستہ پھول اپنی پہلی شکل اختیار کر لے گا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ پھول نہیں بلکہ ایک ذی روح جانور ہے۔

سمندری پھول دنیا میں ہر جگہ ملتے ہیں، وہ جوار بھاٹا کے جوہڑوں۔ بندرگاہوں کی گودیوں کے نچلے حصوں، ڈوبے ہوئے جہازوں یا سمندر کی تہ کے ساتھ چمٹے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے حس و حرکت ہیں۔ لیکن وہ ہلنے جلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ہاں ان کی حرکت کی رفتار بے حد سست ہے اور وہ اس سطح پر سے اپنی گرفت ہرگز نہیں چھوڑتے جس کے ساتھ وہ چپٹے ہوں۔ سمندری پھول جسامت میں انچ کے ایک چھوٹے حصے سے لے کر دو فٹ تک کی چوڑائی کو پہنچ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے سمندری پھول آسٹریلیا کی بڑی چٹانی تہ پر ملتے ہیں۔

سمندری پھولوں کی زندگی کی مدت بھی ایک سی نہیں۔ بعض پھول ایک سال کے بعد ختم ہو جاتے ہیں لیکن بعض کی عمر ستر سال تک دیکھی گئی ہے۔ جو سمندری پھول استوائی سمندروں میں پائے جاتے ہیں، ان کے رنگ زیادہ بھڑکیلے ہوتے ہیں۔ پودوں اور سمندری پھولوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ جہاں پودے اپنی

خوراک ہوا اور دھوپ سے حاصل کرتے ہیں وہاں سمندری پھول جانوروں کو کھا کر جیتے ہیں، ان کے تنوں، شاخوں اور پنکھڑیوں کو خوردبین میں سے دیکھا جائے تو یہ صاف طور پر گوشت کے بنے ہوئے اور خوراک کی تلاش میں ہر وقت تھرتھراتے نظر آتے ہیں۔

ایک خاص قسم کا ننھا سمندری پھول ایک مخصوص قسم کے کیکڑے کی دم کے ساتھ چمٹا رہتا ہے، اس پھول کا زہر دوسری قسم کے کیکڑوں کے لیے مہلک ہے، لیکن اس خاص کیکڑے کے لیے بے ضرر ہے۔ اسی طرح بعض استوائی سمندری پھول ایسے ہیں جن کے درمیان چھوٹی چھوٹی بھڑکیلے رنگ کی مچھلیاں رہتی ہیں۔

ستارہ مچھلی بھی سمندری پھولوں کی جنس سے تعلق رکھتی ہے، یہ مختلف رنگوں کی ہوتی ہے، اس کی پنکھڑیاں ستاروں جیسے سفید دھبوں سے ڈھکی ہوتی ہیں، یہ مچھلی سیپ میں چھپے ہوئے کیڑوں کا بڑی کامیابی کے ساتھ شکار کرتی ہے، یہ کیڑے سیپ سمیت کیچڑ میں چھپے رہتے ہیں لیکن ستارہ مچھلی اس سوراخ سے اس زور کے ساتھ ہوا باہر کھینچتی ہے کہ سیپ کا منہ کھل جاتا ہے اور کیڑا ننگا ہو جاتا ہے — سیپ کے شکاری ستارہ مچھلی کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور اسے جہاں دیکھ پائیں تباہ کر دیتے ہیں۔

سمندری پھولوں میں ایک نہایت خوب صورت پھول سمندری گلاب ہے، جسامت میں یہ پن کے سر سے کوئی دو تین گنا بڑا ہوتا ہے، اس کے حسن کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے خوردبین کی ضرورت ہے، سمندری گلاب کو پہلی نگاہ میں جانور خیال کرنا بڑا مشکل ہے، وہی نرم و نازک پنکھڑیاں۔ بیچ میں سنہری زردانہ اور ارد گرد پتیاں۔ ان کے نیچے شاخ لیکن کچھ دیر غور کرنے سے صاف نظر آنے لگتا ہے کہ یہ خوب صورت پھول نباتاتی مادے کا نہیں بلکہ لحمی مادے کا بنا ہے، اس کا نیش اگرچہ انسانی ہاتھوں کے لیے بے ضرر ہے لیکن چھوٹے چھوٹے سمندری جانداروں کے لیے مہلک ہے۔ سمندری گلاب کے باغ میں سے ایک گچھا ہاتھ سے توڑو تو یہ جھٹ بے شکل پھلپھلے تودے کی شکل اختیار کر لے گا، اسے ایک بالٹی میں ڈال دو جس میں تازہ سمندری پانی بھرا ہوا ہو۔ چند منٹوں بعد یہ بے شکل تودہ پھر سے گلاب کی پھلواڑی میں بدل جائیگا۔

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

ٹیلی ویژن کے امکانات

ٹیلی ویژن کے تعلیمی امکانات اس قدر زیادہ ہیں کہ بعض اوقات تصور بھی ان کا پوری طرح احاطہ کرنے سے عاجز آجاتا ہے۔ لندن یونی ورسٹی کی تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر ایم۔ ایم لوئس نے کہا ہے، کہ ٹیلی ویژن ایک زبردست تعلیمی قوت ثابت ہوسکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ میں ٹیلی ویژن سے تعلیمی فائدہ اٹھانے کے لیے کوئی جلد بازی نظر نہیں آتی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بی بی سی، اس معاملہ میں اس لیے تاخیر کر رہی ہے کہ جب اس سمت میں قدم اٹھایا جائے تو اس طرح مؤثر طور پر اٹھایا جائے کہ تعلیمی پروگرام تفریحی پروگراموں کا مقابلہ کر سکیں۔ اس ضمن میں "سائنس ریویو" کا ہفتہ وار پروگرام ایک مثال ہے، یہ پروگرام اگرچہ عام دیکھنے والوں کے لیے پیش کیا جاتا ہے پھر بھی ثانوی جماعتوں کے طلبہ اس سے کافی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک واضح حقیقت یہ ہے کہ تعلیمی پروگرام پر بھی اتنا ہی خرچ آتا ہے جتنا کسی دوسرے پروگرام پر، لیکن اس میں دلچسپی لینے والوں کی تعداد تھوڑی ہوتی ہے۔ نیز اس میں عام پروگراموں کی طرح اشتہارات سموئے نہیں جا سکتے۔ امریکہ میں ٹیلی ویژن کا ایک تجرباتی اسٹیشن خالص تعلیمی اغراض اور غیر تجارتی بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق جو رپورٹ شائع ہوئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ امریکی معیاروں کے مطابق بھی اس اسٹیشن کے اخراجات بے حد بوجھل ہیں اور اصل اندازے سے چار گنا ثابت ہوئے ہیں۔ یہ اس ملک کی حالت ہے جو نہ صرف دولت میں دنیا بھر میں پہلے درجے پر ہے بلکہ جہاں خیراتی کاموں پر صرف ہونے والے روپے کی بھی فراوانی ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ کم از کم موجودہ حالات میں تعلیمی ٹیلی ویژن کے امکانات زیادہ روشن نہیں۔ خال خال تعلیمی پروگرام اب بھی پیش ہوتے ہیں لیکن جب تک بی بی سی اس کام کو ہاتھ میں نہیں لیتی اس وقت تک اس کی تعلیمی افادیت عام

نہیں ہو سکتی۔ بی بی سی کو اس میدان میں تجارتی ٹیلی ویژن سے کڑا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اور تعلیم کو اس مقابلے سے کافی نقصان پہونچے گا۔

تعلیم بالغاں

انگلستان کے کئی ماہرین تعلیم اپنے ملک کے تعلیم بالغاں کے پروگراموں سے مطمئن نہیں تاہم تعلیم بالغاں نے ماضی میں پس ماندہ طبقوں کی اتنی خدمت کی ہے کہ اسے کھلم کھلا برا نہیں کہا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ ایک مشہور ماہر تعلیم نے حال ہی میں اس موضوع پر تقریر کرتے ہوئے صرف اس بات پر اکتفا کی کہ ماضی کی کامیابیاں بیان کر دی جائیں اور مستقبل کی ضرورتوں پر زور دیا جائے۔ ماضی میں تعلیم بالغاں کی بڑی قوت اس نکتہ میں مضمر رہی ہے کہ اس نے کم نصیب لوگوں کے مجلسی اور سیاسی حقوق کے لیے جنگ لڑی، اب جبکہ یہ حقوق مل چکے ہیں اور کون سے میدان مارنے باقی ہیں؟ ڈاکٹر ایش بی نے کہا کہ اب تعلیم بالغاں کو دور حاضر کی بنیادی جمہوری ضرورتوں پر زور دینا چاہیے۔ موجودہ رفاہی ریاست کے پدرانہ نظام میں فرد کو جو حیثیت حاصل ہونی چاہیے اب اسے موضوع بنانا چاہیے۔ اگر یہ اصول مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ دلیل اب کارگر نہیں رہے گی کہ محنت کشوں کو صرف ایسی تعلیم ملنی چاہیے جس کی انہیں عملی ضرورت ہو۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تمام شہری خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں اب رفاہی ریاست کا جزو ہیں، وہ مختلف تنظیموں میں منسلک ہیں جو خواہ ریاست کے ماتحت ہیں، محنت کش ایا مزدور انجمنوں کی وہ نمائی قبول کر چکے ہیں اس لیے مزدوروں کی تعلیم کا بندوبست یہ انجمنیں ہی کر سکتی ہیں۔ اس طرح تعلیم بالغاں کے مستقبل کا انحصار اس بات پر ہے کہ مزدور انجمنیں اس سے کیا خدمت لیتی ہیں۔

لوکل باڈیز کا تعلیمی خرچ

انگلستان میں تعلیمی اخراجات کا بیشتر حصہ لوکل باڈیز برداشت کرتی ہیں، ان کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ان کا مالی بوجھ ہلکا کر دیا جائے، قدامت پسند جماعتوں نے اس مطالبہ کو رد کر دیا ہے، دلیل یہ دی گئی ہے کہ اگر لوکل باڈیز کو کل تعلیمی خرچ کا صرف معمولی سا حصہ برداشت کرنا پڑے

مثلاً یہی ٹیکس فی صد ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ روپیہ خرچ کرنے میں مناسب احتیاط سے کام نہیں لے گی۔ اس صورت حال کا دوسرا بڑا خطرہ یہ ہے کہ مرکزی حکومت مقامی تعلیم پر زیادہ قابو حاصل کرے گی۔ پھر یہ کیا ضروری ہے کہ حکومت نئے ٹیکس لگا کر اس رقم سے زیادہ جمع کرے گی جو اس وقت لوکل باڈیز مقامی ٹیکسوں سے جمع کر رہی ہیں؟ پھر یہ بھی عین ممکن ہے کہ تعلیمی امداد دیتے وقت حکومت بعض لوکل باڈیوں کو زیادہ فراخ دلی سے روپیہ دیدے اور بعض کو کم۔ غرض مرکزی حکومت کو مالیات پر زیادہ قابو دینا کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں۔ مقامی آبادی ہی اس بات کا فیصلہ کر سکتی ہے کہ اس کی تعلیمی ضرورتیں کیا ہیں اور ان پر کس قدر خرچ ہونا چاہیے۔ پس یہ ذمہ داری بھی اسی کی ہے کہ آمدن کے ذرائع خود پیدا کرے۔

دینیات کا علم

انگلستان کے قانون تعلیم مجریہ ۱۹۴۴ء کی رو سے مذہبی تعلیم تمام مدرسوں میں لازمی قرار دی گئی ہے۔ مسیحی تعلیم کی انسٹی ٹیوٹ واقع لندن کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے جے۔ اے۔ ملٹ نامی ایک صدر معلم نے یہ سوال اٹھایا کہ آیا دینیات کی تدریس کا کام مدرسے کے تمام استادوں میں بانٹ دینا چاہیے یا اسی غرض کے لیے دینیات کے عالم مقرر ہونے چاہئیں۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اس نے کہا کہ میں دوسری تجویز کے حق میں ہوں۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ ایک ہر دلعزیز ورزش ماسٹر یا سائنس ماسٹر جس نے طلبہ کے دلوں میں حقیقی عزت حاصل کر لی ہے دینی تعلیم کے معاملہ میں اس معلم دینیات سے زیادہ بہتر کام کر سکتا ہے جو طلبہ میں مقبول نہ ہو۔ اگر عام مضامین پڑھانے والے استاد تدریس دینیات کے لیے رضامند ہوں اور اس چیز کی اہلیت بھی رکھتے ہوں تو وہ بہت زیادہ بہتر کام کر سکتے ہیں۔ طلبہ کو ان استادوں کی دینداری کا عام علم ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ دینیات کے اچھے استاد بن سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہب اور انجیل کا مطالعہ بڑا مشکل کام ہے اور اس موضوع پر متضاد علمی خیالات موجود نہیں۔ ان موضوعات پر آج طرح طرح کے سوال پیدا ہوئے ہیں۔ ان سوالوں کا معقول اور تسلی بخش جواب تلاش کیے بغیر انجیل اور مذہب

جسے رہنا مشکل ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ استادوں میں سے ہر ایک تھوڑی تھوڑی ریاضی پڑھادیا کرے، یا ہر ایک تھوڑی تھوڑی فرانسیسی زبان پڑھادیا کرے؟ واضح وجوہ کی بنا پر ایسا نہیں ہو سکتا بالکل یہی حال دینیات کا ہے، اس مضمون کی تدریس کے لیے بھی الگ استاد ہونے چاہئیں۔

دنیا کی سب سے ننھی آرٹسٹ

بی بی سی سے ٹیلی ویژن کے تعلیمی پروگرام بھی پیش ہوتے رہتے ہیں۔ ایک ایسے پروگرام میں ایک بہت چھوٹے بچے کے سٹیج پر آنے کی ضرورت پیش آئی۔ برطانوی حکومت نے بارہ سال سے کم عمر بچوں کے ٹیلی ویژن پر آنے پر پابندیاں لگا رکھی ہیں، چوں کہ بی بی سی کا یہ پروگرام خاص تعلیمی افادیت کا حامل تھا، اس لیے یہ پابندیاں خاص اس پروگرام کے لیے نرم کردی گئیں اور سارا نامی ایک ننھی بچی جس کی عمر صرف ۴۲ دن تھی ٹیلی ویژن کے پردہ پر دیکھی گئی۔ پیدائش کے وقت سارا کا وزن ۷ پونڈ ۸ اونس تھا۔ سارا دنیا میں سب سے کم عمر آرٹسٹ ہے جو ٹیلی ویژن کے پردہ پر آئی۔

روسی تعلیم کے نقائص

مشہور روسی اخبار "پراودا" نے اپنے ایک حالیہ اداریہ میں روسی تعلیم کو موضوع بنایا۔ یہ اداریہ بڑے پر امید لہجہ میں شروع ہوا۔ لیکن آخر میں ان خامیوں کا ذکر کیا گیا جو روسی تعلیم کی افادیت کو کم کر رہی ہیں۔ پراودا کا اداریہ ان الفاظ سے شروع ہوا تھا۔ "بہت سے مدرسے صنعتی کارخانوں اجتماعی فارموں اور مشین ٹریکٹر سٹیشنوں کے ساتھ گہرے روابط قائم کر رہے ہیں، ان کی کوشش یہ ہے کہ محنت کار کے جذبے کو ترقی دیں"۔ اس حوصلہ افزا تمہید کے بعد روسی مدرسوں کی خامیوں کی فہرست آتی ہے۔ مثلاً ناکام رہنے والا طلبہ کا تناسب بعض اضلاع میں تیس سے پچاس فی صد ہے، جب تک استاد، طلبہ اور متعلقہ حکام کوشش اور محنت سے کام نہیں لیتے یہ صورت حال ختم نہیں ہو سکتی۔ پراودا کو شکایت ہے کہ نوجوان استاد تدریسی طریقوں سے اچھی طرح واقف نہیں وزارت تعلیم کو چاہیے کہ ان لوگوں کو مؤثر تدریس کے ڈھنگ سکھانے کا بندوبست کرے۔ پراودا نے ایک مدرسے کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے: یہاں حکام نے ہدایات۔ احکام اور فرمانوں کی بے تحاشہ

بو چھاڑ کی ہے لیکن اس کے باوجود حالات نہیں جرے۔ پرادا نے نوجوان طلبہ سے اپیل کی ہے کہ وہ طلبہ کی تنظیمیں قائم کریں۔ اگرچہ ساتھ ہی اس نے یہ گلہ بھی کیا ہے کہ اس قسم کی بعض تنظیمیں اپنا کام سرگرمی سے نہیں کر رہیں۔ سارے اداریہ میں پرادا نے کسی خاص تعلیمی حکمت عملی کی نشان دہی نہیں کی۔ اس کا خیال ہے کہ بد نظمی انتہاء مدرسوں کی اصلاح حال پر متوجہ کر دے گا۔

وزیر تعلیم کے خلاف غصہ

تعلیم کے کیتھولک فرقہ کو اپنی وزارت تعلیم کے خلاف سخت شکایت ہے۔ اس کی حکمت عملی کے خلاف جو غیض و غضب ظاہر کیا جا رہا ہے اس نے پچھلے مارچ میں کیتھولک طلبہ کے مظاہروں کی شکل اختیار کی جنہوں نے لودین کے مقام پر وزیر تعلیم موسیو کو لارڈ کا مجسمہ بنا کر اسے آگ کی نذر کیا اس کے بعد کیتھولک مظاہرین نے بیلجیم کے صدر مقام برسلز میں مظاہرے کرنے چاہیں لیکن اس امر کی ممانعت کر دی گئی۔

مدرسوں کے خلاف مقدمے

جرمنی کی سب سے بڑی عدالت نے برلن میں یہ فیصلہ دیا ہے کہ اگر سال گذر جانے پر کوئی مدرسہ ایک بچے کو اگلی جماعت میں ترقی نہ دے تو اس کے ماں باپ کو حق حاصل ہے کہ مدرسے کے خلاف دعویٰ دائر کر دیں۔ اس عدالت نے یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ اگر کوئی مدرسہ کسی لڑکے کا اخراج کر دے تو اسے انضباطی کارروائی نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ ایسی کارروائی کے خلاف بھی عدالتی چارہ جوئی ہو سکتی ہے۔

جعلی سندوں کا بیوپار

اٹلی کی پولیس نے روما کے ایک جعل ساز گروہ کے سات افراد کو اس جرم میں گرفتار کیا ہے کہ وہ یونیورسٹی کی جعلی سندیں بیچا کرتا تھا۔ سندوں کی قیمت آٹھ لاکھ سے دس لاکھ لائر تک وصول کی جاتی پاکستانی روپے میں یہ قیمت چھ ہزار سے آٹھ ہزار روپے تک پہنچتی ہے جعل ساز گروہ، روما، جنوا میلان اور باری کی یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے طب، قانون اور معاشیات کی جعلی سندیں بیچتا تھا۔ پولیس کو اس کی سرگرمیوں کا علم اس طرح ہوا کہ روما کی ایک بڑی تجارتی فرم نے پولیس میں شکایت کی کہ انہوں نے

جو شیر قانون لازم رکھتا ہے وہ قانون سے بالکل بے خبر معلوم ہوتا ہے ۔

استادوں کے عرصۂ تربیت میں توسیع

انگلستان میں کالجوں کے اساتذہ اور محکمۂ تعلیم کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی گئی تھی کہ وہ اس بات پر رپورٹ کرے کہ آیا موجودہ دو سالہ تربیت تدریسی ضرورتوں کے لیے کافی ہے یا اسے بڑھا کر تین سال کر دینا چاہیے۔ اس کمیٹی کے کام پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک برطانوی ٹریننگ کالج کے پرنسپل نے کہا ہے کہ یہ بات عجیب دکھائی دیتی ہے کہ انگلستان اپنے استادوں کی تربیت پر صرف دو سال صرف کرے جب کہ ڈنمارک جیسا ملک اپنے استادوں کی تربیت پر پانچ سال صرف کر رہا ہو، اور مغربی جرمنی، ہالینڈ، سوئٹزرلینڈ اور شمالی آئرلینڈ وغیرہ تین سال صرف کر رہے ہوں۔ یہ صورت حال قومی فخر کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑتی جب اس امر کا مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ تمام استادوں کی تنخواہوں کے گریڈ ایک سے ہوں اور بجا طور پر یہ مطالبہ بھی ہے کہ سب استادوں کی تعلیم ایک سی ہونی چاہیے تو کیا یہ بات عجیب نہیں کہ ایک ہی پیشہ میں داخل ہونے کے لیے دو راستے ہوں یعنی ایک گریجوایٹ ڈگری کا اور دوسرا سرٹیفکیٹ کا؟

اب یہ سوال باقی نہیں رہا کہ آیا استادوں کی تربیت کا نصاب سہ سالہ ہونا چاہیے یا نہیں بلکہ صرف یہ سوال باقی ہے کہ یہ تبدیلی کب ہو اور کس طرح عمل میں لائی جائے۔ اس ضمن میں قومی سطح پر دو نکات غور طلب ہیں۔ پہلا یہ کہ بچوں کی جو طغیانی اٹھی چلی آ رہی ہے وہ ۱۹۶۱ء میں مدرسوں میں سے گذر رہی ہوگی، دوسرا یہ کہ استادوں کی تربیت گاہوں کے لیے امیدواروں کی بہم رسانی جس رفتار سے بڑھ رہی ہے، اس کے مطابق ۱۹۶۰ء میں استادوں کی جو سالانہ تعداد دستیاب ہوگی وہ اس تعداد سے بقدر بیس ہزار زیادہ ہوگی جو ۱۹۵۰ء کے استاد شاگرد تناسب کے قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اب تک استادوں کی تعداد میں جو سالانہ اضافہ ہو رہا ہے اسے فی جماعت تعداد طلبہ کم کر کے جذب کیا گیا ہے۔

پرنسپل مذکور نے کہا اگر تربیت کو سہ سالہ بنانے کے لیے کوئی خاص تاریخ مقرر کر دی جائے بجائے اس کے کہ یہ تبدیلی آہستہ آہستہ رائج کی جائے تو اس سے ایک حسابی دقت پیش آئے گی۔ وہ یہ کہ تبدیلی رائج ہونے کے اگلے سال کوئی نئے تربیت یافتہ استاد کالجوں سے نہیں نکلیں گے۔ گویا کوئی نو ہزار استادوں کی کمی یک دم واقع ہو جائے گی۔ لیکن ایک خاص تاریخ مقرر کرنے میں دوسرے فوائد ایسے اہم ہیں کہ اس چھوٹی سی دقت کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ملک کی تعلیمی انجمنوں نے باہمی تعاون سے جو منصوبہ تیار کیا ہے اس میں نئی عمارتوں کی تعمیر، میعاد تربیت کی توسیع اور تعداد طلبہ فی جماعت کی کمی سب کے لیے ایک ساتھ گنجائش نکالی گئی ہے۔ ان حالات میں ۱۹۵۷ء یا ۱۹۵۶ء میں سہ سالہ تربیتی نصاب کا رائج کر دینا بالکل قابل عمل نظر آتا ہے

عراقی طلبہ کا احتجاج

برطانوی وزارت داخلہ نے سال ہی میں دو عراقی طلبہ کو حکم دیا کہ سلطنت متحدہ سے باہر نکل جائیں۔ پچھلے دو سالوں میں چار ایسے واقعات رونما ہو چکے ہیں جب عراقی طلبہ کو توسیع قیام کی اجازت نہیں دی گئی۔ کئی اور عراقی طلبہ کو یہ شکایت پیش آئی ہے کہ برطانوی وزارت داخلہ نے اس کے ویزا کی توسیع کرنے میں دو، دو مہینے کی تاخیر کر دی۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ ویزا کی توسیع ہوئی بھی تو صرف تین ماہ کے لیے۔ ان واقعات نے عراقی طلبہ کی انجمن کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ برطانوی وزارت داخلہ کے رویہ کے خلاف احتجاج کرے۔

سلطنت متحدہ میں اس وقت کوئی پانچ سو طلبہ تعلیم پا رہے ہیں، وہ عموماً ایک دو سال اس تیاری میں صرف کرتے ہیں کہ کسی برطانوی یونیورسٹی یا ٹیکنیکل کالج میں داخل ہو سکیں اس کے بعد وہ تین چار سال کسی نصاب کو پورا کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ وہ عموماً انجینیرنگ کا نصاب لیتے ہیں، یہ طلبہ عموماً عراقی حکومت کے وظیفوں پر آتے ہیں بعض صورتوں میں یہ وظیفے بند کر دیے جاتے ہیں، اس کی عام وجہ یہ ہے کہ ان طلبہ نے سیاسی سرگرمیوں بالخصوص اشتراکی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ایسی صورت میں طالب علم کو حق باقی رہتا ہے کہ

اپنے ذاتی خرچ پر پڑھائی جاری رکھے۔ عراقی حکومت نے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ ایسے طالب علم کو ملک بدر کر دیا جائے۔ لیکن برطانوی وزارت داخلہ نے کئی طلبہ کے ویزا کی تجدید سے انکار کر دیا ہے ایسے دو طلبہ مسٹر اے۔ بی۔ شیخ علی اور مسٹر آر شیخ علی کو انگلستان چھوڑنا پڑا۔ وزارت داخلہ کے ایک ترجمان نے کہا کہ ان دونوں کے معاملہ کا فیصلہ خالص تعلیمی وجوہ کی بنا پر کیا گیا ہے۔ یہ امر بالکل مشکوک ہے کہ آیا وہ طلبہ ہیں بھی یا نہیں، حقیقت یہ ہے کہ مسٹر اے۔ بی۔ شیخ علی کسی تعلیمی ادارہ میں داخلہ حاصل نہیں کر سکا۔ اس کے ویزا میں توسیع نہ کرنے کے لیے یہی ایک وجہ کافی ہے۔ لیکن یہ طالب علم الٹا یہ کہتا ہے کہ چونکہ وزارت داخلہ نے اسے ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس لیے وہ کسی جگہ داخل نہیں ہو سکا۔ مسٹر آر شیخ علی ہیمرسمتھ سکول آف آرٹس اینڈ کرافٹس کے تیسرے سال میں پڑھتا تھا۔ عراقی طلبہ کی انجمن نے شکایت کی ہے کہ برطانیہ سے نکالے جانے والے طلبہ میں سے اکثر کا تعلیمی ریکارڈ اچھا تھا۔ نیز محض تین ماہ تک ویزا بڑھا دینے سے وہ اطمینان سے کام نہیں کر سکتے۔

فرانسیسی استادوں کی ہڑتال

فرانس کے رومن کیتھولک اسکول عرصہ سے اس کوشش میں ہیں کہ انہیں سرکاری سرپرستی حاصل ہو جائے تعلیمی حلقوں میں دیر سے یہ سوال موضوع بحث ہے کہ آیا سرکاری امداد غیر مذہبی اسکولوں تک محدود رہے یا فرقہ وارانہ مدرسوں کو بھی ملے۔ اب یہ سوال دوبارہ اہمیت پکڑ گیا ہے، اس کی تفصیل یوں ہے کہ فرانسیسی حکومت نے دیہاتی رقبوں کے ۱۴ - ۱۷ سالہ نوجوانوں کو زرعی تربیت دینے کے لیے ایک وسیع منصوبہ بنایا تھا۔ رومن کیتھولک مدرسوں نے اسے عملی تشکیل دینے میں بڑا کام کیا، اس کارکردگی کے عوض میں انہوں نے سرکاری زر اعانت کا مطالبہ کیا لیکن اس زر اعانت کی منظوری کا مطلب کیتھولک سکولوں کے ہاتھوں میں بے حد اضافہ ہوگا۔ استادوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو اس صورت حال کو پسند نہیں کرتی جس روز یہ معاملہ فرانسیسی اسمبلی کے سامنے پیش ہونے والا تھا اس دن ان استادوں نے فرانس بھر میں ہڑتال کی تاکہ حکومت پر اپنے جذبات کا اظہار کریں۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجال ——————— شعبہ مدارس

ای/۷۲۸۰ ۱۱ ستمبر ۱۹۵۵ء — ق۔ بشیر احمد بی۔ اے۔ جے۔ اے۔ وی (۱۳۰/۰ روپے) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی بھٹیاں کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد جمیل جنجوعہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے، انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ننکانہ مقرر کیا گیا۔

〃 — م۔ محمد جمیل جنجوعہ۔ بی اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ننکانہ کو تاریخ حاضری سے م۔ عبدالحفیظ صدیقی کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول شرق پور مقرر کیا گیا۔

〃 — م۔ عبدالحفیظ صدیقی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول شرق پور کو تاریخ حاضری سے ق۔ بشیر احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے: قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی بھٹیاں مقرر کیا گیا۔

ای/۱۳۸۰۵ ۔۱ ستمبر ۱۹۵۵ء — م۔ محمد دین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد انور علی کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں مقرر کیا گیا۔

〃 — م۔ محمد انور علی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں (آزمائشی) کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد دین کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم مقرر کیا گیا۔

ای/۱۳۸۰۶ ۔۱ ستمبر ۱۹۵۵ء — م۔ صدیق اختر ایف۔ اے۔ سی۔ ٹی (۹۰ — ۱۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول تلہ گنگ (آزمائشی) کو تاریخ حاضری سے م۔ بشیر الدین کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے۔ انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال (آزمائشی) مقرر کیا گیا۔

۱۳۸۰/ م۔ محمد بشیر الدین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ۔۔ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال کو
رشتہ تاریخ حاضری سے م۔ صدیق اختر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام انگریزی مدرس
گورنمنٹ ہائی اسکول تلہ گنگ مقرر کیا گیا۔

۶۹۷۶/ م۔ محمد اقبال میٹرک ایس۔ وی۔ ایک امیدوار کو جن کی تقرری کے احکام -/۷۰ روپے ماہوار پر
رشتہ گورنمنٹ ہائی اسکول ڈسکہ کے لیے جاری ہو چکے تھے تاریخ حاضری سے م۔ خورشید مسیح کی
کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول سیالکوٹ
مقرر کیا گیا۔

// م۔ خورشید مسیح ۔ ایس۔ وی (۶۰ ۔ ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول سیالکوٹ کو
تاریخ حاضری سے م۔ محمد اقبال کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
ڈسکہ مقرر کیا گیا۔

۶۹۳۹/ م۔ مہر الٰہی قریشی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ۔۔ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
نمبر ۵۵ رشتہ تکانہ کو تاریخ حاضری سے م۔ عبدالعزیز بٹ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے انگریزی مدرس
گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال مقرر کیا گیا۔

// خان عبدالعزیز بٹ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ۔۔ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال
کو تاریخ حاضری سے م۔ مہر الٰہی قریشی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے انگریزی مدرس گورنمنٹ
ہائی اسکول ننکانہ مقرر کیا گیا۔

// عبدالمجید خاں۔ بی۔ اے۔ ایس اے وی (۱۳۰ ۔۔ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
ظفروال کو تاریخ حاضری سے چ۔ محمد اصغر علی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے انگریزی مدرس
گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ مقرر کیا گیا۔

// چ۔ محمد اصغر علی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ۔۔ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ کو
تاریخ حاضری سے چ۔ عبدالمجید خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس

گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال مقرر کیا گیا۔

ای/ب ۱۲۰۵ م۔عبدالمالک ایس وی (۶۰ ـ ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور کو تاریخ
۱۳ ستمبر ۱۹۵۶ء حاضری سے م۔ناصر خان سالار کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس
گورنمنٹ ہائی اسکول مری مقرر کیا گیا۔

" م۔ناصر خاں سالار ایس۔وی (۶۰ ـ ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول مری کو
تاریخ حاضری سے م۔عبدالمالک کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس
گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور مقرر کیا گیا

ای/۱/۶۷۲ م۔عبدالقیوم میٹرک ایس۔وی۔ادیب فاضل (۶۰ ـ ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ
۳۰ اگست ۱۹۵۶ء ہائی اسکول شرق پور کو تاریخ حاضری سے م۔غلام رسول کی جگہ جن کا تبادلہ ہو گیا ہے
اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول سیالکوٹ مقرر کیا گیا۔

" م۔غلام رسول ایس وی (۶۰ ـ ۱۴۰) قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
سیالکوٹ کو تاریخ حاضری سے م۔محمد نصراللہ خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔قائم مقام
اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی بھٹیاں مقرر کیا گیا۔

" م۔محمد نصراللہ خاں۔ایس۔وی۔ایف۔اے (۶۰ ـ ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ
ہائی اسکول پنڈی بھٹیاں کو تاریخ حاضری سے م۔عبدالقیوم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا
ہے۔اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول شرق پور مقرر کیا گیا۔

Regd. No. L. 5327

شمارہ ۸] لاہور [نومبر

اس شمارہ میں

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

نومبر ۱۹۵۵ء

جلد ———— ۸

شمارہ ———— ۸

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی۔ خالد۔ پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور۔

ڈبل شفٹ (دوہرا مدرسہ)

ایم۔ اے مخدومی

ایک آزاد جمہوری معاشرے کی بقا و ترقی کا سارا دار و مدار ذی فہم شہریوں کے وجود پر ہے ایسے شہری جو ملکی معاملات کو اچھی طرح سمجھ کر ان کے متعلق رائے قائم کر سکیں اور اس رائے کو مؤثر طور پر ظاہر کر سکیں۔ سچی جمہوری زندگی صرف اسی ملک میں پھل پھول سکتی ہے۔ جہاں تمام بالغ شہری اس ذہنی پختگی سے متصف ہوں۔ جدید صنعتی دور میں اس اہم شہری ذمہ داری کی بجا آوری کے لیے خواندگی ایک ضروری شرط ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے تعلیمی منصوبوں میں مفت اور جبری ابتدائی تعلیم کو اہمیت دینی چاہیے۔

قیام پاکستان کے بعد ہمارے عوام نے تعلیم میں جس روز افزوں دلچسپی کا اظہار کیا ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت طلبہ کی وہ بے پناہ بھیڑ ہے جس سے آج تقریباً ہر تعلیمی ادارے کا دم گھٹا جا رہا ہے تعلیم کی یہ پیاس جمہوری زندگی کی ترقی کے لیے ایک نیک فال ہونا چاہیے لیکن بدقسمتی سے حکومت کی کوششوں کے باوجود تعلیمی سہولتیں تعداد طلبہ کا ساتھ نہیں دے سکیں تعلیمی معیاروں کے گرنے کا ایک سبب یہی صورت حال ہے۔ یہ امر بہت تشویشناک ہے۔ لیکن اس سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ پُرہجوم جماعتوں کے باوجود ابھی لاکھوں بچے ایسے ہیں جنھیں ابتدائی مدرسوں میں ہونا چاہیے لیکن وہ گلی بازاروں اور کھیتوں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ لاہور جیسے شہر میں بھی ایسے بچوں کی ایک خاصی تعداد موجود ہے۔

اس بارے میں ہرگز دو آرا نہیں ہو سکتیں کہ جب تک ہماری نئی پود کے سب کے سب بچے کم سے کم ابتدائی تعلیم حاصل کرنے نہیں لگتے اس وقت تک یہ ملک نہ معاشی میدان میں کوئی نمایاں ترقی کر سکتا ہے اور نہ ہی یہاں جمہوریت کا مستقبل محفوظ سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر تمام بچوں کو مدرسوں میں بھیجنے کے لیے ہزاروں نئے استادوں۔ بے شمار نئی عمارتوں اور بہت سے ساز و سامان کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں بے کاری

عام ہو، نئے استادوں کی بہم رسانی کوئی زیادہ مشکل مسئلہ نہیں ہونا چاہیے لیکن نئی عمارتوں اور ساز و سامان کا مطلوبہ مقدار میں مہیا کرنا غالباً ایک لمبے عرصے تک ہماری کم زور زرعی معیشت کے بس کی بات نہیں ہو گی۔

تو کیا مفت جبری تعلیم کے منصوبے کو اس وقت تک ملتوی رکھا جائے جب تک ہم کافی نئی عمارتیں اور ساز و سامان فراہم نہ کرلیں، حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے امیر ترین ملکوں کو بھی یہ بات میسر نہیں کہ ہر قسم کی تعلیمی ضرورتوں کے لیے جداگانہ عمارتیں اور ساز و سامان فراہم کرسکیں، امریکہ اور یورپ میں حالت یہ ہے کہ جو عمارتیں دن کے وقت مدرسوں کا کام دیتی ہیں شام کو وہی بالغوں کی درس گاہوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ایک عمارت اور اس کا ساز و سامان بیک وقت دوہری تعلیمی ضرورت کو پورا کردیتا ہے۔ ترکی اور بعض یورپی ملکوں نے تعداد طلبہ کے یک دم بڑھ جانے کا علاج ڈبل شفٹ (دوہرے مدرسے) کی مدد سے کیا ہے۔ خود ہمارے وفاقی دارالحکومت کراچی میں یہ تجربہ کامیابی سے آزمایا گیا ہے۔ لاہور کارپوریشن نے بھی اپنی بڑھتی ہوئی تعلیمی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کے لیے اس طریق کار کی طرف رجوع کیا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ڈبل شفٹ میں تعلیمی معیاروں کا مزید گر جانا یقینی ہے، حقائق اس قسم کے خوف کی تائید نہیں کرتے۔ اگر ڈبل شفٹ کا مطلب یہ ہو کہ اوقات مدرسہ کو کم کردیا جائے اور ایک ہی عملہ صبح اور شام کے مدرسوں میں پڑھائے تو تعلیمی معیار یقیناً گر جائیں گے لیکن دوہرے مدرسے کے لیے ان دونوں میں سے کوئی بھی چیز ضروری نہیں، دوہرے مدرسے کی غایت عمارت اور ساز و سامان کے اخراجات کو بچانا ہے اور بس جس شہر یا آبادی میں دو مدرسوں کی ضرورت ہو وہاں ایک ہی عمارت اور اس کے ساز و سامان کے ساتھ دو مدرسے چلائے جاسکتے ہیں صبح اور شام کے مدرسوں میں کام کرنے والے عملے لامحالہ الگ الگ ہونے چاہئیں۔ اس صورت میں اوقات مدرسہ کے گھٹانے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، دونوں مدرسوں کی تقسیم کار اس طرح ہوسکتی ہے کہ چھوٹی جماعتوں کے کم عمر طلبہ صبح کے اوقات میں پڑھنے آئیں اور بڑی جماعتوں کے طلبہ بعد دوپہر۔

غرض ڈبل شفٹ مدرسہ ہماری مخصوص ضرورتوں کے لیے مفید تعلیمی امکانات رکھتا ہے، ان امکانات سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہوشمندانہ منصوبہ بندی اور تخلیقی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ ہنگامی حالات میں ہم قومی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے غیر معمولی ذرائع کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے، دوہرا مدرسہ اسی قسم کے غیر معمولی ذرائع میں سے ایک ہے۔

قومی ترانہ

آموزش کی اس اشاعت میں پاکستان کا "قومی ترانہ" شائع کیا جا رہا ہے، تاکہ اساتذہ اور طلبہ اس کا معتدبہ فن حاصل کر سکیں۔ ہر ملک کا قومی ترانہ نئی پود کے لیے قومی روایات اور تمناؤں کی نشان دہی کیا کرتا ہے۔ امید ہے پاکستانی طلبہ اپنے ترانے کی روح کو سمجھ کر اس پر فخر کرنا سیکھیں گے۔

(مدیرمعاونت)

پاک سرزمین شاد باد
کشورِ حسین شاد باد
تو نشانِ عزمِ عالی شان
ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

پاک سرزمین کا نظام
قوتِ اخوتِ عوام
قوم، ملک، سلطنت
پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مراد

پرچمِ ستارہ و ہلال
رہبرِ ترقی و کمال
ترجمانِ ماضی شانِ حال
جانِ استقبال
سایۂ خدائے ذوالجلال

مطالعہ زیر نگرانی

فضل احمد

تعلیم کی اصل غایت بعض مستقل عادات و اطوار پیدا کرنا ہے جو بذات خود مطلوب ہیں۔ آلاتی مضامین اور مہارتیں جو ابتدائی نصاب کی کائنات ہیں اور مختلف علمی میدانوں سے تعارف جو ثانوی نصاب کا ماحصل ہے دراصل ان پسندیدہ اطوار و اوصاف کو جانے والے زینے ہیں۔ ان اطوار و اوصاف کو کئی نام دئیے گئے ہیں۔ آج تعلیمی فکر اس بات پر متفق ہے کہ تعلیم کی اصل روح وہ معلومات نہیں جو طالب علم ازبر کر لیتا ہے اور نہ ہی وہ مہارتیں ہیں جو وہ اخذ کرتا ہے۔ اپنی ساری اہمیت کے باوجود یہ دونوں چیزیں ایک اعلیٰ تر مقصد کے حصول کا ذریعہ ہونی چاہییں۔ وہ اعلیٰ تر مقصد ہے۔ ایک پختہ شخصیت جو گردوپیش کے طبعی اور مجلسی ماحول سے اس طور پر ہم آہنگ ہو کہ اس کی اپنی انفرادیت اور معاشرے کی اجتماعی زندگی کو زیادہ سے زیادہ ترقی مل سکے۔

تعلیم کے اس تصور نے جدید تعلیمی طریقوں میں مقصدیت کو پہلا درجہ دیا ہے۔ تدریس کا جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے وہ ایسا ہونا چاہیے جو طالب علم کو یہ احساس دلائے کہ وہ خود اپنے کسی مقصد کی تحصیل میں مصروف ہے، اس نقطہ نگاہ سے وہ معلومات جو استاد کے مجبور کرنے پر ازبر کی جائیں یا وہ کتابیں جو امتحانی خوف کے ماتحت پڑھی جائیں تعلیمی طور پر سب کچھ نہیں سمجھی جا سکتیں۔ استاد کا جبر اور امتحان کا خوف وقتی چیزیں ہیں، اگر تعلیم ان ہی پر انحصار کر دہ جائے تو مدرسہ چھوڑنے اور امتحان ختم ہو جانے کے بعد طالب علم کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں رہ جاتی جسے تعلیم کا عطیہ کہا جا سکے۔

یہی وجہ ہے کہ جدید مدارس اپنے طلبہ میں یہ استعداد پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ وہ درسی کتاب اور استاد کے سبق سے چند قدم آگے بڑھ کر نوع انسانی کے علمی ترکہ کے ساتھ خود تعارف پیدا کریں اور اس کے کسی نہ کسی پہلو کے ساتھ اتنی دل بستگی پیدا کر لیں کہ مدرسے کی زندگی کے دھندے ختم ہو جانے

بعد بھی اس سرچشمہ سے سیرابی حاصل کرتے رہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جدید مدرسے ذاتی مطالعہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور خاص تربیت کے ذریعہ اس کا ذوق پیدا کرتے ہیں۔

ذاتی مطالعہ کی اہمیت

تھوڑے عرصہ کی بات ہے راقم ایک ذمہ دار انتظامی حاکم سے بات چیت کر رہا تھا۔ موصوف کی میز پر چند کتابیں دھری تھیں جو ان دنوں زیر مطالعہ تھیں۔ ان میں سے ایک تاریخ کے ایک بڑے ہیرو کے سوانح حیات پر تھی۔ اثنائے گفتگو میں حاکم مذکور نے کہا دنیاوی زندگی خواہ کتنی بلند سطح پر کیوں نہ ہو وہ گھٹیا پن سے آزاد نہیں ہو سکتی "احضرت الانفس الشح" کے ماتحت سیاسیات اور انسان کی اجتماعی زندگی کے دوسرے میدانوں میں بھی زرق برق ٹھاٹھ کے پیچھے ہمیشہ ایک پستی کی طرف لے جانے والا گھٹیا پن چھپا رہتا ہے جس کا احساس ٹھیک طور پر اس وقت ہونے لگتا ہے جب مشاہیر عالم کی زندگیوں پر نظر ڈالی جائے۔ میں عموماً مشرق اور مغرب دونوں کے مشاہیر کے افکار کے مطالعہ کے لیے وقت نکالتا ہوں۔ یہ زندگی کے بے حد قیمتی لمحات معلوم ہوتے ہیں۔ رومی۔ حافظ افلاطون۔ ارسطو اور اسی پایہ کے دوسرے مفکروں کی کتابیں اور بڑے بڑے مصلحوں کے حالات زندگی پڑھ کر بڑے سے بڑا با اختیار آدمی بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ زندگی کی ظاہری چمک دمک کچھ زیادہ حقیقت نہیں رکھتی، اس سے کہیں زیادہ قیمتی وہ اخلاقی اور روحانی اقدار ہیں جنہوں نے نوع انسان کو کٹھن سے کٹھن اوقات میں سہارا دیا اور جن کی بدولت سائنس اور ٹکنالوجی کی ساری ترقی ممکن ہوئی۔

برطانوی مدرسے تربیت کردار کے لیے دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔ ایک انگریز اپنے زمانہ طالب علمی پر نگاہ بازگشت ڈالتا ہوا یہ معنی خیز سوال پوچھتا ہے کہ مدرسہ کے نصاب کا وہ کونسا عنصر تھا جس نے اس کے اور اس کے ساتھیوں کے کردار کی پرورش کی، اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ بے شک مدرسے کا نصاب بڑی محنت اور احتیاط سے تیار کیا گیا تھا اور اس میں تنوع اور توازن پیدا کرنے کے لیے بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ لیکن جس چیز نے ہمیں سب سے زیادہ متاثر کیا وہ نہ درسی کتابیں تھیں اور نہ استادوں کے سبق، اس کے برعکس یہ وہ نصاب سے غیر متعلق مباحث تھے جو برسبیل تذکرہ

بعض سبقوں میں چل نکلتے۔ یہ مباحث نئے نئے موضوعوں پر علمی پیاس بھڑکا نے جس کی سیرابی کے لیے ہم کتب خانے کی الماریوں کو چھان مارتے۔ ایسی ہی تاثیر پیدا کرنے والا وہ ذاتی مطالعہ تھا جو استاد کے اشارے اور اس کی رہ نمائی میں کیا جاتا، غرض تشکیل کردار میں زیادہ ہاتھ ان غیر نصابی علمی سرگرمیوں کا تھا جو محض جذبہ تجسس کی تشفی کے لیے ظہور میں آئیں۔

اوپر درج کیے گئے دونوں واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ تعلیم کے بنیادی مقاصد کے اعتبار سے ذاتی مطالعہ کی عادت کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے، جو تعلیم اس عادت کی پرورش سے تغافت برتتی ہے وہ اپنے اصل مقاصد سے دور رہتی ہے۔

ذاتی مطالعہ کی عادت کوئی ایسی شئے نہیں جو ذہانت کی طرح ہر شخص کو پہلے دن سے ایک مقررہ مقدار میں دی گئی ہو، اس کے برعکس یہ ایک ایسا ذوق ہے جو تربیت چاہتا ہے، اس کی لذت سے آشنائی حاصل کیے بغیر شاید ہی کوئی طالب علم ہو جو ذاتی مطالعہ میں دل چسپی لے سکے۔ ہر طالب علم کو ذاتی مطالعہ کی لذت سے آشنا کرنا استاد اور مدرسے کا کام ہے، یہ کام خوبی سے انجام دینے کے لیے کئی تکنیکیں وضع کی گئی ہیں جن کا علم ہر استاد کے لیے ضروری ہے۔ خال خال طالب علم ایسے بھی ملیں گے جو کسی اتفاقی شوق یا واقعہ کی بنا پر لذت مطالعہ سے آشنا ہو گئے اور عمر بھر اس ذوق کو پورا کرتے رہے، لیکن ان کی مثال بالکل ان کم یاب پھولوں کی ہے جو صحرائے اعظم کے لق و دق ویرانے میں بھی اُگ آتے ہیں۔ عام طلبہ خاص تربیت اور اہتمام کے بغیر ذاتی مطالعہ کا شوق پیدا نہیں کر سکتے۔ یہ تربیت تعلیمی اصطلاح میں مطالعہ زیر نگرانی کے نام سے موسوم ہے۔

مطالعہ زیر نگرانی کیا ہے؟

بعض دوسرے میدانوں کی طرح تعلیمی مباحث میں بھی ترقی پسندوں کے جوش نے بعض ذہنی الجھنیں پیدا کر رکھی ہیں۔ علم التعلیم پر حال ہی میں کچھ ایسی کتابیں چھپی ہیں جن میں مطالعہ زیرنگرانی کے مفہوم کو اتنی وسعت دی گئی ہے کہ اسے قریباً قریباً تعلیم ہی کا ہم معنی بنا دیا گیا ہے۔" مکلوز اپنی ایک کتاب میں کہتا ہے :— مطالعہ زیر نگرانی کا مفہوم اس کتاب میں یہ لیا گیا ہے کہ

اعادتمام تعلیمی سرگرمیوں پر مشتمل ہے جن میں طالب علم مشغول ہوتا ہے۔ اس سے مراد اوقات مدرسہ کا کوئی خاص وقفہ نہیں" اس کے جواز میں وہ دلیل یہ دیتا ہے کہ ترقی اسی طرح ممکن ہے کہ انبوہ کی بجائے چند صاحب نظر لوگوں کی پیروی کی جائے۔ اسی طرح ہر دل عزیز رہ نماؤں کی پیروی بھی کچھ سود مند نہیں۔

مطالعہ زیر نگرانی کے مفہوم کو اس طرح وسیع کر دینے سے ترقی پسندی کا جنون بے شک پورا ہوا ہو گا لیکن اس سے تعلیمی مباحث کی وضاحت میں مدد کی بجائے الٹی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے بعض ترقی پسند ایسے بھی ہیں جنہوں نے منصوبی طریق تدریس کو بالکل اسی قسم کا مفہوم عطا کیا ہے چوں کہ تمام جاریہ تدریسی طریقے مقصدیت کو پہلا درجہ دیتے ہیں، اس لیے کفرر کی وضع کردہ تعریف ہر نئے تدریسی طریقے پر صادق آسکتی ہے۔ لیکن ایسا کرنے سے تعلیمی مباحث میں پریشان خیالی پیدا کرنے کے سوا اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے؟ تعلیم کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی تدبیروں اور طریقوں سے کام لینا پڑتا ہے، ان سب کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ ہر ایک کسی مخصوص صورت حال اور مخصوص غرض تک محدود رہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو طریقہ ہائے تدریس پر بحث کرنا ہی مشکل ہو جائے۔ ایک معروف اصطلاح کے عام مطلب کو پھینک کر اس سے کوئی نیا مفہوم وابستہ کرنا بذات خود کسی تعلیمی افادیت کا حامل نہیں۔ جدت بذات خود کوئی قابل قدر شے نہیں۔

استادوں کی اکثریت مطالعہ زیر نگرانی سے جو مفہوم لیتی ہے وہ یہ ہے:۔ "یہ ایک عمل کا نام ہے جو طلبہ کو خود پڑھنے کا ڈھنگ سکھاتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ مدرسے میں ایک گھنٹہ وقف کر دیا جاتا ہے جس میں طلبہ پڑھتے ہیں اور استاد پاس موجود رہتا ہے، وہ طلبہ کی انفرادی دقتیں رفع کرتا ہے"

یہ نتیجہ ایک سوال نامے کے جوابوں سے اخذ کیا گیا ہے جو بہت سے امریکی استادوں کو جاری کیا گیا تھا۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر مطالعہ زیر نگرانی کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے "یہ اس عمل کا نام ہے جو طالب علم کو مطالعہ کے ڈھنگ اس طور پر سکھاتا ہے کہ وہ ان میں ماہر ہو جائے اس کا

خاص استعمال اس تیاری کے ضمن میں کیا جاتا ہے، جہاں کمرۂ جماعت میں کچھ کام شاگردوں کے ذمہ لگا دیا جاتا ہے اور استاد اس کی روشنائی کرتا ہے۔ اس تعریف میں تین نکات قابل ذکر ہیں۔

(۱) طالب علم کو کتابوں سے استفادہ کرنے کی عام اور خاص تکنیکیں سکھائی جاتی ہیں۔ عام تکنیکیں وہ ہیں جو ہر مطالعہ میں کام دیتی ہیں اور خاص وہ جو کسی خاص مضمون کے ساتھ مخصوص ہوں مثلاً چپ چاپ پڑھنا اور نوٹ تیار کرنا عام قسم کی تکنیکیں ہیں، اس کے الٹ انگریزی زبان کی قرأت میں روانی اور سہولت پیدا کرنے کے لیے خاص تکنیکوں کی ضرورت ہو گی۔

(۲) استاد ہر صورت میں رہنمائی کا فرض انجام دیتا ہے۔ تاآں کہ طالب علم تمام تکنیکوں کے استعمال میں مہارت پیدا کرے۔

(۳) رہنمائی کا یہ کام کمرۂ جماعت میں انجام پاتا ہے، جب طالب علم سبق کی تیاری میں لگا ہوا اور تیاری کی نوعیت پہلے سے بتا دی گئی ہو۔

اگلی ساری بحث میں مطالعہ زیر نگرانی کا صرف یہی محدود مفہوم زیر نظر رہے گا۔ اس مفہوم کو نہ صرف عرف عام کی سند حاصل ہے بلکہ واضح اور مفید بحث کے لیے بھی یہی مفہوم کام دے سکتا ہے۔

ایک نیا تصوّر

مطالعہ زیر نگرانی کا تصوّر نیا ہے، یہ درست ہے کہ صدیوں سے مدرسوں میں یہ رواج رہا ہے کہ استاد نے کمرۂ جماعت میں کچھ کام جماعت کے ذمہ لگا دیا اور خود کسی کام میں لگ گیا۔ یا آرام سے بیٹھ گیا۔ اسے اس بات سے کچھ غرض نہ ہوتی تھی کہ طلبہ کس طور پر تیاری میں لگے ہیں۔ طالب علم جو طریقہ اپنے لیے حسب حال دیکھتا اختیار کر لیتا، اس ضمن میں استاد کی ذمہ داری کچھ نہ ہوتی امریکہ میں اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب غالباً سنہ ۱۹۰۹ء میں چھپی تعلیمی رسالوں میں کسی موضوع پر مضامین کا چھپنا اس موضوع کی اہمیت کی ایک عام دلیل ہے۔ اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ سنہ ۱۹۰۵ء سے پہلے اس موضوع سے کسی کو دلچسپی نہ تھی اور اس سن سے پہلے کسی تعلیمی رسالہ میں مطالعہ زیر نگرانی پر کوئی مضمون نہیں لکھا گیا۔ پہلی عالمی جنگ سے کوئی ایک دہائی پہلے یہ دلچسپ

پیدا ہوئی اور ایک بحث پڑھ گئی۔ اس وقت سے اب تک یہ دلچسپی بدستور قائم ہے۔ آج ترقی یافتہ ملکوں میں اکثر مدرسے اس بات کا پورا پورا اہتمام کرنے لگے ہیں کہ ان کے طلبہ کو نفع بخش مطالعہ کا ڈھنگ اچھی طرح آجائے۔

ضرورت

اس سے یہ مراد نہ لینی چاہیے کہ ۱۹۰۵ء سے پہلے مطالعہ زیر نگرانی کی ضرورت نہ تھی، یہ ضرورت ہمیشہ سے موجود رہی ہے لیکن بیسویں صدی کے شروع میں دفعتہً بعض ایسے مؤثرات پیدا ہو گئے جنہوں نے اس ضرورت کا شدید احساس پیدا کر دیا۔ بیسویں صدی جمہوریت کی نشوونما کی صدی ہے، اس صدی کے آغاز تک تعلیم صرف چیدہ چیدہ طلبہ کے لئے مخصوص تھی، ایسے طلبہ کو پڑھانے میں کسی خاص دقت کا احساس نہ ہوتا تھا، لیکن جوں ہی موجودہ صدی کے آغاز میں بھاری صنعتوں اور شہری آبادی نے ترقی کی ہر طبقے کے بچے مدرسوں میں آنے لگے۔ اول اول یہ بھیڑ صرف ابتدائی مدرسوں تک محدود تھی لیکن جلد ہی اس نے ثانوی مدرسوں کا رخ کیا۔ عوامی تعلیم کو مروج ہوئے زیادہ دیر نہ ہونے پائی تھی کہ طلبہ کی رفتار ترقی میں بے تحاشہ فرق نظر آنے لگا۔ یہ اختلاف بھاری ناکامیوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ بہت سے طلبہ مدرسے میں داخل ہوتے تھے لیکن چند سال بعد مدرسہ چھوڑ بیٹھتے تھے۔ یہ ساری کی ساری ناکامیاں بلا شبہ تعلیمی استعداد کی کمی کے باعث ظہور پذیر نہ ہوتی تھیں۔ پھر بھی مدرسہ چھوڑنے والوں کی اکثریت اسی بنا پر پڑھائی سے منہ موڑتی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اس صورت حال کا ایک خاص مطالعہ کیا گیا جس نے ظاہر کیا کہ جن شہروں کا مطالعہ کیا گیا ان کے ۳۳ فی صد بچے ناکام رہتے ہیں۔ اس سے ایک سال پہلے ریاست نیو یارک کے کمشنر تعلیم نے اپنی ریاست کے متعلق جو اعداد و شمار جمع کیے وہ بتاتے تھے کہ پہلی جماعت میں داخل ہونے والے سو طلبہ میں سے ساٹھ سے ستر تک آٹھویں جماعت ختم کرنے تک راستہ ہی میں رہ جاتے ہیں۔ چند برس ہوئے ریاست ہائے متحدہ کے کمشنر تعلیم نے ایک رپورٹ مرتب کی تھی، اس میں بتایا گیا تھا کہ پانچویں جماعت پاس کرنے والے

ایک سو طلبہ میں سے صرف چونتیس ثانوی مدرسے کی پہلی جماعت کو مکمل کرتے ہیں اور ان میں صرف تیرہ ثانوی مدرسے کی آخری جماعت ختم کرتے ہیں۔

اس مسئلہ کے مزید مطالعہ نے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی ہے کہ پڑھائی چھوڑ دینے والے طلبہ کی بڑی تعداد ذہنی عدم استعداد کی وجہ سے ایسا نہیں کرتی بلکہ صرف اس لیے کہ اسے پڑھنے کا ڈھنگ نہیں سکھایا گیا تھا، ایسے طلبہ کو جب بعد میں مطالعہ کی تکنیکوں میں تربیت دی گئی تو اچھے بھلے طالب علم ثابت ہوئے اور خود اعتمادی کے ساتھ مدرسے کی آخری جماعت تک پڑھتے چلے گئے۔ ان تجربوں نے مطالعہ زیر نگرانی کی ضرورت کا ناقابل تردید ثبوت بہم پہونچایا۔

مطالعہ زیر نگرانی کی ضرورت کو شدید تشکل دینے والا دوسرا سبب گھروں میں مکانیت کی عام کمی ہے۔ بہت کم گھر ایسے ہوں گے جہاں بچوں کے الگ بیٹھ کر پڑھنے کا انتظام ہو۔ تیزی سے بڑھتی آبادی اور مکانوں کی کمی نے یہ دقت اور بڑھا دی ہے۔ خال خال استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر ایک اوسط گھر کے متعلق یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ وہاں سکون سے بیٹھ کر پڑھنا قریباً ناممکن ہے۔ جہاں گھر میں پڑھنے کے لیے الگ جگہ موجود ہو بھی وہاں بھی اغلب یہ ہے کہ گرمیوں میں پنکھے اور سردیوں میں حرارت کا انتظام خاطر خواہ نہیں ہوگا۔ بعض صورتوں میں روشنی کا انتظام بھی تسلی بخش نہ ہوگا۔ جہاں یہ سب چیزیں موجود ہوں وہاں ریڈیو کے پروگرام وقت بے وقت توجہ کو پڑھائی سے ہٹاتے رہیں گے۔ غرض ماہرین تعلیم اب اس بات پر متفق ہیں کہ گھر مطالعہ کے زیادہ موزوں جگہ نہیں۔ جوں جوں تدریس کا مرکز درسی کتاب کی بجائے مدرسے کا کتب خانہ بنتا جا رہا ہے اسی قدر جائے مطالعہ کے طور پر گھر کی افادیت گھٹتی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور دوسرے ترقی پسند ملکوں میں بچے کو عموماً گھر کا کام قطعاً نہیں دیا جاتا، اسے جو کچھ پڑھنا ہو مدرسے میں پڑھے لکھے تاکہ درست ماحول اور استاد کی نگرانی میں یہ کام موزوں طور پر انجام پائے۔

ان وجوہ نے مطالعہ زیر نگرانی کی افادیت کو اس قدر واضح کر دیا ہے کہ اس کی ضرورت کے متعلق کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں، اس کی افادیت کی جانچ کے لیے معیاری حالات میں

ثر بے ہوتے ہیں۔ انھوں نے یہ پوری طرح ثابت کر دیا ہے کہ کم زور اور اوسط طلبہ کے لیے اس کی افادیت
قابل انکار نہیں ہے۔ البتہ چوٹی کے پچیس فی صد ذہین طلبہ کے بارے میں اختلاف رائے موجود ہے،
لیکن یہاں بھی زیادہ غالب یہ ہے کہ ذہین طلبہ کے حسب حال تکنیکیں وضع نہیں کی گئیں ورنہ
مطالعہ زیر نگران میں فی نفسہ کوئی ایسی خرابی نہیں ہے جو غیر معمولی ذہانت کے طلبہ کے لیے نقصان دہ
ثابت ہو۔

تنظیم کی صورتیں

مطالعہ زیر نگرانی کا قائل ہو جانے کے بعد اگلا سوال اس کے لیے وقت نکالنے کا ہے۔ اسکی
کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ جس طرح سائنس کے عملی کام کے لیے دو پیریڈ اکھٹے رکھ
دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح مطالعہ زیر نگرانی کے لیے دو پیریڈ ایک ساتھ آجایا کریں۔ اگر مدرسے کا پیریڈ
پینتالیس منٹ کا ہے تو اس طرح نوّے منٹ بن جائیں گے، ان میں سے تقریباً آدھا وقت پچھلے دن
پڑھا ہوا دہرانے یا اس پر بحث کرنے میں صرف ہو سکتا ہے اور آدھا اگلے سبق کی تیاری میں سارے
مدرسے کو اس طرح روزانہ وقت دینے کے لیے استادوں کی تعداد کافی ہونی چاہیے۔ اس تنظیم کی کمی
یہ ہے کہ اس طرح طلبہ کی حدود مطالعہ ایک حد تک سکڑ جاتی ہیں اور مدرسے کا دن لمبا ہو جاتا ہے۔
دوسری صورت یہ ہے کہ مطالعہ زیر نگرانی کو دو الگ الگ وقفوں میں وقت دیا جائے۔
مثلاً اگر اسے کل ایک گھنٹہ دیا جاتا ہے تو یہ گھنٹہ دو حصوں میں بانٹ دیا جائے۔ پہلے تیس منٹ
میں طلبہ سے پچھلے دن کا پڑھا ہوا سنا جائے اور اگلے تیس منٹ اگلے سبق کے مطالعہ کے لیے وقف
ہوں۔ یہ دونوں وقفے الگ الگ بھی ہو سکتے ہیں اور مسلسل بھی، دوسری صورت میں پہلا وقفہ
گزرنے پر گھنٹی بجا دی جانی چاہیے کیوں کہ اس کے بغیر بعض استاد سبق سننے میں ہی لگے رہیں گے۔
اس تنظیم میں قباحت یہ ہے کہ یہ کافی حد تک بے لوچ ہے۔ پورے تیس منٹ گذرتے ہی کام کے
ایک حصے کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرنا بسا اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔
تیسری صورت یہ ہے کہ مدرسے کے بند ہونے کے فوراً بعد ایک زائد گھنٹہ مطالعہ زیر نگرانی کے لیے

مقرر کر دیا جائے، یہ وقت استاد کمزور طلبہ کی خاص دقتوں کا کھوج لگانے اور ان کے حل کے لیے موزوں تدبیریں ڈھونڈنے میں صرف کرے۔ ایسی صورت میں کمزور اور اوسط طلبہ کو پورا گھنٹہ بھر کام کرنا ہوتا ہے۔ جبکہ قابل طلبہ سے پچھلا سبق سن کر انہیں چھٹی دے دی جاتی ہے، لیکن یہاں یہ احتیاط ضروری ہے کہ سب طلبہ کی حاضری لازمی قرار دی جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو زیادہ امکان یہ ہے کہ کمزور طلبہ جو زیادہ مدد کے حق دار ہیں غیر حاضر رہیں گے اور اچھے طلبہ جنہیں مدد کی کوئی خاص ضرورت نہیں موجود رہیں گے بعض مدرسوں میں دستور یہ ہے کہ اس زائد پیریڈ میں صرف وہی طلبہ حاضر ہوتے ہیں جنہیں استاد نے خاص طور پر کہا ہو۔

ایک اور طریق کار وہ ہے جسے عموماً کتب خانہ کا مطالعہ کہا جاتا ہے۔ اس کی آگے دو صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ مختلف جماعتوں کے بہت سے طلبہ کتب خانہ کے ہال میں جمع ہو جاتے ہیں اور کتابوں اور حوالہ جات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ چھوٹے مدرسوں میں عموماً ایک استاد ہی ان سب کی مدد اور رہنمائی کے لیے مقرر کر دیا جاتا ہے، طلبہ کو خواہ کسی مضمون میں مدد کی ضرورت پڑے وہ اسی استاد کی طرف رجوع کریں گے ظاہر ہے کہ اس طور پر مطالعہ کی نگرانی اچھی طرح نہیں ہو سکتی۔ ایک ہی استاد تمام مضامین میں قابل اعتماد رہنما نہیں ہو سکتا۔ فارسی پڑھانے والا استاد سائنس یا ریاضی کے متعلق کچھ نہیں بتا سکے گا، مناسب یہ ہے کہ کتب خانہ کے ہال میں ایک استاد کی بجائے تمام مضامین کے استاد موجود ہوں تاکہ ہر مضمون میں رہنمائی ہو سکے۔ چوں کہ یہ طریق کار زیادہ قابل عمل نہیں، اس لیے مغرب کے بیشتر مدرسوں میں اس کا رواج ختم ہو گیا ہے۔ اس کی بجائے اب طلبہ الگ الگ مضامین کے کمروں میں مطالعہ کرتے ہیں بعض بہت بڑے مدرسوں نے شعبہ وار مطالعہ کے کمروں کا انتظام کیا ہے۔ یعنی ہر شعبہ کے طلبہ کے لیے ایک کمرہ مطالعہ کے لیے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ مطالعہ کے گھنٹہ میں اس شعبہ کے تمام لڑکے خواہ وہ کسی جماعت کے ہوں اس کمرے میں چلے جاتے ہیں۔

ایک مروجہ طریق یہ بھی ہے کہ مطالعہ کے گھنٹہ کو دو حصوں میں بانٹا تو جاتا ہے لیکن تقسیم بے لوچ نہیں رکھی جاتی۔ استاد کے لیے یہ لازمی قرار نہیں دیا جاتا کہ وہ پچھلا سبق سنے اور اگلے سبق کی

تیاری کو برابر وقت دے۔ اگر وہ دیکھتا ہے کہ اعادہ بہت زیادہ تعلیمی قیمت رکھتا ہے تو وہ اسے بہت زیادہ وقت دے دیتا ہے اور مطالعہ کو تھوڑا۔ اگر معاملہ اس کے الٹ ہو تو مطالعہ کو زیادہ وقت یا سارا وقت بھی دیا جا سکتا ہے۔

اب تک جتنی تنظیموں کا ذکر کیا گیا ہے وہ روایتی طریقہ ہائے تدریس کے مفروضہ پر مبنی ہیں لیکن اب عام تعلیمی فکر تدریس کو چھوٹے چھوٹے الگ ٹکڑوں کی شکل میں پیش کرنے کی بجائے اسے جامع وحدتوں کی شکل میں پیش کرنے کا قائل ہوتا جا رہا ہے۔ ایک تدریسی وحدت عموماً کئی دنوں تک چلتی ہے۔ مطالعہ زیر نگرانی وحدتی طریق تدریس کا ایک لازمی جزو ہے، یہ وحدت کی تکمیل کے لیے تیاری کا درجہ رکھتا ہے، اس صورت میں یہ مطالعہ ایک دن سے لے کر لگاتار ایک ہفتہ یا اس سے زیادہ دنوں کے لیے جاری رہ سکتا ہے، یہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب استاد کو یقین ہو جائے کہ طلبہ اپنے مطالعہ کے نتائج کو مناسب طور پر الفاظ کا جامہ پہنا سکیں گے اس طریق کار کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے ماتحت مدرسہ کے نظم اوقات میں کسی رد و بدل کی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ مطالعہ زیر نگرانی عام تدریسی کام کا جزو بن جاتا ہے اور اس کے لیے الگ گنجائش نکالنا نہیں پڑتی۔

دو طریق ہائے تدریس

طلبہ کی انفرادی ضرورتوں اور دلچسپیوں نے جن نئے طریقہ ہائے تدریس کو جنم دیا ہے ان میں دو ایسے بھی ہیں جو مطالعہ زیر نگرانی پر بے حد زور دیتے ہیں بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ یہ دونوں طریقے مطالعہ زیر نگرانی ہی کی دو شکلیں ہیں، ذیل میں ان دونوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) **مارلیسن پلان**:۔ مارلیسن کے تعلیمی فکر میں دو امور کو اولیت حاصل ہے۔ پہلا یہ کہ علم اور تجربہ کو بڑی بڑی جامع اکائیوں کی شکل میں منظم کیا جانا چاہیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیمی مواد کو بڑی بڑی وحدتوں کی صورت ملنی چاہیے اور ان میں سے ہر وحدت کی تکمیل پر کافی وقت صرف ہونا چاہیے۔ مارلیسن نے ان وحدتوں کی مختلف قسمیں گنائی ہیں، لیکن ان سب میں اہم سائنسی

وحدت ہے تو تدبر اور تفکر کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس وحدت کے پانچ اقدام ہیں جن میں سب سے زیادہ وقت فہم اور تنظیم کے اقدام کو دیا جاتا ہے، یہ دونوں اقدام دراصل مطالعہ زیر نگرانی کے سوا کچھ نہیں۔

(۲) ڈالٹن پلان :- یہ طریق تدریس جو دنیا کے مختلف ملکوں کی طرح پاکستان میں بھی آزمایا جا چکا ہے۔ ریاست ماساچوسٹس (ریاست ہائے متحدہ) کے شہر ڈالٹن میں سب سے پہلے آزمایا گیا تھا۔ اس کی موجد مس پارک ہرسٹ ہیں۔ اس طریق تدریس کی اصل شکل مطالعہ زیر نگرانی کی بہت زیادہ قائل نہ تھی کیوں کہ مس پارک ہرسٹ کے طریقہ کا بڑا سہارا وہ معاہدہ تھا جو طالب علم کسی مضمون کے ایک خاص حصے کو ایک مقررہ میعاد کے اندر ختم کرنے کے لیے کرتا۔ ہر طالب علم نصاب جماعت کے تمام مضامین کے متعلق اس قسم کے تحریری معاہدے کرتا اور اسے کسی مضمون میں بھی آگے کام نہ ملتا جب تک وہ یہ تمام معاہدے پورے نہ کر لیتا مضمون کا جو ٹکڑا طالب علم ختم کرنے کا ذمہ اٹھاتا اس میں وحدت ہوتی یا نہ ہوتی اس سے مدرسہ والوں کو کچھ غرض نہ تھی۔ اس طرح استاد اپنے خاص کمرے میں مدد کے لیے موجود رہتا لیکن اس مدد سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا طالب علم کی مرضی پر موقوف تھا۔ چوں کہ اسے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانے کی مکمل آزادی تھی، اس لیے اس کے لیے گھر چلا جانا بھی ممکن تھا۔ لیکن اب ڈالٹن پلان کی یہ ابتدائی شکل باقی نہیں رہی۔ آج جو مدرسے ڈالٹن پلان اختیار کیے ہوئے ہیں وہ اس بات کا خیال بھی رکھتے ہیں کہ طالب علم مضمون کا جو حصہ اپنے ذمہ لے اس میں وحدت موجود ہو اور اس بات کا بھی کہ استاد محض چپ چاپ نہ بیٹھا رہے بلکہ مثبت رہنمائی کا کام انجام دے، اس لیے موجودہ ڈالٹن پلان کا کام بہت کچھ مطالعہ زیر نگرانی کی قسم کا بن گیا ہے ؂ (باقی)

تاریخ
سبقوں کے خاکے

مسلسل نمبر۲

دین محمد ملک

ہمارے ہاں میٹرک میں تاریخ انگلستان پڑھائی جاتی ہے لیکن زیادہ توجہ اس کے سیاسی پہلو کو دی جاتی ہے۔ سیاسی کشمکش کی تہ میں جو معاشرتی و اقتصادی عناصر کارفرما ہوتے ہیں ان پر نگاہ نہیں ڈالی جاتی۔ اس طرح طالب علموں میں نہ تو انسانی زندگی کے گوناگوں ہونے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ نہ ہی ان اسباب پر غور و فکر کی عادت ہوتی ہے اور نہ ہی ان میں اسباب سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

ذیل میں سترھویں صدی کے انگلستان کے گاؤں کی زندگی پر سبق دیا جا رہا ہے۔ سبق کا مقصد یہ ہے کہ طلبا اسٹورٹ بادشاہوں کے زمانے میں مجلسی زندگی کی ایک جھلک دیکھ سکیں اور اس زمانہ میں پیش آنے والے سیاسی واقعات کے معاشرتی و معاشی اسباب معلوم کر سکیں۔ معلم طلبہ کی سابقہ معلومات سے استفادہ کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ مناسب اضافے بھی کرتا جاتا ہے۔

استاد "کیا"، "کہاں" اور "کیوں" سے شروع ہونے والے سوالات پوچھتا ہے۔ قارئین اندازہ لگائیں کہ "کیوں" سے شروع ہونے والے سوالات کس حد تک طالب علموں کی قوت استدلال کا جائزہ لیتے ہیں۔ سوالات پر تنقید کرتے ہوئے یہ بھی دیکھئے کہ سوالات کیوں پوچھے گئے، استاد کا اصل مقصدِ تدریس کیا تھا، اور اس طریق کار میں کس غلطی سے خبردار رہنا چاہیے۔ کیا یہ سبق نسبتاً کم زور جماعت کے لیے تجویز کیا جا سکتا ہے؟ اگر کیا جا سکتا ہے تو طریقِ تدریس میں کیا کچھ تبدیلی کرنی پڑے گی؟

اگر ہم بچوں کو پاکستان کی تاریخ صحیح طریق پر پڑھانا چاہتے ہیں تو ہمیں ان کے سامنے گزشتہ زمانے کی مجلسی اور معاشرتی زندگی کے خاکے بھی پیش کرنے ہوں گے۔ ابھی تک

ہمارے ہاں تدریس تاریخ کا یہ میدان بالکل خالی ہے اور اچھے استاد کے لیے یہی طبع آزمائی اور جدت طرازی کا موقع ہے۔

سترھویں صدی میں انگلستان کے گاؤں کی زندگی۔

جماعت نہم۔ لڑکوں کی اوسط عمر ۱۴ - ۱۵ سال۔

معلم۔ ہاں تو آج ہم سترھویں صدی میں جزائر برطانیہ میں لوگوں کی زندگی کے اطوار کے متعلق بات چیت کریں گے۔ میرا یہ ارادہ نہیں کہ میں چھیڑ دوں۔ جنگوں یا بادشاہ اور پارلیمنٹ کے مابین تنازع یا اس ذقت کے جنگی نمونوں یا انداز جنگ کے متعلق کچھ گفتگو کروں۔ اگرچہ ان دنوں اس قسم کے بہت سے مسئلے ان لوگوں کو درپیش تھے۔

تم جانتے ہو کہ چارلس اول نے پارلیمنٹ سے کیوں جھگڑا مول لیا تھا۔ بتا سکتے ہو وہ اس سے کیوں الجھ پڑا؟

متعلم۔ رشوت لینے کے لیے۔

معلم۔ درست ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اور بھی سبب تھا۔

متعلم۔ مذہب۔

معلم۔ ٹھیک ہے۔ مذہبی معاملات۔

لیکن اب ہم سترھویں صدی میں عام لوگوں کی زندگی کے متعلق گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ برطانیہ میں ہمیشہ سے دو قسم کے لوگ آباد رہے ہیں۔ ایک تو ایسے جو تمہاری اور میری طرح شہروں میں آباد ہیں دوسرے وہ لوگ جو دیہات میں رہتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ آج دیہاتی آبادی کے متعلق بات چیت کروں۔ بھلا بتا سکتے ہو آخر میں ان کی زندگی پر کیوں بحث کرنا چاہتا ہوں۔

متعلم۔ اس زمانہ میں دیہاتی آبادی کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ کیوں کہ وہ دوسرے لوگوں کے لیے اناج پیدا کرتے تھے۔

متعلم ۲۔ اس زمانہ میں آبادی کے بہت سے لوگ کسانوں اور کھیتی باڑی کرنے والوں میں سے تھے۔

علم۔ ہاں۔ یہی وجہ ہے۔ آج اگر ہم اس سوال پر بحث کرنا چاہیں تو غالب گمان یہ ہے کہ ہم ان لوگوں کی زندگی سے بحث شروع کریں جو۔۔۔۔۔

متعلم۔ شہروں میں رہتے ہیں۔

معلم۔ ہاں سترھویں صدی میں گاؤں میں ایک تعلقہ دار یا بڑا زمیندار ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ کسان جو اپنے چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں محنت کیا کرتے تھے۔ لیکن ہمارا تعلق زیادہ تر اس تعلقہ دار سے ہے جو گاؤں کا اہم ترین عنصر تھا۔ ابھی پچھلے دنوں ہم اسکول میں اس کی زندگی کے متعلق کافی معلومات حاصل کر چکے ہیں۔ بتاؤ تو ان کی ابتدائی تعلیم کہاں ہوتی تھی۔

متعلم۔ مقامی پادری کے ہاں۔

معلم۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ پھر یہ لوگ کسی اقامتی درس گاہ میں چلے جاتے تھے۔ لیکن یاد رکھیے اس وقت کی اقامتی درس گاہیں ہمارے اسکول جیسی نہ تھیں۔ خیر۔ تو بتایئے کہ اسکول میں تعلقہ دار کو کیا سیکھنا ہوتا تھا۔

متعلم۔ لاطینی۔

معلم۔ بجا۔ کیوں کہ ان دنوں لکھنے پڑھنے کے بہت سے کام لاطینی زبان میں ہوتے تھے۔ پھر اسے کسی یونیورسٹی میں تعلیم دی جاتی تھی۔ وہاں وہ کون سا علم سیکھتا تھا۔

متعلم۔ فن طب۔

معلم۔ نہیں سوچ کر بتایئے وہ کونسا علم سیکھتا ہوگا۔

متعلم۔ وہ قانون پڑھتا ہوگا۔ کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ مستقبل میں اسے قانون کی بہت ضرورت پڑیگی

معلم۔ یہ ٹھیک ہے، عموماً اپنے والد کے فوت ہو جانے کے بعد انصرام جائداد کی خاطر اسے قانون سے مدد لینا پڑتی تھی۔ لیکن اس سے بیشتر وہ کیا کام کیا کرتا تھا۔

متعلم۔ وہ پارلیمنٹ میں لوگوں کی نمائندگی کیا کرتا تھا۔

معلم۔ ٹھیک! اس کے علاوہ اور کیا کام ہوتا تھا۔

متعلم ۔ وہ عدالتی کارروائیوں کی نگرانی کرتا تھا۔

معلم ۔ درست ہے وہ مقامی عدالت کے حاکم اعلیٰ کی مسند کے پیچھے جم کر بیٹھا رہتا تاکہ یہ دیکھے کہ عوام کی دادرسی بہر رہی ہے یا نہیں۔ اسے عدالتوں کی نگرانی اور نظم ونسق کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ خیال نہ کیجیے کہ یہ اعزازات اسے بڑھاپے میں میسر آتے تھے۔ وہ تقریباً چودہ سال کی عمر میں یونی ورسٹی میں تحصیل علم کی خاطر چلا جاتا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر وہ اپنے گاؤں میں چلا جاتا اور اپنے والد کی وفات کے بعد وہ اس کی جاگیر کا مالک ہوتا تھا۔ گاؤں کے مکانات یا تو بے ترتیبی سے ادھر اُدھر بنے ہوتے یا ایک کوچہ کے ساتھ ایک قطار کی قطار مکانات کی چلی جاتی۔ بہر کیف ان مکانات میں ایک مکان تعلقہ دار کا بھی ہوتا تھا۔

سترھویں صدی کے مکانات آج کل کی اقامتی عمارات کی طرز پر نہ ہوتے تھے، کیا آپ ان مکانات کا تصور کر سکتے ہیں؟

متعلم ۔ ہاں صاحب وہ ⊔ شکل کے ہوتے تھے۔

(معلم نے اس وقت تختۂ سیاہ پر ⊔ لکھا)

معلم ۔ اب میں اس پر کس طرف سے دیکھ رہا ہوں۔

متعلم ۔ اوپر سے۔

معلم ۔ ہاں! میں اس پر اوپر سے دیکھ رہا ہوں۔ ان دنوں اس کے ارد گرد یہاں دیوار سی بنی ہوتی ہوگی۔ بتایئے مکانات کس چیز سے بنائے جاتے تھے؟

متعلم ۔ لکڑی سے۔

معلم ۔ ٹھیک۔ کچھ اسی قسم کے سامانِ عمارت سے بنوائے جاتے تھے۔ لکڑی کا ایک ڈھنگلا یا ڈھانچہ بنا لیا جاتا تھا۔ لیکن یہ خیال رکھیے کہ کسانوں کے مکانات ان سے مختلف ہوتے تھے۔ اگر آپ کسی تعلقہ دار کے مکان میں داخل ہوں تو اندر داخل ہوتے ہی آپ کو ایک بڑا کمرہ نظر آئے گا۔ یہ کمرہ ہمارے مکانات کے تالار سے کسی قدر مختلف ہوتا تھا۔ تعلقہ دار اسی کمرہ میں اپنی نشست

رکھنا۔ یہیں کھانا کھایا جاتا اور اسی جگہ مہمانوں کی تواضع کی جاتی تھی۔ بڑے کمرے کے برابر باورچی خانہ ہوتا تھا۔ جہاں خدام اپنا کام کرتے اور متعلقہ دار اس کے مہمانوں کو کھانا پیش کرنے کے بعد خود بھی بچا کھچا کھا لیتے تھے۔ ان دونوں کمروں کے درمیان ایک بہت بڑی چمنی ہوتی تھی، ان کمروں میں جو آگ روشن ہوتی اس پر ایک سالم بیل بھونا جا سکتا تھا۔ گھر کے لوگ اس آگ کے قریب بیٹھ جاتے کیوں کہ ایسے مکانات میں اکثر جسم کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لیے آگ تاپنا ضروری تھا۔ ہمارے مکانات کو سردی سے کیسے محفوظ کیا جاتا ہے؟

متعلم۔ کوئلہ سے۔

معلم۔ نہیں۔

متعلم۔ ہمارے ہاں قالین اور فرش ہوتے ہیں۔

معلم۔ صحیح ہے۔ ہمارے ہاں فرش پر بچھانے کے لیے قالین، دریاں اور غالیچے ہوتے ہیں ان کے پاس ایسا سامان نہ تھا، اس وقت مکانات کے فرش پتھر سے بنائے جاتے تھے اور کمروں کو محفوظ رکھنے کے لیے سوائے پردوں کے ان کے ہاں اور کوئی چیز نہ ہوتی تھی۔ بعض اوقات وہ گھاس پھوس کی چٹائیاں بھی فرش پر بچھا لیتے تھے، اس سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ ان دنوں زندگی میں آسائشیں کتنی کم تھیں۔ اسی طرح متعلقہ دار اسکول میں بھی پر امن زندگی بسر نہیں کرتا تھا۔ سوچیے تو اسے اسکول میں کیا کرنا ہوتا ہوگا، جو آج ہم نہیں کرتے یا کرنا پسند نہیں کرتے۔

متعلم۔ ٹھنڈے پانی سے منہ دھونا۔

معلم۔ ہاں اور اسے صبح پانچ بجے بیدار ہونا پڑتا۔ اور پھر ایام مدرسہ میں اسے کیا کرنا ہوتا تھا۔

متعلم۔ جھاڑو دیا کرتا تھا۔

معلم۔ اور وہاں کا انتظام کیسا تھا۔

متعلم۔ وہ خطا کاروں کو بید سے سزا دیتے تھے۔

معلم - درست۔ بیاد کی سزا کوڑے مارنے سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی - ہاں تو ہم چمنی کا ذکر کر رہے تھے چمنی کے قریب آپ کو کیا نظر آتا تھا -

متعلم - کھونٹیاں -

معلم - ممکن ہے کھونٹیاں بھی ہوں لیکن اور کونسی چیز ہوتی تھی جسے دیر تک لٹکتا ہوا رہنے دیا جاتا تھا ؟

متعلم - جانوروں کے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے -

معلم - لیکن انہیں چمنی میں کیوں لٹکاتے تھے ؟

متعلم - وہ ان کو دھونی دیا کرتے تھے تاکہ بعد میں پکا کر کھا سکیں .

معلم - لیکن وہ اسے دھونی کیوں دیتے تھے ؟

متعلم - تاکہ اسے دیر تک محفوظ رکھ سکیں .

معلم - لیکن وہ گوشت کو دیر تک کیوں محفوظ رکھنا چاہتے تھے ؟

متعلم - اس لیے کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے مویشیوں میں بیماری کب پھوٹ پڑے گی -

متعلم ۲ - موسم سرما میں جانوروں کو چارہ نہیں ملتا تھا اس لیے وہ خوب موٹے نہیں ہوتے تھے اور ایسے مریل جانوروں کا گوشت مزے دار نہیں ہوتا -

معلم - پھر وہ کیا کرتے تھے -

متعلم - وہ اپنے مویشیوں کو ذبح کر لیتے تھے .

معلم - ٹھیک ہے وہ سرما آتے ہی وہ تمام مویشیوں کو ذبح کر لیتے تھے، صرف چند ایک مویشی نسل کشی کے لیے رکھے جاتے تھے. آخر ہم اپنے مویشیوں کو موسم سرما میں کیوں نہیں ذبح کرتے

متعلم - سترھویں صدی میں سردی آج کل کی نسبت زیادہ سخت ہوتی تھی -

متعلم ۲ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ شلغموں سے بھی بہت کام چل سکتا ہے -

معلم - ہاں یہی سبب ہے - چونکہ اس موسم میں وہاں گھاس بھی نہ ہوتی تھی. اس لیے جیڑوں والی بڑی

مثلاً شلغم بھی نہیں ہوتے تھے۔ اسی لیے ان کی چمنیوں میں گوشت محفوظ رکھا جاتا تھا۔ لیکن اگر آپ آج بھی سترھویں صدی کے مکان کی چمنی کو دیکھیں تو آپ کو وہاں کچھ نظر آئے گا؟

متعلم۔ اذیت ناک عذاب دینے کا سامان۔

متعلم ۲۔ ایک سیڑھی

متعلم ۳۔ ایک بڑی چمنی

معلم۔ ہاں۔ وہاں ایک چمنی تو تھی اور چمنی ہی وہ دیکھ بھی سکتے تھے۔ کیوں کہ چمنیاں بالکل ایک دوسرے کے بالمقابل ہوتی تھیں۔ تم نے ان لوگوں کے متعلق بھی کچھ سنا ہوگا جو ان چمنیوں میں چھپ جاتے تھے کیوں کہ تمہیں معلوم ہے کہ بعد کے زمانہ میں وہاں رومن کیتھولک مذہب کو ناجائز قرار دیدیا گیا تھا اور جن پادریوں کا تعاقب کیا جاتا تھا وہ وہاں چھپ کر جان بچاتے تھے، بھلا بتاؤ کہ چارلس اول کے زمانہ میں ان چمنیوں میں کون چھپتے تھے۔

متعلم۔ وہ لوگ جو شاہ کے طرفدار تھے۔

معلم۔ بالکل ٹھیک۔ تمہیں ایک بات یاد رکھنا چاہیے۔ تمہیں بتا دیا گیا ہے کہ اکثر دیہاتی سردار بادشاہ کے حامی تھے لیکن یہ بات پوری طرح صحیح نہیں۔ بھلا بتاؤ تو ہمیں اس بات کا علم کیسے ہوا؟

متعلم۔ بعض تعلقہ دار کتابیں تصنیف کر گئے ہیں۔

معلم۔ کیسی کتابیں۔

متعلم۔ روزنامچے۔

معلم۔ ہاں ان میں سے اکثر نے روزنامچے لکھے جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں ان پر کیا بیت رہی تھی۔ اب ہم گھروں کے متعلق زیادہ گفتگو نہ کریں گے۔ اس تصویر کو دیکھو۔ گھر میں ایسی ہی چمنیاں ہوتی تھیں۔ دوسرے کمروں میں چمنیاں نہ تھیں، دوسرے کمرے یا ملاقاتی کمرے ہوتے تھے، یا عورتوں کے کمرے لیکن گاؤں کے باہر ایسے مکانات بھی ہوتے تھے جہاں جاگیر کا کام سرانجام دیا جاتا تھا۔

متعلم۔ ممکن ہے وہاں صنعت کاروں کے مکانات ہوں۔

معلم - ٹھیک ہے - بڑھئی کی دوکان بھی وہیں تھی۔ اسی جگہ انجینیر بھی کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اور کونسی جگہیں تھیں۔

متعلم ۱ اصطبل متعلم ۲ لکڑیوں کے ذخیرے متعلم ۳ مویشیوں کے باڑے متعلم ۴ گاڑی خانہ متعلم ۵ لوہار کی دوکان۔

معلم - بجا ہے۔ کیوں کہ گھوڑوں کی نعل بندی کے لیے انہیں لوہار کی ضرورت ہوتی تھی۔ لیکن ہر گاؤں اپنی ضرورت خود پوری کر لیتا تھا اور وہ کتانے اور پہننے کی چیزیں لانے کے لیے لندن نہیں جاتے تھے ان مکانات میں باشندگان دہ کا کام بھی ہوتا تھا اور تعلقہ دار کا بھی۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تغیر مزاج اور واقف حال تعلقہ دار اور کون سے فرائض سرانجام دیتا تھا؟

متعلم - جاگیر کی رکھوالی کرتا تھا۔

معلم - ٹھیک ہے اسے جاگیر کے معاملات نپٹانا پڑتے تھے۔ اپنے والد کا جانشین بنتے ہی اس کا پہلا فرض یہ تھا کہ زراعت کے متعلق معلومات حاصل کر لے۔ سن ۱۶۶۰ء کے لگ تعلقہ دار زمینیں چھوڑ کر جانے تھے۔ حالاں کہ وہ باشندگان دہ سے روپیہ وصول کرتے تھے۔ لیکن ان کا قیام اب زیادہ تر کس جگہ ہوتا تھا؟

متعلم - بڑے قصبوں میں یا شہروں میں۔

معلم کس بڑے شہر میں؟

متعلم لندن میں۔

معلم ہاں لندن میں۔ وہ دربار شاہی میں حاضری کی مجبوریوں کے پیش نظر ایسی جگہ رہتے جہاں بادشاہ رہتا تھا۔ تاہم دوران سال میں اکثر و بیشتر بہت سے لوگ اپنی جاگیروں میں مقیم رہتے تھے لیکن وہ سارا دن کام نہیں کرتے رہتے تھے۔ بعض علاقوں کے تعلقہ داروں کی عادتیں بھی کچھ زیادہ پسندیدہ نہ تھیں۔ ان کی جائداد نفع بخش نہ تھی۔ ان کی مملوکہ زمین بنجر اور ناقابل کاشت ہوتی تھی۔ اس لیے ایسے تعلقہ دار زیادہ وقت ادھر ادھر مشاغل میں گزارتے

ان کا بڑا شغل کیا تھا؟

متعلم۔ شکار۔

معلم۔ شکار و ماہی گیری۔ وہ کس چیز کا شکار کرتے تھے؟

متعلم لومڑیوں کا۔

معلم لومڑی کا شکار ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اور ہر شکاری کو ایک لومڑی کے عوض ایک شلنگ انعام ملتا تھا۔ ان دنوں ایک شلنگ بھی بہت بڑی رقم خیال کی جاتی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ لومڑیاں ان کی مرغیوں کو مار ڈالتی تھیں۔ تعلقہ دار خود بھی اس شکار سے محظوظ ہوتا تھا۔ وہ اور کیا شکار کرتے تھے؟

متعلم۔ ہرن متعلم ۲ جنگلی سؤر

معلم۔ اس بارہ میں مجھے شک ہے۔ کیونکہ میرا خیال ہے اس وقت جنگلی سؤر وہاں موجود نہیں ہوں گے بہر حال وہ اس سے کم خونریز اور وحشی جانوروں کا شکار کرتے تھے، وہ جانوروں کے شکار میں ہفتہ ہفتہ بھر معروف رہتے تھے۔ اگر موسم خراب ہو جاتا تو سرائوں میں جا کر شراب نوشی شروع کر دیتے تھے۔ بعض اضلاع میں تعلقہ دار زمین سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے۔ اب بتائیے کہ تعلقہ دار کی بیوی کیا کرتی ہوگی؟

متعلم۔ وہ گاؤں والوں کی تیمارداری کرتی ہوگی۔

معلم۔ ہاں وہ جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ دوائیں تقسیم کرتی۔ اس کے علاوہ وہ اور کیا کرتی ہوگی؟

متعلم۔ وہ کشیدہ کاری بھی کر سکتی تھی۔ متعلم ۲ وہ کپڑے بنتی ہوگی۔

معلم۔ کپڑے بننا عورتوں کا کام نہیں اس میں بہت مشقت کرنی پڑتی ہے۔ کوئی اور آسان کام کر سکتی تھی!

متعلم۔ کاتنا۔

معلم۔ بالکل ٹھیک۔ وہ روئی کات کر دھاگہ تیار کرتی تھی۔ شراب کشید کرتی تھی۔ بھلا بتاؤ تو انہیں اتنی شراب کی کیوں ضرورت ہوتی تھی؟

تعلیم کا بنیادی تصوّر

محمد عامر فاروقی

تہذیب و تمدن کے ابتدائی زمانہ سے مفکرین اس سلسلہ میں برابر غور و فکر کرتے رہے ہیں کہ تعلیم اور اصول تعلیم کا حقیقی اور بنیادی تصور کیا ہونا چاہیے۔ ہر زمانہ میں عقلا، اور مذاق علم رکھنے والے اس مسئلہ پر غور کرتے رہے ہیں اور وہی اس کے اہل بھی ہوتے ہیں، وہ جنہیں حصول علم سے کبھی تشفی نہیں ہوتی، یوں تو سبھی ادھر ادھر سے مستعار معلومات حاصل کر لیتے ہیں لیکن ان کی معلومات بے ترتیب ہوتی ہیں اور کوئی ربط و نظم نہیں رکھتیں، برخلاف اس کے فلسفی مختلف علوم کی مدد سے حقیقت کی تلاش کرتا ہے۔

بقول سقراط "فلسفی وہ ہیں جو حقیقت کی روشنی کے متلاشی ہیں" حقائق زندگی کی دریافت ہی فطرت کے تمام رازوں کو انسان کے قدموں پر لا ڈالتی ہے اور وہ اشرف المخلوقات ہونے کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔ اسی چیز کو پروفیسر جان ڈیوی نے یوں لکھا ہے کہ جہاں کہیں بھی فلسفہ پر سنجیدگی سے غور کیا گیا ہے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلا ہے کہ فلسفہ کا مقصد ہی عقل کو اس مقام پر پہنچا دینا ہے جہاں وہ زندگی کے مختلف شعبوں پر اثر انداز ہو سکے، ہر شخص کا ایک نظریہ حیات ہوتا ہے اور وہ اسی کے مطابق زندگی گذارنا چاہتا ہے، فلسفہ زندگی کا فکری اور نظری رخ ہے جس سے زندگی کا راستہ متعین ہوتا ہے اور تعلیم اسی نظریہ حیات سے متاثر ہوتی ہے جس کا زندگی سے متعلق جو نظریہ ہوگا وہ اسی طرح کی زندگی کی تعمیر کے لیے تعلیم دے گا یا حاصل کرے گا یعنی یہ کہ تعلیم نظریہ حیات یا بالفاظ دیگر خود فلسفہ کا متحرک رخ ہے۔

یہ تو واضح ہو گیا کہ تعلیم کے مقاصد کون لوگ متعین کرتے ہیں اور اس کی محرک کیا چیز ہے مگر یہ چیز ابھی تشنۂ وضاحت ہے کہ خود تعلیم کیا ہے، اس سلسلہ میں یہ بات غلط ہوگی اگر ہم کہیں

رہماری زبان میں کوئی ایسا لفظ نہیں ملتا جس سے ہم اس مفہوم کو کما حقہٗ ادا کر سکیں جو موجودہ مفکرین کا اس خصوص میں ہے، اردو میں تعلیم و تربیت کے الفاظ میں اس کے معنی کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے، ہندی میں سکھشا کا لفظ بولا جاتا ہے تعلیم اور سکھشا دونوں الفاظ میں اس کی گنجائش نہیں کہ اس مفہوم کا بار اٹھا سکیں، اس لیے مجبوراً ہم کو دوسری زبان کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ انگریزی کے لفظ (EDUCATION) سے ہمارا کام نہایت آسانی سے نکل سکتا ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ لفظ (EDUCATI) بمعنی "تعلیم دینا" یونانی زبان سے لیا گیا ہے یونانی میں "E" کے معنی باہر کے آتے ہیں اور DUCA کے معنی "میں نکالتا ہوں"۔ کے۔ اس طرح ان دونوں سے مرکب لفظ EDUCATI کے معنی باہر نکالنے کے ہوئے۔ یعنی بچوں کے اندر جو نیکیاں اور خوبیاں اور صلاحیتیں ہیں ان کو باہر نکال کر حقیقت کی شکل دینا۔ بظاہر یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے مگر اس سے تعلیم کا ایک پہلو سامنے آتا ہے، یعنی بچوں کو کچھ خارجی معلومات نہیں پہونچائی جائیں، جو کچھ ان کے اندر موجود رہتا ہے اسی کو سامنے لایا جاتا ہے، اس طرح گویا آج سے پچاس برس بعد قائد اعظم کی تاریخ بھی بچے بتا سکیں گے، یا جنگ پانی پت میں بابر اور ابراہیم لودھی کی فوجوں کی تعداد اور جگہیں بھی بچوں کے ذہن میں موجود ہونا چاہیے۔ مگر یہ واقعہ نہیں ہے، واقعات بغیر بتائے نہیں معلوم ہو سکتے، دوسرا لفظ لاطینی زبان کا (EDUCERE) ہمارے پیش نظر ہے، اس کے معنی بھی پوشیدہ صلاحیتوں کو سامنے لانے کے ہیں اور یہیں اس لفظ سے بھی مایوسی ہوتی ہے مگر اس زبان میں ایک دوسرا لفظ EDUCARE نظر آتا ہے جس کے معنی پروان چڑھانا، اٹھانا، یا ترقی دینا ہے اصل میں آج کل جس معنی میں تعلیم و تربیت یا EDUCA-TION کا لفظ استعمال ہوتا ہے وہ یہی ہے، موجودہ طریقہ تعلیم میں بچے سے سوالات کر کے اس کے اندر کی صلاحیتیں اجاگر کی جاتی ہیں اور ساتھ ساتھ ایسے ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں جن سے ان کی فطری نشو و نما میں اصلاح ہو سکے، چنانچہ تعلیم و تربیت (جو کثرت استعمال سے EDUCATION کا مترادف مان لیا گیا ہے) سے مراد بچے کی فطری نشو و نما یا اٹھان میں اس طرح مدد کرنا ہے کہ اس کی

فطری قوتیں اور صلاحیتیں ایسی صورتیں اختیار کریں جو بغیر تعلیم کے نہ ہوتیں۔

وہ کون سے وسائل ہیں جن سے یہ اصلاحیں ممکن ہیں؟ بقول ایڈمس "تعلیم کے دو کنارے ہوتے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر دو سروں والا ل BI-POLAR PROCESS ہے جس کے ایک سرے پر معلم ہوتا ہے اور دوسرے سرے پر متعلم" انگریزی میں دو الگ الگ الفاظ EDUCAND اور PUPIL نظر آتے ہیں۔ مگر ہم اپنی زبان میں طالب علم یا متعلم ہی کے الفاظ سے دونوں کام نکالنا چاہتے ہیں۔ انگریزی کا لفظ PUPIL اگلے (قدیم زمانوں میں) طالب علم یا شاگرد کے معنی میں استعمال ہوتا چلا آیا ہے۔ مگر اس لفظ کی نمایاں خامی یہ ہے کہ اس کے سننے والے ذہنی طور پر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ شاگرد (PUPIL) استاد کے جا و بے جا اثر سے متاثر ہوتا ہے یعنی شاگرد کی حیثیت صرف معمول کی ہوتی ہے، وہ عامل نہیں ہوتا اور PUPIL کا لفظ آج کل کے وسیع معنی کے اظہار سے قاصر ہے چناں چہ اکثر مفکرین نے اس امر پر غور کیا اور آخر کار جان ایڈمس نے لفظ "EDUCAND" (وہ جسے تعلیم دی جائے) کی طرف اشارہ کیا۔ یہ لفظ اتنا ہی وسیع اور واضح ہے، جتنا EDU - CATION کا لفظ - EDUCATOR معلم کی وہ شخصیت ہوتی ہے جس کے ذہن میں تعلیم کا مقصد ہوتا ہے جس کے ماتحت وہ طالب علم پر ایک خاص اثر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود طالب علم اپنی تعلیم کا مقصد پا جاتا ہے اور اس پر عمل شروع کر دیتا ہے اس وقت وہ خود اپنا معلم بن جاتا ہے، ذاتی تعلیم کے معنی یہ ہونا چاہیے کہ طالب علم معلم۔ مدرسہ اور کتاب کو اس مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرے جو اس کے ذہن میں واضح ہو۔ ایسی تعلیم جو طالب علم اپنے آپ اخذ کرتا ہے تعلیمی عمل میں ایک نہایت اہم اور شانی درجہ رکھتی ہے تعلیم کے سلسلہ میں ایک اور لفظ اکثر شبہ پیدا کرتا ہے وہ پڑھانے کا لفظ ہے، عموماً لوگ تعلیم اور پڑھانے کو ایک معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح PUPIL اور EDUCAND کے الفاظ - حالاں کہ تعلیم EDUCATION پڑھانے TEACHING سے اپنے مفہوم میں کہیں زیادہ وسیع معنی رکھتا ہے۔

پڑھانے سے مراد علم و فن کو دوسرے تک پہونچانا ہے جو بظاہر ہر فطری نشوونما میں بہت کچھ معاون ہے، اس لیے یہ ذریعہ تعلیم تو ضرور ہے مگر اس میں استاد کی شخصیت کا براہ راست اثر نہیں پڑتا حالاں کہ تعلیم کا اہم ترین جزو شخصیت کا اثر ہے۔ اس طرح تعلیم کے دو ذرائع ہوئے۔ ایک معلومات کا بہم پہونچانا دوسرا شخصیت کا اثر۔ اس طرح تعلیم میں وہ منزل آتی ہے جب طالب علم خود اپنا معلم ہو جاتا ہے۔ ارتقا کی اس منزل پر پہونچ کر طالب علم کا کردار اور قوت ارادی پختہ اور مخصوصیات واضح ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں علم و معلومات کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

مندرجہ ذیل الفاظ میں ایڈمس نے اپنی تعلیمی تحلیل پیش کی ہے۔

۱۔ یہ ایک دو طرفہ عمل BI-POLAR-PRUCESS ہے۔ اس کے ارتقائی دور میں ایک شخصیت دوسری شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔

۲۔ یہ عمل صرف شعوری نہیں بلکہ ارادی ہوتا ہے۔

معلم کے ذہن میں طلبا کی نشوونما میں ضروری تغیر و تبدل کی راہیں واضح طور پر کھلی ہوتی ہیں

۳۔ وہ ذرائع جن سے طالب علم کی نشوونما میں اثر ڈالا جاتا ہے دو ہیں۔

(ا) طالب علم کی ذات پر معلم کی ذات کا براہ راست اثر۔

(ب) علم کا اس کے مختلف گوشوں کو ذہن میں رکھ کر برمحل استعمال۔

امریکہ میں اعلیٰ تعلیم اور غیر ملکی طلبہ

شاہد اشرف مسلسل نمبر ۲

تاریخی پس منظر اور جدید تبدیلیاں

امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے کارخانوں اور بڑے بڑے شہروں نے ترقی کرنا شروع کی۔ لیکن اس قدر جدید ہونے کے باوجود اسکی ترقی کی رفتار یہ ہے کہ کچھ عرصہ بعد سے لے کر ۱۷۷۶ء تک ایک سو چالیس برس کے عرصہ میں صرف نو کالج قائم ہوئے تھے۔ ہارورڈ کی بنیاد ۱۶۳۶ء اور ییل کی بنیاد ۱۷۰۱ میں رکھی گئی تھی لیکن ان کی حیثیت موجودہ وقت کے ثانوی مدرسوں سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۷۷۶ء سے لے کر ۱۸۶۱ء کی خانہ جنگی تک کالجوں کی تعداد ۲۰۷ تک جا پہنچی ۔ ۱۹۴۰ء میں کالجوں، یونی ورسٹیوں اور دوسرے اعلیٰ تعلیمی اداروں کی تعداد ۱۷۰۰ سو تھی۔

خانہ جنگی کے وقت تک حالت یہ تھی کہ تمام کالج مذہبی جماعتوں کے قائم کردہ تھے اور ان ہی کی زیر نگرانی چل رہے تھے۔ ان کا بڑا مقصد یہ تھا کہ پادری تیار کیے جائیں اور عیسائی کردار کی تربیت کی جائے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں کالجوں کی تعلیم پر سے مذہب کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی۔ مذہبی تعلیم کو کم وقت ملنے لگا۔ طلبہ کو مضامین چننے کا تھوڑا بہت اختیار مل گیا۔ رفتہ رفتہ غیر ملکی زبانوں، سائنسوں اور مخصوص مضامین کے نصاب بھی پیش کیے جانے لگے ۔ ۱۸۶۲ء میں کانگرس نے ایک قانون منظور کیا جس کی رو سے ریاستوں کو وسیع زرعی رقبے اس غرض کے لیے دیے گئے کہ زراعت اور مشینی فنون کے لیے کالج قائم کریں۔ اس وقت سے ریاستی یونی ورسٹیوں نے تیزی سے ترقی کرنا شروع کی، چنانچہ ایسے کالجوں اور یونی ورسٹیوں کی تعداد بڑھنے لگی جو صرف دینیات

تعلیم کے لیے قائم ہوئی تھیں، ان کے نصاب میں توجہ کا مرکز فنون، سائنس اور امریکی معاشرے کے مسائل تھے۔ لیکن ۱۸۶۵ء کی اعلیٰ تعلیم بھی موجودہ وقت سے مختلف تھی، اب تک ہارورڈ کی حیثیت ایک چھوٹے سے کالج سے زیادہ نہ تھی جو مالی مشکلات سے دوچار تھا اور ابھی تحقیق و جستجو کی راہ سے بے خبر تھا۔ سائنس کے شعبہ کو چھوڑ کر اس کے دوسرے نصاب موجودہ وقت کے ثانوی مدرسوں سے بھی کم تر تھے۔ ییل کی حالت اس سے بھی زیادہ خستہ تھی، اس کے پروفیسر کی تنخواہ ایک کم عمر پادری کی تنخواہ سے بھی کم تھی، لائبریری کا چندہ وصولی سے پہلے ہی خرچ ہو جاتا تھا۔ اکثر کالجوں میں غیر ملکی زبانوں کا کوئی نصاب نہ تھا، سائنس کا نصاب بھی بالکل معمولی تھا۔ پروفیسر کمرۂ جماعت میں خود ہی تجربہ کر کے طلبہ کو دکھا دیتا تھا، انہیں خود تجربہ کرنے کا کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ نصاب کی روح رواں یہ مضامین تھے:- کلاسیکی زبانیں۔ ریاضی۔ اخلاقیات اور علم الکلام۔ ایک پروفیسر عموماً چار پانچ مضامین پڑھاتا تھا۔

غرض ۱۸۶۵ء میں اعلیٰ تعلیمی اداروں کی عام حالت یہ تھی۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں نصاب تعلیم اور کالجوں کی عام حالت میں ترقی شروع ہوئی۔ بیسویں صدی کے آغاز تک ترقی کا قدم کافی تیز ہو چکا تھا۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں کی عام ترقی کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد طلبہ میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ذیل کے اعداد اس صورت حال کی خبر دیتے ہیں۔

سال	کالجوں میں تعداد طلبہ
۱۹۰۰ء	۲۳۷۵۹۲
۱۹۲۱ء	۵۹۷۸۸۰
۱۹۳۰ء	۱۴۹۴۲۰۳
۱۹۴۴ء	۱۱۵۵۲۷۲
۱۹۴۸ء	۲۶۱۶۲۶۲

امریکی اعلیٰ تعلیم میں گریجوایٹ اسکول نسبتاً ایک نئی پیداوار ہے، ہارورڈ نے ۱۸۷۲ء میں

گریجوایٹ اسکول کا آغاز کیا، جب اسے قائم ہوئے دو سو سال سے اوپر گذر چکے تھے بسلسلہ ۱۸۷۶ء میں
جب جان ہاپکنز یونی ورسٹی قائم ہوئی تو یہ پہلی یونی ورسٹی تھی جس نے گریجوایٹ اسکول جاری کیا
انیسویں صدی کے خاتمہ پر جب ہارپر نے شکاگو یونی ورسٹی کی صدارت سنبھالی تو اس نے اپنی حکمت عملی
کے اعلان کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا پہلا مقصد علم کی تلاش ہوگا اور دوسرا مقصد اس کی
تدریس، یہ وہ زمانہ ہے جس میں گریجوایٹ تعلیم نے خاص طور پر ترقی کی۔ اس وقت سے لے کر آپ
امریکی کالجوں اور یونی ورسٹیوں نے مختلف سمتوں میں لگاتار پیش قدمی کی ہے۔ کالجوں اور یونی ورسٹیوں
کے طلبہ کی تعداد میں بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی پروفیسروں کی تعداد میں بھی جن میں
سے بعض امریکی اور غیر ملکی پروفیسر عالم گیر شہرت کے مالک ہیں۔ آج امریکی گریجوایٹ سکول اپنے
تحقیقی کام، تعلیمی معیار اور مجلسی افادیت کے لحاظ سے دنیا کے ہر ملک کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ رہنماؤں کی
تربیت اور علم کی دریافت اور اشاعت کے لیے یونی ورسٹی نے امریکی زندگی میں ایک مؤثر اور
باوقر جگہ حاصل کر لی ہے۔

یونی ورسٹی کو جن مسائل کا آج سامنا ہے وہ اس امر کی پیداوار ہیں کہ یونی ورسٹی پچھلی نصف صدی
میں نشو نما پائی ہے تعلیم کے ماہروں کو اس بات کا خوب احساس ہے کہ جدید زندگی کے انتشار میں
جذب کرنے اور تعلیم کو مقصدیت عطا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یونی ورسٹی تعلیم میں متحد کن قوتوں کی
تلاش کی جائے۔ مذہب جو کبھی ذہنی اور جذباتی طور پر متحد کن قوت کا کام دیتا تھا اب کام نہیں دے
سکتا اور محض جذبہ تبدیلی متحد کن قوت کا کام نہیں دے سکتا۔ آج یونی ورسٹی تعلیم جس نصب العین کی
طرف بڑھ رہی ہے وہ کچھ اس قسم کا ہے :۔

خواہ اقدار کے معاملہ میں اتفاق رائے نہ بھی ہو تو بھی علم کی تلاش میں مل جل کر کام کیا جا سکتا
ہے۔ انسانی روح کی قدر و قیمت میں پختہ یقین ہونا چاہیے، خواہ اس روح کو کسی رنگ میں بھی
سمجھا جائے، غرض یہ وہ بنیادی اصول ہے جو یونی ورسٹی تعلیم کی عام رہنمائی کا کام انجام دے رہا ہے
یہ ایک ایسا تصور ہے جو آزاد خیال جمہوریت کی ہمیشہ بنیاد رہا ہے یہ اصول اس بات کو خندہ پیشانی

تسلیم کرتا ہے کہ اختلاف رائے موجود ہے اور موجود رہنا چاہیے۔

آرٹس کالج

آرٹس کالج خواہ یونی ورسٹی کا ایک جزو ہو یا جداگانہ ہستی رکھتا ہو اس کی بڑی غایت یہ ہے کہ نوجوانوں کو ایسی وسیع المشرب ذہنی تربیت دی جائے کہ اس کے بعد خواہ وہ براہ راست شہری زندگی کی ذمہ داریاں اٹھائیں اور خواہ گریجوایٹ سکول میں داخل ہو کر آگے تعلیم جاری رکھیں۔ کالج کا کام یہ ہے کہ وہ طلبہ کو بالغ زندگی کے لیے تیار کرے، انہیں وہ ثقافتی پس منظر اور ذہنی اوزار عطا کرے جن کی مدد سے وہ اپنے خاص فن یا علم میں خصوصی مہارت پیدا کر لیں۔

آرٹس کالجوں میں سے بعض ریاستوں کی نگرانی میں ہیں اور بعض پرائیویٹ انجمنوں کے ہاتھ میں یہ انجمنیں معتمدوں کا ایک بورڈ کالج کی دیکھ بھال کے لیے قائم کر دیتی ہیں۔ پرائیویٹ کالجوں میں اکثریت ایسے کالجوں کی ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ مذہبی جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک عام کالج میں اگرچہ آخری ذمہ داری معتمدین کے بورڈ پر ہے۔ لیکن روزمرہ کا انتظامی کام انتظامی افسروں کے حوالے ہوتا ہے۔ ان انتظامی افسروں کی تعداد کا انحصار کالج کی وسعت پر ہے۔ ایک چھوٹے کالج میں ایک صدر اور اس کی سکرٹری ہی یہ کام انجام دے لیں گے۔ لیکن ایک بڑے کالج میں صدر کے ماتحت کئی ایک نائب ہوتے ہیں۔ مثلاً نائب صدر۔ ڈائرکٹر۔ ڈین۔ رجسٹرار کاروباری افسر، تعلقات عامہ کا افسر وغیرہ۔

مختلف نقطہ ہائے نگاہ:۔ آرٹس کالجوں کا عام طریقہ جس سے وہ اپنے طلبہ کو عام قسم کی وسیع المشرب تعلیم دیتے ہیں یہ ہے کہ مختلف مضامین کے متعلق ضروری شرائط مقرر کر دی جاتی ہیں اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ ہر مخصوص میدان مطالعہ میں طالب علم کو خاص وسعت نگاہ حاصل ہو جائے بعض اوقات محض میدان مطالعہ کی تعیین کر دی جاتی ہے اور بعض اوقات دو تین مضامین مقرر کر دیے جاتے ہیں۔ بعض کالجوں میں زیادہ مضامین لینا ضروری ہے اور بعض میں کم لیکن ہر کالج کچھ نہ کچھ مضامین ضروری لازمی قرار دیتا ہے، دوسرے ملکوں کے مقابلے میں یہ طریق کار بہت

مختلف ہے، اس لیے غیر ملکوں سے آنے والے طلبہ کو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے امریکی کالجوں
طلبہ پر غیر ضروری پابندی لگا دی گئی ہو لیکن حالت یہ ہے کہ لازمی مضامین کالج کے پہلے
دو سالوں میں ختم ہو جاتے ہیں، آخری دو سالوں میں طلبہ کو انتخاب کی پوری آزادی ہے
کالج کی تعلیم کے متعلق دوسرا طریق کار یہ ہے کہ انسانی علوم، معاشرتی علوم اور سائنسو
ایک عام نصاب پیش کیا جاتا ہے، ان نصابوں سے طلبہ کو علوم کی بنیادی شاخوں سے تعا
ہو جاتا ہے اور وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ خصوصی مطالعہ کے لیے علم کی کسی ایک شا
کو چن لیں، یہ عام نصاب کالج کے ابتدائی دو سالوں میں طلبہ کو نصف وقت کے لیے مصروف
رکھتے ہیں۔

کچھ سال ہوئے ریاست میری لینڈ کے سینٹ جان کالج نے ایک نیا نصاب تیار
جسے عظیم کتب کے نصاب کا نام دیا گیا، اس نصاب کی صورت یہ ہے کہ طالب علم پورے چار
تک تقریباً ان سو کے لگ بھگ کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا ہے جو مغربی تفکر کی کلاسیکی کتا
قرار پا چکی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ جدید زبانوں ریاضی اور تجرباتی سائنسوں کا مطالعہ
کیا جاتا ہے، نصابوں کے انتخاب اور خصوصی مہارت کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

ایک اور طریق کار انفرادی راہنمائی کا طریق ہے۔ مگر اس کے لیے پروفیسروں کی ایک
بڑی تعداد کی ضرورت ہے، اس لیے یہ طریقہ بہت مہنگا ہے، اس طریق کار کے مطابق پہلے
طرح طرح کے نصاب محض تمہیدی طور پر پڑھے جاتے ہیں: تاکہ ہر طالب علم مطالعہ کی وہ مخصوص
دریافت کر سکے جس میں اسے سب سے گہری دلچسپی ہے، اگلے دو سو سال اس گہرے م
نذر ہوتے ہیں۔

مردانہ اور زنانہ تعلیم:۔ اعلیٰ تعلیم کے جو ادارے آج سے کوئی سو برس پہلے یا اس
قائم ہوئے تھے وہ عموماً صرف مردوں کو داخل کرتے ہیں، ایسے ادارے بھی ہیں جو عو
مخصوص ہیں لیکن اکثریت ایسے اداروں کی ہے جہاں تعلیم مخلوط ہے، یعنی مردوں اور

دونوں کو داخل کیا جاتا ہے۔ ملک کے مغربی حصے میں مخلوط تعلیم کا بہت رواج ہے، جبکہ الگ الگ مردانہ اور زنانہ ادارے زیادہ تر اوقیانوس کی ساحلی ریاستوں اور نیو انگلینڈ کی ریاستوں میں پائے جاتے ہیں ایک ایک کر کے پرانی یونی ورسٹیوں نے اپنے دروازے عورتوں کے لیے بھی کھول دیے ہیں اور اب تمام ریاستی یونی ورسٹیوں میں تعلیم مخلوط ہے، تاہم پرائیویٹ یونی ورسٹیوں نے اس معاملہ میں بڑی آہستگی اور احتیاط سے کام لیا ہے۔

تعداد طلبہ کے لحاظ سے بھی سب کالج ایک سے نہیں، کچھ ایسے بھی جن میں پڑھنے والوں کی گنتی سو سے زیادہ نہیں، لیکن ایسے کالج بھی ہیں جن میں تعداد طلبہ چار یا پانچ ہزار تک جا پہونچی ہے بعض کے رقبے اتنے وسیع ہیں کہ وہ بذات خود ایک قصبے کا درجہ رکھتے ہیں ان میں گھاس کے میدان ہیں، ٹینس کے میدان ہیں دوکانیں ہیں تھیٹر ہیں اور نہانے کے لیے تالاب ہیں۔

ہر امریکی کالج مضامین کی بنا پر مختلف شعبوں میں بٹا ہوا ہے لیکن اس تنظیم کا کوئی معیاری نمونہ نہیں۔ اب عام رجحان یہ ہے کہ مضامین کی چھوٹی چھوٹی حد بندیوں کی بجائے انہیں چند ایک بڑے بڑے دائروں میں بانٹ دو مثلاً انسانی علوم اور طبعی سائنسیں ان دو علمی میدانوں کے تحت کالج یا کیلنڈر ہر سال ان مضامین کی فہرست شائع کرتا ہے جو لیے جا سکتے ہیں۔ کیلنڈر میں ہر مضمون کی ضروری شرائط درج ہوتی ہیں اور یہ بھی ذکر ہوتا ہے کہ اس مضمون کے لیے کون سا استاد ذمہ دار ہے

بی۔ اے کی ڈگری:۔ بی۔ اے (آرٹس) اور بی۔ ایس (سائنس) کی ڈگری امریکہ میں انڈر گریجوایٹ ڈگری کہلاتی ہے، اس کے لیے نصاب کی مدت چار سال ہے پیچھے ذکر ہو چکا ہے کہ ایک طریق کار کے مطابق پہلے دو سال عام مطالعہ میں صرف ہوتے ہیں۔ آخری دو سالوں میں زیادہ توجہ ایک خصوصی مضمون پر دینا پڑتی ہے جو میجر یا "بڑا مضمون" کہلاتا ہے، وہ پروفیسروں میں سے ایک کی مدد سے مطالعہ کے اس خاص میدان میں اپنا منصوبہ تیار کرتا ہے۔

کالج کا تعلیمی سال دو بڑے حصوں (سمسٹروں) میں بٹا ہوتا ہے۔ یعنی بہار کا سمسٹر اور پت جھڑ کا سمسٹر

بعض اوقات ایک خاص گرمائی نصاب بھی دستیاب ہوتا ہے۔ لیکن یہ باقاعدہ سمسٹر نہیں گنا جاتا عام دستور یہ ہے کہ ایک پورے سمسٹر کے لیے ہر طالب علم چار یا پانچ مضامین چن لیتا ہے بعض تجربے اس قسم کے بھی کیے گئے ہیں کہ طالب علم ایک وقت میں صرف ایک ہی مضمون کو تیار کرے اور اسے نسبتاً تھوڑے وقت میں ختم کر لے۔

بعض کالج طلبہ کو یہ اجازت بھی دیتے ہیں کہ تیسرے یا چوتھے سال میں پیشہ ورانہ پڑھائی بھی شروع کر دیں اور پیشہ ورانہ تربیت کے ایک دو یا تین سال ختم ہونے پر بی۔اے کی ڈگری حاصل کر لیں، یہ طریق کار بعض صورتوں میں اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب طلبہ نے قانون، طب یا انجینئرنگ میں پڑھائی جاری رکھنی ہو، دوسرے ملکوں سے آنے والے طلبہ کے داخلہ سے پہلے ہر امریکی یونیورسٹی اس کے تعلیمی پس منظر کا جائزہ لینا ضروری سمجھتی ہے اس جائزہ کے نتائج کی روشنی میں طالب علم کو امریکی ڈگری حاصل کرنے کے لیے کم یا زیادہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔

کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بی۔اے اور دوسرے امتحانوں کی ڈگریاں حاصل کرنے کے لیے جو شرائط پوری کرنا پڑتی ہیں وہ عام طور پر سمسٹر کے گھنٹوں کا دستور یا نقاط کا دستور کہلاتا ہے، یہ ذکر ہو چکا ہے کہ عموماً ہر سمسٹر میں ایک طالب علم چار یا پانچ مضامین لے گا ہر مضمون کی پڑھائی ہفتہ میں تین بار ہو گی اور ہر دفعہ اسے ایک گھنٹہ وقت دیا جائے گا، اسی طرح ہر مضمون کامیابی سے ختم کرنے پر طالب علم کو سمسٹر کے تین گھنٹے فی ہفتہ کا صلہ تین نقاط کی صورت میں ملے گا۔ اگر کوئی مضمون ایسا ہے کہ اسے ہر ہفتہ صرف ایک گھنٹہ ملتا ہے تو اسے کامیابی سے ختم کرنے پر طالب علم صرف ایک نقطہ حاصل کرے گا۔ اگر مضمون کو دو گھنٹے فی ہفتہ ملتے ہیں تو اس کے لیے دو نقطے۔ اوسطاً ایک طالب علم ایک سمسٹر میں پندرہ نقاط حاصل کرتا ہے اور بی۔اے کی ڈگری کے لیے ۱۲۰ نقاط درکار ہیں۔ کئی کالجوں میں فیس کی شرح کا انحصار اختیار کردہ مضامین کے نقاط کی تعداد پر ہے۔

اساتذہ :- اکثر امریکی کالجوں میں پڑھانے والے پروفیسر ہی کالج کے نصاب۔ ڈگری

مل کرنے کی شرائط اور داخلے کی شرائط کا فیصلہ کرتے ہیں، پروفیسروں کی درجہ بندی ان کی
ہمی قابلیت اور شہرت کی بنا پر کی جاتی ہے۔ کالج کے اساتذہ کے لیے سب سے نچلا درجہ انسٹرکٹر
ا ہے، پھر اسسٹنٹ پروفیسر کا۔ پھر ایسوسی ایٹ پروفیسر کا اور آخر میں پروفیسر کا۔ امریکی تعلیم
نا ایک مسلمہ روایت یہ ہے کہ بعض ضروری حدود مثلاً درست بیانی اور دوسروں کی رائے کے
حترام کا لحاظ رکھتے ہوئے پروفیسر کو مکمل آزادی ہو کہ تحقیق و مطالعہ کرے اور اپنے نتائج کو
آزادانہ شائع کرے اور کمرۂ جماعت میں ان پر بحث کرے۔ دوسرے ملکوں سے جو طلبہ امریکی
یونی ورسٹیوں میں آتے ہیں وہ اس بات سے ضرور متاثر ہوتے ہیں کہ پروفیسر اور طلبہ کے
درمیان کیسے غیر رسمی مراسم موجود ہیں، پروفیسروں سے ملنے کے لیے دفتر کے اوقات میں یا پڑھائی
کے اوقات کے بعد آسانی سے وقت مقرر کیا جا سکتا ہے، وہ بڑی بے تکلفی اور ہمدردی سے
طلبہ کے ہر قسم کے مسائل کو سنتے اور ان کے متعلق ہر قسم کی امداد دیتے ہیں۔

امریکی پروفیسروں اور طلبہ کے مابین آسان مراسم کا درست تصور ان غیر ملکی طلبہ کے لیے
مشکل ہے جنہوں نے امریکی یونی ورسٹی کی فضا نہیں دیکھی۔ اس نکتہ کو صاف کرنے کے لیے
ایک دو مثالوں کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ راقم تین دوسرے پاکستانیوں کے ساتھ ایک امریکی
یونی ورسٹی میں تھا۔ ہم میں سے ایک بیمار ہو گیا اس بے چارے کو ایک تو جسمانی تکلیف تھی دوسرے
گھر کے فراق نے اسے کچھ ایسا بدحال کر رکھا تھا کہ اس کی ذہنی کیفیت لگاتار بدحواسی کی حد کو پہنچ
رہی تھی، اس کی ذہنی معذوری کے باعث اس کے اپنے دوست اور ہم وطن اس سے تنگ
پڑنے لگے۔ لیکن پروفیسر صاحب کوئی دو مہینے تک مسلسل اس کے علاج اور تیمارداری کا ہر ممکن
اہتمام کرتے رہے، یہ ان ہی کی خاطر داری کا صدقہ تھا کہ یہ شخص اپنا نصاب پورا کر سکا۔

امریکی کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں عام پڑھانے کا طریقہ یہ ہے کہ لیکچر دیا جاتا ہے اس کے
بعد جماعتی بحث و تمحیص ہوتی ہے، ایک عام مضمون جو تین نقاط کا حامل ہو اس پر عموماً ہفتے میں
دو یا تین لیکچر ہوں گے اور ایک گھنٹہ اس بات کے لیے وقف ہوگا کہ لیکچروں میں جو کچھ

کیا گیا ہے یا طلبہ نے اپنے طور پر جو کچھ پڑھا ہے اس پر بحث کی جائے۔

بعض استاد یوں بھی کرتے ہیں کہ طالب علم کو کسی موضوع پر تیاری کرنے کو کہہ دیا اور مقررہ تاریخ پر اس نے جماعت کے سامنے فراہم کردہ معلومات کی رپورٹ کی۔ اس طرح طلبہ سے مقالے تیار کرنے اور مختلف قسم کے منصوبے تیار کرنے کو بھی کہا جاتا ہے۔ بڑی غرض یہ ہوتی ہے کہ طلبہ میں جرأت عمل۔ قوت استدلال اور قوت اظہار پیدا کی جائے بعض اوقات طالب علم کسی موضوع پر رپورٹ پیش کرتا ہے اور ساری جماعت اس پر بحث کرتی ہے۔ حقیقی طور پر تخلیقی نصابوں مثلاً مضمون نگاری یا تصویر کشی میں طالب علم استاد کے سامنے کلی طور پر اپنا تیار کردہ چیز پیش کرتا ہے، استاد اس میں درستیاں کرتا ہے اس پر رائے زنی کرتا ہے اور طالب علم کے ساتھ بحث کرتا ہے مضمون نگاری میں جماعت کے پیریڈ میں اس کے فن کے اصولوں پر بحث ہوگی اور مصوری میں طلبہ استاد کی رہنمائی میں تصویریں بنائیں گے۔

قدر و قیمت کا اندازہ: — امریکی کالج لگاتار اس کوشش میں رہتے ہیں کہ ہر طالب علم کے کام کی قدر و قیمت کا اندازہ ساتھ ساتھ ہوتا رہے، غیر ملکی طلبہ کو عموماً یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً یورپ میں طالب علم کو تقریباً بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے، اس کے برعکس امریکی کالج طلبہ کی تعلیمی ترقی، صحت، کردار، شخصیت اور غیر نصابی سرگرمیوں کا پورا ریکارڈ رکھتے ہیں، اس غرض کے لیے نہ صرف کمرہ جماعت کی کارکردگی کو دیکھا جاتا ہے بلکہ سمسٹر کے دوران اور اس کے خاتمہ پر امتحان ہوتے ہیں۔ طلبہ اپنی پسند کے موضوع پر مقالے لکھتے ہیں۔ ان تمام باتوں کو نگاہ میں رکھ کر استاد ہر طالب علم کو اس کے کام کی خوبی کے لحاظ سے پانچ درجوں کے پیمانے میں جانچ اور تولتا ہے اور اسے حرفی نشان دیتا ہے۔ نشان "ا" نہایت اعلیٰ کام کا نشان ہے۔ اگر اسے ہندسی شکل دی جائے تو اس کا مطلب نوے سے سو فی صد کے درمیان ہے "ب" کا مطلب ہندسی طور پر ۸۰ سے ۹۰ فی صد بنتا ہے۔ "ج" کا مطلب ہے خاصا۔ ہندسوں میں اس کا مطلب ۷۰ سے ۸۰ فی صد کے درمیان ہے۔ "د" کا مطلب یہ ہے کہ کام معمولی ہے تاہم طالب علم کام یاب

دراس قابل ہے کہ آگے بڑھ سکے ۔ بہت سے مدرسوں میں یہ نشان ۶۰ سے ۷۰ فی صد کے درمیان کو ظاہر کرتا ہے "ہا" کا نشان اس امر کی دلیل ہے کہ کام تسلی بخش ہے۔ طالب علم نے ۶۰ فی صد سے کم نشانات حاصل کیے ہیں اور وہ ناکام رہا ہے ۔ غیر ملکی طلبہ کو اکثر اس قسم کا تفصیلی جائزہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے ، ایک غیر ملکی طالب علم نے اس بارے میں اپنی رائے یوں ظاہر کی ہے :-

آپ یہ بات تسلیم کریں گے کہ یورپ سے آنے والے طالب علم کے لیے یہ بات بڑی عجیب ہے کہ امریکہ جو زندگی کے ہر میدان میں آزادی کا قائل ہے ۔ کالج کے طلبہ کو ایسے کڑے شکنجے میں کس کر رکھے جو مدرسوں کے طلبہ ہی کے لیے موزوں ہے ، ہر شخص جو ذمہ داری کا کچھ بھی احساس رکھتا ہو اور جو اپنا کام بد دلی سے کرنے کا عادی نہ ہو وہ ضرور محسوس کرے گا کہ بہت سی آزمائشیں اسے کم سنی کا احساس دلاتی ہیں۔

بعض امریکیوں کا بھی یہی خیال ہے کہ طلبہ کی درجہ بندی کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ توجہ صرف ہوتی ہے ، لیکن اس کے لیے اہم وجوہ موجود ہیں ، امریکہ کے سے پیچیدہ نظام تعلیم میں یہ امر بہت ضروری ہے کہ طلبہ کا انفرادی ریکارڈ موجود رہے تاکہ یہ ریکارڈ ایک .... ادارے سے دوسرے ادارے میں آسانی سے منتقل ہو سکے ، اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سست رو طلبہ کی ہر وقت مدد ہو سکتی ہے ، تیسرا یہ کہ نئے طلبہ کے پس منظر کے متعلق علم ہو جاتا ہے ۔ کالج سے فارغ ہونے پر جب طلبہ کام کاج کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں تو ان کو ملازم رکھنے والے ان کا تعلیمی درجہ شاذو نادر ہی دریافت کرتے ہیں اور وہ بھی صرف ایسی صورتوں میں جب طالب علم کو کام کا پہلے کوئی تجربہ نہ ہو ، اس سلسلہ میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ دوسرے ملکوں کی نسبت امریکہ کی آبادی کا ایک بڑا حصہ کالجوں میں جاتا ہے اور کالج میں داخلہ کے وقت طلبہ کی عمر عموماً اٹھارہ برس کے لگ بھگ ہوتی ہے ۔

کتب خانہ :- طریقہ ہائے تدریس کے متعلق اوپر جو کچھ بیان ہوا ہے اس کی روشنی میں یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ کتب خانہ امریکی کالج اور یونی ورسٹی کا دل ہے ، حالیہ سالوں میں طلبہ کی تعداد میں

جو اضافہ ہوا ہے اور بعض کالجوں نے جو عام تمہیدی نصاب جاری کیے ہیں ان کی بدولت کتب خا
کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ کتب خانوں نے حال ہی میں ایک اور سہولت کا آغاز کیا ہے
وہ یہ کہ ایک نئی تنظیم کے ماتحت جو کتاب ایک کتب خانے میں موجود ہو وہ ملک کے ہر کتب خا
کو ادھار مل سکتی ہے۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ تحقیقی اور علمی مطالعہ کرنے والوں کو ملک
بھر کے کتب خانوں کی خدمات حاصل ہو گئی ہیں۔

طلبہ کے لیے خاص سہولتیں: - کالجوں کو اب یہ احساس بھی ہوا ہے کہ ان کے ذمہ
ذہنی تربیت کے علاوہ بعض اور فرائض بھی عائد ہوتے ہیں۔ بہت سے کالج اس وقت پیشہ
انتخاب اور مضامین کے انتخاب میں مشورہ دیتے ہیں۔ طلبہ کو کالج کی زندگی سے روشناس
کرانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ مالی مدد کا بندوبست کرتے ہیں اور طبی امداد کی سہولتیں بہم پہنچا
ہیں۔ یہ تمام امدادی خدمات ایک انتظامی افسر کی نگرانی میں رکھی جاتی ہیں جو طلبہ کا ڈین ک
ہے۔ طبی سہولتوں کا یہ حال ہے کہ بعض چھوٹے اداروں میں صرف ایک تربیت یافتہ نرس ہ
سب کچھ ہے تو کئی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تربیت یافتہ ڈاکٹروں اور نرسوں کا پورا عملہ موجو
اور ساتھ ہی ہسپتال بھی ہے، نہ صرف یہ بلکہ دانتوں کے ماہر ڈاکٹر اور ماہر نفسیات کی خد
بھی موجود ہیں بعض اداروں میں دستور ہے کہ داخلہ کے وقت طالب علم کا طبی معائنہ ہ
ہے اور سال کے دوران میں بھی یہ معائنہ ہوتا رہتا ہے، حالیہ سالوں میں کئی کالجوں اور یونیورسٹ
نے غیر ملکی طلبہ کے لیے مشیر مقرر کیے ہیں جو ان کی ہر ممکن سہولت اور امداد کے ذمہ دار ہو

غیر نصابی سرگرمیاں: - کالج کے طلبہ کی زندگی میں غیر نصابی سرگرمیاں ایک اہم جگہ رکھتی ہی
انڈر گریجوایٹ سطح پر ان کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے، ان سرگرمیوں کی لاتعداد قسمیں ہیں۔ ا
کھیلیں، علمی سرگرمیاں اور ہر قسم کی مجلسی سرگرمیاں شامل ہیں، ان میں سے بعض کا طلبہ کلی ط
خود اہتمام کرتے ہیں اور بعض ایسی ہیں جن کا بندوبست طلبہ اور کالج کے اشتراک سے ہوتا ہے
غیر نصابی سرگرمیوں کی ہمہ گیری اور تنوع اس امر کی ایک اور دلیل ہے کہ امریکی کالج او

یونی ورسٹی ساری زندگی کو احاطہ کیے ہوئے ہے، یہ سرگرمیاں ایک طرح سے کالج کی علمی زندگی اور بیرونی مجلسی زندگی کے درمیان پل کا درجہ رکھتی ہیں، ان کی بدولت طلبہ کی زندگی زیادہ خوش گوار اور زیادہ پرقیمت بن جاتی ہے، ایک غیر ملکی طالب علم نے ان سرگرمیوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :-

امریکی طلبہ پڑھائی اور مجلسی سرگرمیوں میں برابر وقت صرف کرتے ہیں۔ مدرسہ میں براہ راست زندگی کی تیاری میں لگے ہوتے ہیں، ان میں بڑی تعداد ایسے طلبہ کی ہوتی ہے جو روپیہ کماتے کے ساتھ ساتھ پورا علمی بوجھ بھی اٹھائے رکھتے ہیں، مجھے ان کا یہ طریق بہت پسند ہے، اس سے ان کے ہاتھوں کی بھی بہت تربیت ہوتی ہے اور دماغوں کی بھی، وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ زندگی کے ہر مسئلہ کا ڈٹ کر سامنا کر سکیں۔

بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ طلبہ غیر نصابی سرگرمیوں میں اس زور و شور سے مگن ہو جاتے ہیں کہ پڑھائی کا ہرج ہونے لگتا ہے، ایسی صورت میں کالج کو مجبوراً ان سرگرمیوں پر کچھ بندش لگانی پڑتی ہے۔

سب سے زیادہ پسندیدہ سرگرمی کھیلیں ہیں، ان میں ہر طالب علم دلچسپی لیتا ہے بعض طلبہ براہ راست ان میں حصہ لیتے ہیں اور بعض مختلف کھیلوں کے مقابلوں کا لطف بطور تماشائی اٹھاتے ہیں، کھیلوں میں سب سے زیادہ رنگینی اور پرجوش مقابلے فٹ بال کے ہوتے ہیں، فٹ بال کے میچوں میں طلبہ اور دوسرے تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ کھچے آتے ہیں۔ بعض یونی ورسٹیوں کے سٹیڈیم میں ایک لاکھ بلکہ اس سے زائد تماشائیوں کے بیٹھنے کا انتظام موجود ہے۔ پرہنگامہ میچوں میں یہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں رہتی، چاروں طرف میلوں تک کاریں ہی کاریں کھڑی نظر آتی ہیں۔ میچ کے ہمراہ ناچوں اور دوسری مجلسی تقریبوں کا اہتمام بھی ہوتا ہے، مردوں کے لیے بڑی بڑی کھیلیں فٹ بال، باسکٹ بال۔ ساکر۔ بیس بال اور برف پر ہاکی ہیں۔ عورتوں کی بڑی بڑی کھیلیں یہ ہیں۔ ہاکی۔ باسکٹ بال اور نرم بیس بال ان جماعتی کھیلوں کے علاوہ تیراکی، ٹینس، کشتی

کہ بازی، گھوڑ سواری اور چاند ماری جیسی انفرادی کھیلوں کا بھی خوب چرچا ہے۔

مطالعہ کے تقریباً سبھی میدانوں میں علمی تنظیمیں موجود ہیں، ان کی غایت یہ ہے کہ بحث و مباحثہ کو ترقی دے کر مطالعہ پر اکسایا جائے۔ علمی معیاروں کو اونچا کیا جائے اور طلبہ اور اساتذہ کو ایک دوسرے سے قریب تر کیا جائے۔ اکثر کالجوں میں بین الاقوامی کلب۔ ریاضی کلب۔ علم النجوم کلب نفسیاتی کلب اور اسی قسم کے اور کلب ملیں گے۔ بعض تنظیموں میں داخلے کے لیے علمیت اور کردار کا ایک خاص معیار پہلی شرط ہے۔ ان کے علاوہ امتیازی انجمنوں کی رکنیت ہے، ان کی رکنیت انہی کو میسر آتی ہے جنہوں نے تعلیمی امتیاز حاصل کیا ہو۔

ان کے علاوہ کئی قسم کی اور سرگرمیاں ہیں جن کا تعلق براہ راست مطالعہ کے کسی خاص میدان کے ساتھ نہیں۔ مثلاً حکومت طلبہ۔ یہ تنظیم طلبہ اور منتظمین کے درمیان رابطہ قائم کرنے اور علمیت اور کردار کے معیار قائم کرنے اور برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہے، اس کے علاوہ طلبہ کی اپنی مطبوعات بھی ہوتی ہیں۔ کئی بڑی یونیورسٹیوں میں طلبہ کے اپنے روزنامے ہیں جنہیں وہ خود مرتب کرتے اور شائع کرتے ہیں۔ فوٹوگرافی کا کلب بھی ہر کالج میں موجود ہوتا ہے، پھر سیاسی تنظیمیں بھی ہیں جو قومی اور بین الاقوامی مسائل کو موضوع بحث بناتی ہیں۔ تعلیمی سال کے شروع میں ہر کلب ایک استقبالیہ تقریب کا اہتمام کرتا ہے جس کی بدولت نئے شامل ہونے والے طلبہ کو ہر طرح کی ضروری واقفیت حاصل ہو جاتی ہے، اس کے علاوہ اکثر کلب اور تنظیمیں آئے دن ناچوں، دعوتوں، سیروں اور دوسری مجلسی سرگرمیوں کا بندوبست کرتی رہتی ہیں۔

ان تنظیموں کے علاوہ کئی امریکی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کچھ عجیب و غریب قسم کی اور تنظیمیں بھی نظر آئیں گی جن کے نام لاطینی ابجد کے مختلف حروف پر مشتمل ہیں۔ یہ طلبہ کی رہائش گاہیں ہیں، جن کا بندوبست یونیورسٹی یا کالج کے ہاتھ میں نہیں بلکہ بعض قومی انجمنوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان ہوسٹلوں میں سے بعض مردوں کے لیے مخصوص ہیں اور بعض عورتوں کے لیے۔ مردوں کے ہوسٹل "بھائی چارے" کے نام سے موسوم ہیں اور عورتوں کے ہوسٹل "بہناپے" کے

ہم ہے۔ اول الذکر کی تعداد ۷۷ ہے اور مؤخرالذکر کی ۵۴۔ یہ عجیب و غریب تنظیمیں اٹھارویں
اور انیسویں صدی کی کلبوں کی یادگاریں ہیں۔ خانہ جنگی کے بعد ان بھائی چاروں اور بہناپوں نے
کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مستقل رہائش کے لیے عمارتیں خریدنا شروع کر دیں۔ ان ہوسٹلوں
میں صرف وہی طلبہ رہائش رکھ سکتے ہیں جن کے والدین ان تنظیموں کے رکن تھے، اس طرح
یہ تنظیمیں جن کی بنیاد نیم مذہبی ہے طلبہ میں ایک قسم کی طبقاتی تقسیم کا باعث بنتی ہیں، یہی وجہ
ہے کہ کئی امریکی ماہرین تعلیم ان کے وجود کے مخالف ہیں اور کئی کالجوں اور یونیورسٹیوں نے اپنے
ہاں ان کے قیام کی اجازت نہیں دی۔ لیکن اس کے باوجود یہ امر ناقابل انکار ہے کہ "بھائی چارے"
اور "بہناپے" اعلیٰ امریکی تعلیم کا ایک اہم اور مستقل جزو ہیں۔

سب کالجوں میں مذہبی تنظیمیں بھی موجود ہیں۔ جو کالج مذہبی اداروں کے قائم کردہ ہیں
ان کے طلبہ کے لیے گرجا میں جانا لازمی ہے، اس کے علاوہ تقریباً سبھی کالجوں میں ایک عام دستور
یہ ہے کہ بعض ضروری اعلانات یا اہم مباحث کے لیے تمام طلبہ کو ایک جگہ جمع کیا جاتا ہے۔

کالج کا تعلیمی سال ستمبر کے آخر یا اکتوبر کے آغاز میں شروع ہوجاتا ہے اور جون کے پہلے
حصے میں ختم ہوجاتا ہے، اکثر کالج اور یونیورسٹیاں گرمائی نصاب بھی جاری کرتے ہیں، اس کی میعاد
عموماً چھ ہفتے ہوتی ہے اور یہ جولائی میں شروع ہوکر اگست میں ختم ہوجاتا ہے، اکثر کالج تعلیمی
سال کو دو سمسٹروں میں بانٹ لیتے ہیں، لیکن ایسے کالج بھی ہیں جو اسے سہ ماہیوں میں تقسیم
کر لیتے ہیں۔ ملک بھر میں تعطیلات تقریباً ایک ساتھ ہوتی ہیں، کرسمس پر دو ہفتوں کی چھٹیاں ہوتی
ہیں اور کوئی ہفتہ بھر کی بہار کے موسم میں۔

جونیئر کالج:۔ بیسویں صدی میں جونیئر کالجوں کی تعداد میں بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے، یہ کالج
آرٹس کالج کی دو ابتدائی جماعتوں کا ہم پلہ ہے۔ کئی آرٹس کالجوں نے اپنی ابتدائی دو جماعتوں کو
ادنیٰ کالج کا نام دے رکھا ہے اور آخری دو جماعتوں کو اعلیٰ کالج کا، جونیئر کالج عام طور پر دو سالہ
نصاب پیش کرتے ہیں لیکن بعض ایسے ہیں جنہوں نے ثانوی مدرسے کی آخری دو جماعتوں کی

پڑھائی کا بندوبست بھی کر رکھا ہے، اس وقت یہ چار سالہ نصاب جس میں دو سال ثانوی تعلیم کے اور دو اعلیٰ تعلیم کے شامل ہیں۔ مطالعہ اور تحقیق کا موضوع بن رہا ہے۔

جونیئر کالجوں کی اکثریت پرائیویٹ انجمنوں کے ہاتھ میں ہے، کچھ ریاستوں کے جاری کردہ ہیں اور ایک خاصی تعداد مقامی تعلیمی اضلاع کے قائم کردہ ہیں، جونیئر کالجوں کی تعداد میں سب سے زیادہ اضافہ پچھلی دہائی میں ہوا ہے اور یہ امر امریکی تعلیم کا ایک نہایت معنی خیز پہلو ہے، ایک اچھا جونیئر کالج اپنی نواحی آبادی کی ضرورتیں پوری کرتا ہے، یہ طلبہ کو کالج کے لیے بھی تیار کرتا ہے، پیشہ ورانہ تعلیم بھی دیتا ہے اور بالغوں کی تعلیم کا بندوبست بھی کرتا ہے۔

جونیئر کالج ایسے ہزاروں نوجوانوں کو دو سالہ کالج کی تعلیم مہیا کرتا ہے جو بصورت دیگر اس کے بغیر رہتے، اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ان مقامی ضرورتوں کے عین بیچ میں واقع ہوتا ہے جس کو اسے پورا کرنا ہوتا ہے، اس اعتبار سے یہ پیشہ ورانہ تعلیم اور بالغوں کی تعلیم کے لیے خاص الخاص طور پر موزوں ہے، کئی جونیئر کالجوں نے مقامی آبادی کے لیے سیاسی، معاشی اور مجلسی مباحث کا اہتمام بھی کیا ہے، غرض جونیئر کالج نے امریکی تعلیم میں اپنے لیے ایک مستقل جگہ پیدا کر لی ہے، یہ آبادی کے ایک خاصے حصے کے لیے باشعور شہری احساس پیدا کرنے کا ذریعہ ثابت ہو رہا ہے۔

مغربی تعلیمی فکر کا پس منظر

محمد سلیم کیانی

مطالعۂ تاریخ سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ مختلف اقوام اپنے مخصوص قومی مزاج کی بدولت اپنی قومی ترقی و سربلندی کے جس رستہ کو اختیار کرتی آئی ہیں وہ عالم گیر و ہمہ گیر قوانین فطرت سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ اس مخصوص قوم کے مخصوص افکار و نظریات حیات سے بھی مطابقت رکھتا رہا ہے۔

ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان اختلافات کی بنیادیں کیا ہیں، اور کونسی چیز ایک گروہ انسانی کو دوسرے تمام گروہ ہائے انسانی سے ممیز کرتی ہے؟ ذرا غور سے دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ قوموں کو آپس میں ایک دوسرے سے مختلف بنانے والے ان کے مخصوص افکار و نظریات حیات ہوتے ہیں جو جغرافیائی اور تاریخی حالات سے مل جل کر ایک گروہ انسانی کو اس طرح تشکیل دیتے ہیں کہ وہ دوسری تمام قوموں سے بین امتیاز رکھتا ہے۔

ہر قوم اپنے کچھ مخصوص عقاید، افکار اور ضوابط حیات رکھتی ہے جن کی بقا پر اس کی بقا اور جن کے مٹنے پر اس قوم کا مٹنا منحصر ہوتا ہے۔ انہی مخصوص عقائد و افکار حیات سے ہر قوم کا ایک مخصوص کلچر وجود میں آتا ہے۔ جو اس قوم کی تمام اجتماعی اقدار کو اپنے اندر بدرجۂ کمال سموئے ہوتا ہے، پھر ہر کلچر ایک جاندار جسم کی طرح زندہ رہنے کے لیے سعی و جدوجہد اور دوسرے تمام تمدنوں سے کش مکش کرتا ہے اور اگر غالب اور زیادہ معقول اقدار حیات اپنے اندر رکھتا ہے تو دوسری ثقافتوں پر غالب آجاتا ہے، ورنہ خود ان کے ہاتھوں ختم ہو جاتا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ کسی ثقافت کی بقا ان مخصوص اقدار حیات پر منحصر ہے جن پر اس تہذیب کی عمارت اٹھتی ہے اگر وہ افکار و نظریات اور اقدار حیات زندہ ہیں تو تہذیب مٹ نہیں سکتی لیکن اگر وہ ختم ہو جائیں تو پھر

کوئی چیز تہذیب کو قائم و دائم نہیں رکھ سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ ہر وہ قوم جس کا اپنا کوئی فلسفۂ حیات اور کوئی تہذیب ہوتی ہے کوشش کرتی ہے کہ وہ ان افکار و نظریاتِ حیات کو مردہ ہونے سے بچائے جو اس کی قومی زندگی کی بنیاد ہیں اور کوئی ایسا لائحہ عمل اور طرزِ عمل اختیار کرے جس سے وہ اپنی آئندہ آنے والی نسلوں تک اپنے مخصوص افکار اقدارِ حیات — اور اس طرح اپنی قومی تہذیب منتقل کر سکے تاکہ وہ مٹے نہیں بلکہ صحیح طور پر نشوونما پا سکے۔ یہ طرزِ عمل اور لائحہ عمل جو ایک قوم اپنی مخصوص تہذیب اپنی آئندہ نسلوں تک پہونچانے کے لیے اختیار کرتی ہے اس قوم کا نظامِ تعلیم کہلاتا ہے۔ اسی وجہ سے دورِ حاضر کے ایک مفکر نے نظامِ تعلیم کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ "کسی قوم کا نظامِ تعلیم دراصل اس قوم کے بالغ افراد کی اس شعوری کوشش کا نام ہے جس کے ذریعے وہ اپنی آئندہ نسلوں کو اپنے مخصوص مقاصدِ زندگی کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔" ہربرٹ اسپنسر کے نزدیک تعلیم زندگی کی جدوجہد کے لیے مکمل تیاری کا نام ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تعلیم اور زندگی کو ایک دوسرے سے آپس میں جدا نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ اول الذکر زندگی ہی کی آئینہ دار ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کا نظامِ تعلیم اس کے مخصوص افکار و نظریاتِ حیات پر تعمیر ہوتا ہے، یہ حقیقت یورپ میں تعلیم کے ارتقا کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے اور بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

پندرھویں صدی عیسوی کی تحریکِ احیائے علوم سے پہلے یورپ کی کیا حالت تھی؟ اس سوال کے جواب میں ڈبلیو۔ این۔ ویچ۔ کی تاریخ عالم کا ایک اقتباس نقل کر دینا کافی ہوگا۔

> "دسویں صدی کے مہذب اور شائستہ بغداد اور اسپین کے شہریوں (مسلمانوں) سے اس وقت کے خونخوار اور ظالم جرمنوں اور فرانسیسیوں کا علم و شائستگی کے لحاظ سے کوئی مقابلہ ہی نہیں کیا جا سکتا ـــــــ بارہویں صدی عیسوی میں جب فرانس اور انگلستان میں جہالت کا دور دورہ تھا، مسلمانوں کے زیر اثر اسپین کے تمام باشندے زیادہ نہیں تو کم از کم لکھ پڑھ ضرور لیتے تھے۔"

کلیسا کے مہتمم نظام تعلیم و تربیت تھا۔ ظاہر ہے کہ اپنے ان غلط اور من گھڑت فلسفوں سے اہل کلیسا عیسائی عوام کو علم کے نور سے منور تو کیا کرتے، الٹا اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ مسلمان مفکرین مثلاً ابن رشد وغیرہ کے ناموں کی لمبی چوڑی فہرستیں بنا کر کے اہل کلیسا نے تمام عیسائی یورپ میں پھیلا دیں۔ تاکہ کوئی "مومن" ان کی ملحدانہ تصنیفات کا مطالعہ نہ کرنے پائے۔ اسی طرح یونانی فلسفہ کی کتابیں بھی زیر عتاب تھیں۔ ان طریقوں سے اہل کلیسا نے یورپی عوام کے فکر و نظر پر پہرے لگا کر انہیں بالکل بے بس بنا دیا اور یہ اسی کا رد عمل تھا جو سولہویں صدی عیسوی کی تحریک احیائے علوم کی صورت میں ظاہر ہوا۔

بجائے اس کے کہ تحریک احیائے علوم کی لائی ہوئی علمی ترقیوں کا استقبال کرتے۔ اہل کلیسا کو الٹا اس میں اپنی موت نظر آئی اور اسے اپنا نہ سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اب ہر نئی آواز کو دبانے پر تل گئے۔ خواہ وہ حقیقت ہی کیوں نہ ہو۔ گلیلیو اور برونو جیسے ماہرین طبیعات اور ریاضی سزائے موت کے مستحق قرار پائے۔ اول الذکر زمین کے گھومنے کا قائل تھا اور مؤخر الذکر اہل کلیسا کے من گھڑت فلسفے کے خلاف دنیا کے علاوہ دوسری آبادیوں کا بھی قائل تھا۔ ایک اندازے کے مطابق اہل کلیسا کی قائم کی ہوئی مذہبی عدالتوں سے کم از کم تیس ہزار آدمی زندہ آگ میں جلا دیے گئے اور ایک بہت بڑی تعداد کو ایذائیں دے دے کر ہلاک کر دیا گیا ـــــ پادریوں کی اس حماقت کا ردعمل خدا اور مذہب سے بغاوت کے پرزور داعیہ پر مبنی ایک خالص مادی فلسفۂ حیات کی صورت میں متشکل ہوا۔ پادریوں کی ضد میں آ کر جدید اہل علم طبقہ نے ہر شعبہ حیات سے خدا اور مذہب کو خارج کرنا شروع کر دیا۔ اور بعد میں جب تمام مادی وسائل کار بھی ان کے ہاتھ آ گئے تو انہوں نے اس مادی فلسفۂ حیات کو ایک ایک شعبۂ علم میں خون بنا کر دوڑا دیا، اس دور کے مشہور سائنس دان کیسلے نے لکھا ہے۔

"یہ پادری لوگ جس ہستی کو خدا کہتے ہیں مجھے تو اس کے وجود کی کوئی دلیل نہیں ملی"

ڈارون کی کتاب OVIGIN OFSPECIES نے جو ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی، الحاد کے علمبرداروں کے

ہاتھ میں ایک اور ہتھیار دے دیا اور ڈارون کا نظریہ ارتقاء" اور تنازع للبقا" مادیت کا سنگ بنیاد قرار پایا ہے، ان کی بدولت کائنات کو چلانے والی کسی ہستی کی سرے سے ضرورت ہی نہیں رہی کیوں کہ ملحدین کی نئی توجیہہ کے مطابق اب کائنات ایک بہت بڑی مشین تھی جو خود بخود حرکت کر کے ارتقا کی منازل طے کر رہی تھی، چنانچہ اسی مادی فلسفۂ حیات کو بنیاد بنا کر ہربرٹ اسپنسر نے چھتیس سال کی مسلسل محنت کے بعد سیاسیات، معاشیات، نفسیات اور دوسرے علوم عمران کو اسی ڈھنگ سے از سر نو مرتب کیا کہ ہر کوئی پڑھ کر خود بخود تہذیب الحاد کا مومن بن جائے۔

تحریک احیائے علوم کا اثر اپنی وسعت کے لحاظ سے یورپ گیر تھا اور اس کی بدولت آئی ہوئی آزادیٔ فکر نے ہر جگہ تعلیم کے میدان میں نئے نئے راستے سجھائے، اسی دور میں ۱۲ جنوری ۱۷۴۶ء کو سوئٹزرلینڈ کا مشہور و معروف ماہر تعلیم پیسٹالوزی، زیورچ کے مقام پر پیدا ہوا۔ پیسٹالوزی روسو کے خیالات سے متاثر تھا۔ ان خیالات پر پیسٹالوزی نے ایک نئے فلسفۂ تعلیم کی بنیاد رکھی جس نے وقت کے نظام تعلیم سے ایک بنیادی انقلاب پیدا کیا۔ اس نئے فلسفۂ تعلیم کا سب سے بڑا اور اہم اصول یہ تھا کہ :-

"علم حاصل کرنے کے لیے بچے کے حسی آلات و مشاہدات اس کی قوت حافظہ اور یادداشت کے مقابلے میں زیادہ قدرتی ذرائع ہیں"

پیسٹالوزی کا یہ بھی کہنا تھا کہ "حقیقی معلم فطرت ہے نہ کہ انسان"۔ چنانچہ اس کے بنائے ہوئے طریقۂ تعلیم میں تعلیم دینے کا عمل پہلے مشاہدے پر پھر شعور، پھر تحریر و تقریر اور اس کے بعد گنتی، ڈرائنگ لکھائی اور سب سے آخیر میں اعداد و شمار کے مراتب پر تقسیم تھا۔ ۱۸۰۴ء میں پیسٹالوزی کو یورڈون کے مقام پر اپنے ڈھنگ کا اسکول قائم کرنے کا موقع ملا، جہاں پر بارہ سال مزید تحقیق کر کے اس نے اپنے طریقۂ تعلیم کو زیادہ بہتر بنایا، یہیں سے اس کے خیالات کی اشاعت ہوئی جس سے بقیہ یورپ اور امریکہ کے طریقہ ہائے تعلیم بھی ایک بنیادی انقلاب سے روشناس ہوئے۔

اس کے بعد فروبل نے جو اصلاً ایک جرمن تھا۔ پیسٹالوزی کے اصولوں کو بنیاد بنا کر ایک نئے

طریق تعلیم کو ترویج دیا۔ جسے آج کل کنڈرگارٹن طریق تعلیم کہا جاتا ہے "کھیل کے ذریعے تعلیم" کے نظریے پر مبنی ہونے کی وجہ سے یہ طریقۂ تعلیم چھوٹے بچوں کی جسمانی اور ذہنی تربیت کے لیے بہت موثر ثابت ہوا اس وجہ سے اس طریقۂ تعلیم کو تھوڑے ہی عرصہ میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ آج کل دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ ممالک میں چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے یہی طریقۂ تعلیم رائج ہے۔

فروبل کے علاوہ اٹلی کی میڈیم میریا مونٹی سوری نے کم زور اور کند ذہن بچوں کے لیے اپنا مشہور "مونٹی سوری سسٹم" دنیا کے سامنے پیش کیا۔ مونٹی سوری نظامِ تعلیم و تربیت کامیاب ثابت ہونے کی وجہ سے اسے جلد ہی انگلستان اور دوسرے یورپین ممالک میں اپنالیا گیا۔

یورپ کے دوسرے ممالک میں سے ڈنمارک، سویڈن اور فرانس میں تعلیم کی حالت کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط میں تعلیم بالغان کے لیے ڈنمارک میں کئی ایک اسکول کھولے گئے۔ سویڈن میں ۱۸۵۰ء میں پرائمری تعلیم کا عام رواج ہوا۔ اور ۱۸۸۶ء میں فرانس میں پرائمری تعلیم لازمی قرار دی گئی۔ اس کے علاوہ پرشیا میں بھی ابتدائی لازمی تعلیم کا قانون نافذ تھا۔ مگر روس کی حالت یکسر مختلف تھی۔ الیگزینڈر اول نے چند ایک مدرسے قائم کیے تھے مگر بعد میں نکولس اول کی آمریت نے ان کی افادیت کا بھی خاتمہ کر دیا، چنانچہ اٹھارہویں صدی کے وسط میں بھی یہ علاقہ ازمنۂ وسطیٰ کی سی جہالت کا شکار تھا۔

انگلستان میں سترھویں صدی عیسوی تک نظامِ تعلیم و تربیت چرچ ہی کے تحت تھا۔ مگر اب طبقۂ متوسط نے سیاسی اقتدار حاصل کر لینے کے بعد کلیسا کے بنائے ہوئے اسکولوں سے ہٹ کر اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے پرائیویٹ اتالیق رکھنے شروع کر دیے، ان کے انہی بڑھتے ہوئے رجحانات نے ترقی کر کے بعد میں باقاعدہ پبلک اسکولوں کی صورت اختیار کر لی۔ جہاں متوسط طبقہ کے متمول والدین کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مگر غریب لوگوں کے بچے پہلے کی طرح قدیم درس گاہوں ہی میں پڑھنے کے لیے جاتے رہے۔ پبلک اسکولز کو جو ترقی اور ہر دل عزیزی نصیب ہوئی اس میں تھامس آرنلڈ جو رگبی ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا، کی کوششوں کو بھی خاص دخل حاصل ہے، مشہور شاعر اور انگریزی ادیب

تھا۔ میتھیو آرنلڈ، اسی تھامس آرنلڈ کا بیٹا تھا۔ تھامس آرنلڈ نے اپنی ان تھک محنت اور افکار و نظریات سے پبلک اسکولوں میں ایک نئی جان پیدا کر دی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ

"میں ایک ایسی نسل پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ جو دنیا کے موجودہ پیچیدہ اور مشکل مسائل (سیاسی اور معاشرتی) میں دنیا والوں کی صحیح رہنمائی کر سکے۔"

پھر اٹھارہویں صدی میں چوں کہ تمام اقتدار طبقہ متوسط کو حاصل تھا، اس لیے تھامس آرنلڈ کے نزدیک تعلیم کا مقصد طبقہ متوسط کی نسلوں کو اپنی عظیم الشان روایات کے مطابق دنیا کی رہنمائی کے لیے تیار کرنا تھا، چناں چہ یہی اس کی تمام جدوجہد کا مرکزی نقطہ تھا۔ اور انگریزی تعلیم کی بعد کی تاریخ گواہ ہے کہ اسے اپنے اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ مگر ان تمام کوششوں کے باوجود اٹھارہویں صدی میں بھی تعلیم ابھی معدودے چند خوش نصیب والدین کی اولاد تک ہی محدود تھی۔ عام لوگ پہلے ہی کی طرح تعلیم سے محروم تھے، چناں چہ انگلستان کے مشہور ماہر معاشیات آدم اسمتھ نے ملک میں لازمی ابتدائی تعلیم رائج کرنے کے لیے آواز بلند کی اور آخر کار ۱۸۸۰ء میں لازمی پرائمری تعلیم کا قانون پاس ہوا۔ ۱۹۱۸ء کے قانون تعلیم کی رو سے لازمی تعلیم سے فراغت پا کر اسکول چھوڑنے کی عمر چودہ سال تھی، جو اپریل ۱۹۴۷ء میں پہلے پندرہ اور بعد میں سولہ سال کر دی گئی۔

انگلستان سے ہجرت کر کے جانے والے امریکی نوآبادکاروں میں جمہوری اقدار حیات اور تعلیم کا خاص طور پر چرچا تھا، خصوصیت کے ساتھ نیو انگلینڈ اور نیویارک کی نوآبادیاں تو اس سلسلے میں بہت آگے تھیں۔ جب کوئی نیا گاؤں آباد ہوتا تو آبادی کے وسط میں کم سے کم ایک مربع میل جگہ گاؤں کے اسکول کے لیے خالی رکھی جاتی۔ یہ اسکول ان امریکی نوآبادکاروں کے لیے ناگزیر تھے کیوں کہ صرف انہی کے ذریعے سے وہ اپنی آئندہ نسلوں تک اپنے ان مخصوص جمہوری اور مذہبی افکار حیات منتقل کر سکتے تھے جن کے لیے انہوں نے ... بہت سی تکالیف برداشت کی تھیں، چناں چہ بعد میں فلاڈلفیا کی کانگریس نے "مسودۂ حقوق" کی جو تاریخی دستاویز مرتب کی تو اس میں دراصل انہی اقدار حیات کا بانا اور صاف صاف اظہار کیا گیا تھا جو نئی بننے والی ... امریکی قوم کی بنیاد تھی، چناں چہ یہی وجہ ہے

آج امریکی نظامِ تعلیم میں مسودۂ حقوق کے اصول اور انکا حریت خون بن کر دوڑتے نظر آتے ہیں۔
امریکہ کے برعکس یورپ میں تعلیم کے ارتقائی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت جو چیز کھٹکتی ہے وہ تعلیم کے پیچھے کسی صحیح مقصد کی کارفرمائی کا فقدان ہے۔ انیسویں صدی میں بھی کوئی صحیح مقصد متعین نہیں کیا گیا۔ بلکہ اکثر لوگ تو سرے سے اس کی ضرورت ہی کے قائل نہیں تھے، کیونکہ ان کے خیال میں تعلیم بذاتِ خود ایک مقصد تھی وہ کسی نظریہ حیات کو بنیاد بنا کر تعلیم دینے کے خلاف تھے۔ بلکہ چاہتے تھے کہ طالب علم کو معروضی مطالعہ کرایا جائے۔ تاکہ وہ آزادانہ طور پر حقائق و واقعات کا مطالعہ کر کے خود ہی نتائج اخذ کر سکے۔ مگر عالم واقعہ میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ دورِ حاضر کے ایک بہت بڑے مفکر کے الفاظ میں۔

"اس طرح کا معروضی مطالعہ فوٹو کے کیمرے کیا کرتے ہیں، انسان نہیں کر سکتے، انسان ان آنکھوں کے پیچھے ایک دماغ بھی رکھتا ہے جو بہرحال اپنا ایک نقطۂ نظر رکھتا ہے زندگی میں اپنا ایک مقصد رکھتا ہے مسائل کے متعلق سوچنے کا ایک طرز رکھتا ہے اور وہ جو کچھ بھی سنتا ہے یا جو کچھ بھی معلومات حاصل کرتا ہے اسے اپنی اس فکر کے سانچے میں ڈھالتا چلا جاتا ہے جو اس کے اندر بنیادی طور پر موجود ہوتی ہے، پھر اسی فکر کی بنیاد پر اس کا وہ نظامِ زندگی قائم ہوتا ہے جس کو ہم اس کا کلچر کہتے ہیں"

اقتباس بہت طویل ہو گیا ہے۔ مگر وضاحتِ مدعا کے لیے ناگزیر تھا۔ مندرجہ بالا اقتباس کے مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ غیر جانبدارانہ طریقۂ تعلیم نہ معقول طریق کار ہے اور نہ عملاً ایسا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بعد از خرابی بسیار یورپ بھی آخر اسی نتیجہ پر پہونچا ہے۔ ماضی قریب میں فسطائیت اور اشتراکیت کے علمبرداروں نے اپنے اپنے علاقوں میں نظامِ تعلیم کو جس طرح مقصدیت کا خادم بنایا اسے دیکھ کر جمہوری اقوام کی بھی آنکھیں کھلیں اور شاید پہلی بار برطانیہ میں مارووڈ رپورٹ میں اس امر کا باقاعدہ اظہار کیا گیا۔ کہ

"تعلیم ملکی اور جالیاتی مقاصد کی ابدی اور عالمگیر کارفرمائی ماننے پر مجبور رہے"

جمہوریت اور بنیادی تعلیم

(ڈاکٹر) سلامت اللہ

آج ہم یہ بہت معمولی بات سمجھتے ہیں کہ ہر بچے کے لیے ریاست کی طرف سے مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے۔ لیکن ایک زمانے میں اس کا تخیل بھی ممکن نہ تھا، ابھی کچھ بہت دن نہیں ہوئے جب کہ ہمارے ایک قومی رہنما اور محبت وطن کو مرکزی مجلس قانون ساز میں لازمی تعلیم کے بل کی حمایت کرتے ہوئے نہایت پُردرد لب ولہجہ میں کہنا پڑا تھا۔ "جناب والا میں جانتا ہوں کہ آج کا دن ختم ہونے تک میرا بل نامنظور ہو جائے گا۔ میں اس کی شکایت نہیں کرتا اور میں اس وجہ سے بددل بھی نہیں ہوں گا۔ ... میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے اور میں کہتا بھی رہا ہوں کہ ہم موجودہ نسل کے ہندوستانی صرف یہ امید کر سکتے ہیں کہ اپنے ملک کی خدمت اپنی ناکامیوں سے کریں وہ لوگ جن کو یہ سعادت حاصل ہوگی وہ اپنی کامیابیوں سے دیس کی سیوا کر سکیں۔ ہمارے بعد آئیں گے ....

مگر جناب والا! ہماری کوششوں کا جو بھی حشر ہونے والا ہو۔ ایک بات بالکل صاف ہے، ہمیں یہ محسوس کرنے کا حق ہے کہ ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے اور جہاں فرض کی پکار صاف ہو کوشش کر کے ناکام ہونا بہتر ہے بہ مقابلہ اس کے کہ بالکل ہاتھ پیر ہی نہ ہلائے جائیں۔"

گوپال کرشن گوکھلے نے ۱۹۱۲ء میں لازمی تعلیم کے لیے جو تجویز پیش کی تھی اس میں صرف ۶ سے ۱۰ سال تک کی عمر کے بچوں کے لیے تعلیم کا مطالبہ کیا گیا تھا اور وہ بھی نامنظور کر دیا گیا تھا۔ اس زمانے کی اور آج کی حالت میں کتنا بڑا فرق ہے، ہندوستان کے موجودہ دستور اساسی میں جو ۱۹۵۰ء سے ہمارے یہاں آئین کی حیثیت حاصل کر چکا ہے دفعہ ۴۵ میں درج ہے۔ "ریاست کوشش کرے گی کہ اس دستور کے شروع ہونے سے دس سال کے اندر چودہ سال تک کے تمام بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام ہو جائے۔"

تعلیم سے متعلق ریاست کے رویے میں جو یہ غیر معمولی تبدیلی نظر آتی ہے یہ کوئی اتفاقیہ امر نہیں ہے

یہ تقاضہ ہے اس نظام زندگی کا جو ہم اپنے دیس میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پچھلے سو سال میں ہندوستانیوں نے آزادی اور خوش حالی کے لیے جو جدو جہد کی ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ چیز بھی واضح ہوتی گئی ہے کہ ہماری سماجی زندگی کی تعمیر کس طرح پر ہوگی۔ اس سلسلے میں جمہوریت کو آدرش کے طور پر اپنایا گیا ہے اور جمہوریت کا قیام اس وقت تک ڈانواں ڈول رہے گا جب تک دیس کے سبھی بسنے والے تعلیم اور تہذیب کی دولت سے مالا مال نہ ہوں، چناں چہ سب کے لیے تعلیمی مواقع بہم پہونچانے کا مطالبہ جمہوریت کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

موجودہ دور میں تمام لوگوں کا تعلیم یافتہ ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اب طریق پیداوار کو اس وقت تک بخوبی استعمال نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ کام کرنے والے پڑھے لکھے نہ ہوں، غالباً ازمنۂ وسطیٰ میں شہنشاہ اکبر باشاری مان ان پڑھ ہونے کے باوجود بہت کامیابی سے اتنی بڑی سلطنت کا انتظام کر سکتا تھا لیکن آج جدید کارخانے کا معمولی مزدور یا سائنسی طریقے سے کھیتی باڑی کرنے والا کسان صرف اسی صورت میں اپنا کام ٹھیک طرح انجام دے سکتا ہے جب کہ اس میں کم سے کم اپنے کام سے متعلق ضروری ہدایات کو پڑھنے اور سمجھنے کی قابلیت ہو، یعنی اس دور میں پیداوار کا انحصار زیادہ سے زیادہ کام کرنے والوں کی تعلیم پر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ پیداوار کے استعمال اور کھپت کے لیے بھی آج ہر شخص کے لیے پڑھنا لکھنا ضروری ہوگیا ہے، تاکہ وہ اخبارات اور اشتہارات کو دیکھ کر اپنی ضروریات کی چیزیں خرید سکے، چناں چہ لازمی تعلیم کا نعرہ پہلی بار انسانی تاریخ کے اس دور میں سنائی دیتا ہے، جب کہ انقلاب فرانس کے بعد نظام سرمایہ داری کے ماتحت نئے طریق پیداوار کی داغ بیل پڑتی ہے۔ بہر کیف آج پیداوار کو بڑھانے کے لیے بھی لازمی تعلیم کی ضرورت ہے

اس طرح سے دیکھیے تو بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم جمہوری زندگی کی شاہ راہ پر ایک بہت بڑا قدم ہے جس کا پہلا اصول یہ ہے کہ ۷ سال سے ۱۴ سال کی عمر تک کے تمام لڑکے اور لڑکیوں کی مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام ریاست کو کرنا چاہیے، اس لیے کہ جمہوری نظام کا دارومدار باخبر اور مہذب شہریوں پر ہے جو اپنی زندگی کی تعمیر اور تنظیم کے لیے سوجھ بوجھ اور سگھڑپن کے ساتھ جانتی

ادارے قائم کر سکیں اور چلا سکیں جو اپنی انفرادی صلاحیتوں کو پورے طور پر جاگر کرنے کے ساتھ ساتھ جماعتی زندگی کے حسن کو نکھار سکیں جو اپنی جنت یکی کرنے کا راز جماعت کی نجات میں ڈھونڈ سکیں ایک ایسے سماج میں جہاں تعلیم کی سہولتیں صرف چند لوگوں کو میسر ہوں، سب کو نہ ہوں، جماعتی زندگی سکڑ کر رہ جاتی ہے، اس لیے کہ اس کی ترقی میں سب کی صلاحیتوں کے بروئے کار آنے کا موقع نہیں ہوتا اس طرح نہ صرف وہ لوگ جو تعلیم سے محروم رکھے جاتے ہیں گھاٹے میں رہتے ہیں بلکہ پورا سماج بھی مجموعی حیثیت سے نقصان اٹھاتا ہے۔ لہٰذا لازمی تعلیم جمہوریت کی پہلی شرط ہے اور اگر یہ ضروری ہے کہ ہر شخص تعلیم سے فائدہ اٹھائے تو یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیم مفت ہو تاکہ سبھی لوگ بغیر کسی مالی دشواری کے اسے حاصل کر سکیں، اس لحاظ سے بنیادی تعلیم صحیح معنوں میں جمہوریت کی آئینہ دار ہے۔

مفت اور لازمی تعلیم کا ایک اہم جمہوری پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے دیس میں گاؤں اور شہر کی تہذیبی زندگی میں جو ایک ناخوش گوار فرق پیدا ہو گیا ہے اسے مٹایا جائے۔ سرمایہ داری کے عروج کے ساتھ ساتھ گاؤں کی دولت سمٹ سمٹ کر شہروں میں آ گئی ہے۔ ٹیگور کے قول کے مطابق "گاؤں عورت کی مانند ہے" جس کے حسن اور توانائی کے سرچشمے شہر کے رنگ روپ کی آبیاری کرتے کرتے خشک ہو گئے ہیں اور اب گاؤں ایک بدصورت بڑھیا کی طرح بے کیف اور غیر دل کش ہو کر رہ گیا ہے گاؤں کی تہذیبی زندگی کو سنوارنے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں بھی کم از کم ابتدائی تعلیم کا اتنا ہی اچھا انتظام ہو جیسا کہ شہر میں ہے۔ بنیادی تعلیم کی اسکیم کا منشا یہی ہے کہ آٹھ سال کی لازمی تعلیم کا معیار گاؤں اور شہر دونوں جگہ کے مدرسوں میں یکساں ہونا چاہیے، اس طرح گاؤں کی تہذیبی سطح کو اونچا اٹھانے میں مدد ملے گی اور یہ بھی جمہوریت کی طرف ایک قدم ہو گا۔

تعلیمی اعتبار سے ہمارے دیس میں ایک اور چیز جمہوریت کے راستے میں بڑی رکاوٹ ہے وہ لوگ جن کو نیچ ذات یا اچھوت کہا جاتا ہے بڑی حد تک تعلیم سے محروم رکھے گئے ہیں، ان کے بچوں کو نام نہاد اونچی جماعت کے بچوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے پر اگر آئینی نہیں تو سماجی پابندیاں ضرور رہی ہیں۔ بنیادی تعلیم اس نا انصافی کو بھی مٹانا چاہتی ہے اور تمام بچوں کے لیے ذات پات کے

اتیا ننگ کے بغیر مدرسے کے دروازے کھولنے پر اصرار کرتی ہے۔

اسی طرح ہمارے سماج میں ہاتھ کے کام اور ذہنی کام میں جو فرق روا رکھا جاتا ہے وہ بھی جمہوریت کے حق میں مضر ثابت ہو رہا ہے۔ بعمولاً ہاتھ کے کام کو ذہنی کام سے گھٹیا سمجھا جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی چند سال پہلے تک تعلیم کے معنی صرف یہ تھے کہ آدمی صرف لکھنا پڑھنا سیکھ جائے اور اسے جسمانی محنت مشقت کا کوئی کام نہ کرنا پڑے، چناں چہ تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے والوں میں اکثریت ان بچوں کی ہوتی تھی جن کے گھروں میں جسمانی محنت کے کام کو بُری نظر سے دیکھا جاتا تھا اور جو یا تو اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو ذہنی کام کے ذریعے سے اپنی روزی کماتا ہے یا جو اپنی جائداد اور سرمائے کے بل بوتے پر خود بغیر کچھ کام کیے ہوئے فارغ البالی کی زندگی گذارتا ہے، ان حالات میں محنت کش طبقے کے بچے عام طور پر تعلیم کی نعمت سے محروم رہتے تھے لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ انھیں تعلیم حاصل کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع مہیا کیے جائیں اور یہ جبھی ممکن ہے جب تعلیم کو جمہوری زندگی کی ضرورتوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے، اس مقصد کو بنیادی تعلیم نے اس طرح پورا کرنے کی کوشش کی ہے کہ مدرسے میں ایسے عملی کاموں کو خاص جگہ دی ہے جن سے کوئی نہ کوئی سماجی ضرورت پوری ہو جاتی ہو۔

ہاتھ کے کام بابار آور کام کی بنیاد پر جمہوری نظام زندگی کی عمارت بنائی جا سکتی ہے اس لیے کہ یہی وہ ذریعہ ہے جو زندگی کی تمام مادی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ ایک ایسا سماج جس میں نکمے اور نکھٹو اور جونکوں کی طرح زندگی بتانے والے طبقے موجود ہوں صحیح معنوں میں جمہوری نہیں ہو سکتا جمہوریت محض ایک سیاسی تصوّر نہیں ہے کہ تمام لوگوں کو ملک کے سیاسی نظام میں مساوی حقوق حاصل ہوں۔ جمہوریت کا تصوّر پوری زندگی پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اقتصادی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو جمہوریت کا اصول یہ ہونا چاہیے کہ جو بوئے گا وہ کاٹے گا، جو کام نہ کرے گا وہ کھائے گا بھی نہیں جمہوریت کے اس مفہوم کے پیش نظر ہمیں بچوں کے دلوں میں شروع ہی سے بار آور کام کی عزت پیدا کرنی ہو گی اور یہ محض وعظ و تلقین یا کتابی تعلیم کے ذریعے سے ممکن نہیں ہے اس کے لیے

ضروری ہوگا کہ ان کی تعلیم میں کام کو اہمیت دی جائے اور انہیں اس کی سماجی قدروقیمت کا احساس عملی طور پر دلایا جائے، اس طرح ہاتھ کے کام کی طرف بچوں میں جو رجحان پیدا ہوگا وہ ذہنی اور جسمانی کام کے مصنوعی اور غلط امتیاز کو ختم کرنے میں مدد دے گا۔ بنیادی تعلیم میں جو ہنر یا دستکاری پر جو زور دیا گیا ہے اس سے جمہوریت کے اس بنیادی اصول کی پیروی ہوتی ہے۔

جمہوریت کا قومی تہذیب و تمدن سے گہرا تعلق ہے۔ کسی ملک میں جمہوری نظام کی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ وہاں کی تہذیب و تمدن کو فروغ دیا جائے۔ تہذیب و تمدن کا سب سے اہم آلۂ کار زبان ہے۔ لہٰذا وہ تعلیم جو جمہوریت کے مقاصد کو پورا کر سکتی ہے لازمی طور پر مادری زبان کے ذریعے سے دی جانی چاہیے۔ چنانچہ بنیادی تعلیم میں اسے ایک اصولی حیثیت دی گئی ہے کہ بچے کی تعلیم کا ذریعہ اس کی مادری زبان ہونا چاہیے۔

بنیادی نصاب تعلیم کی ترتیب اور تدریس میں یہ چیز ہمیشہ سامنے رکھنی چاہیے کہ اس کے ذریعے بچوں میں آٹھ سال کے اندر وہ تمام بنیادی قابلیتیں، مہارتیں اور رجحانات پیدا ہو جائیں جو ایک جمہوری سماج کے قائم کرنے اور مضبوط بنانے کے لیے ضروری ہیں، ان میں سب سے زیادہ اہم مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت اور شہری ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی قابلیت ہے۔ دوسرے مدرسوں کے مقابلے میں بنیادی مدرسے میں اس کے زیادہ امکانات ہیں اس لیے کہ یہاں تعلیم کا مرکز ہاتھ کا کام اور دوسرے سماجی مشغلے

غرض بنیادی تعلیم ایک جمہوری نظام زندگی کی داغ بیل ڈالنے اور اسے پروان چڑھانے میں مدد دے سکتی ہے، لیکن اس وقت بنیادی تعلیم کے سامنے ایک خطرہ ہے جس سے تمام جمہوریت پسندوں کو آگاہ ہونا چاہیے۔ مختلف صوبوں میں بعض بظاہر معصوم اسکیمیں پیش کی جا رہی ہیں جو تعلیم کی جمہوری شکل و صورت کو بگاڑ دیں گی۔ یہ تجویز کیا جا رہا ہے کہ لازمی تعلیم کی ۷ سے ۱۴ سال کی مدت میں مختلف قسم کے مدرسوں میں تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے، جو سرپرست اپنے بچوں کی تعلیم پر خرچ کر سکتے ہیں انہیں اس بات کی اجازت ہوگی کہ وہ اپنے بچوں کو بنیادی مدرسے کی بجائے کسی مڈل اسکول، ہائی اسکول یا پبلک اسکول میں داخل کرا سکتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ غریبوں کے

بچے جو خود خرچ کر کے نہیں پڑھ سکتے وہ بنیادی مدرسے میں تعلیم حاصل کریں گے۔ جہاں ہاتھ کے کام کے ذریعے سے تعلیم ہوگی اور امیروں کے بچے حسب دستور دوسرے اسکولوں میں نظری اور کتابی تعلیم حاصل کرتے رہیں گے، اس سے ایک طرف تو یہ نقصان ہوگا کہ ذہنی اور جسمانی کام کا فرق قائم رہے گا اور ہاتھ کے کام کو ذلیل اور گھٹیا سمجھا جاتا رہے گا جو جمہوریت کے حق میں مضر ہے اور دوسری طرف بنیادی مدرسے کو موزوں اور کافی سازوسامان اور قابل استادوں سے لیس کرنے سے غفلت برتی جائے گی اور وہاں تعلیم کا معیار نیچا رہے گا، اس لیے کہ موجودہ سماج میں جو صاحب اقتدار طبقے ہیں اور جن کی آواز میں زور ہے وہ اپنے بچوں کو دوسری قسم کے اسکولوں میں تعلیم دلوائے گا۔

اس خطرے کے پیش نظر یہ بہت ضروری ہے کہ اس بات پر اصرار کیا جائے کہ لازمی تعلیم کی مدت کے دوران میں سب بچوں کے لیے ایک ہی مشترکہ مدرسہ ہوگا، یعنی بنیادی مدرسہ۔ اس کے علاوہ اس مدتِ تعلیمی کے لیے کسی اور قسم کے مدرسے کا وجود ممکن نہ ہوگا تاکہ ریاست اپنے ان تمام تعلیمی وسائل کو بنیادی تعلیم کی ترقی کے لیے استعمال کر سکے جو صنعت اور لازمی تعلیم کے لیے وہ مہیا کر سکتی ہے۔ بنیادی تعلیم جمہوریت کو صرف اسی صورت میں تقویت پہنچا سکتی ہے۔

(ماخوذ از ماہنامہ "آج کل" دہلی)

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

جہالت کی دھند

برطانوی ثانوی مدرسہ ابتدائی درجہ کے بعد چھے سال تک تعلیم دیتا ہے اس لیے برطانوی ہائی اسکول کی آخری جماعت چھٹی جماعت کہلاتی ہے، اس جماعت کی تعلیمی روایات برطانوی تعلیم کا ایک مایہ ناز کارنامہ ہے۔ لیکن جدید ٹکنالوجی کی برق رفتار ترقی نے برطانیہ کو بھی مجبور کیا ہے کہ ثانوی درجہ پر سب طلبہ کے لیے علمی مضامین پر زور نہ دے بلکہ فنی پیشہ کے خواہش مند طلبہ کو ٹیکنیکل تعلیم مہیا کرے، چنانچہ اب ثانوی ٹیکنیکل مدرسے بھی کھولے گئے ہیں جو علمی مضامین کی بجائے مخصوص ٹیکنیکل مضامین پر زور دیتے ہیں۔

حال ہی میں برطانوی ٹیکنیکل ہائی اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اس سوال کا جواب پوچھا گیا کہ چھٹی جماعت کے طلبہ کی امتیازی خوبی کیا ہونی چاہیے؟ ایک صدر معلم نے کہا کہ اس جماعت کے تعلیمی کام کا خاصہ یہ ہے کہ زیادہ اعلیٰ سطح پر نظری مطالعہ کیا جاتا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ تمکنت اور ذمہ داری اس جماعت کے طلبہ کے امتیازی نشان ہیں۔ تیسرے نے کہا کہ اس جماعت کے طلبہ کو مدرسہ کی خدمات کا زیادہ موقع دیا جاتا ہے۔

اس بحث پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار "ٹائمز" نے لکھا ہے کہ بے شک چھٹی جماعت کا نصاب یہ تمام اوصاف پیدا کرتا ہے۔ لیکن ان اوصاف کو سب کچھ سمجھ لینا ایسا ہی ہے جیسے کسی کتاب کی فہرست مندرجات کو ساری کتاب سمجھ لیا جائے۔ جس طرح کتاب کی خوبی کا اندازہ اس کے اندرونی صفحات سے کیا جا سکتا ہے، اسی طرح چھٹی جماعت کا اندازہ اس کی اندرونی زندگی سے کیا جانا چاہیے۔ یہاں ہر اس شخص کا اپنا حافظہ رہنمائی کر سکتا ہے جس نے ایک برطانوی مدرسے میں ثانوی تعلیم پائی ہو اس مدرسے کی اعلیٰ ترین جماعتوں میں پہنچتے ہی لازمی مضامین کا بوجھ گھٹ جاتا ہے اور طالب

ـ دم آزاد حیثیت مل جاتی ہے۔ آزادی کے ساتھ وسعت نگاہ شروع ہو جاتی ہے لیکن دست ملا کر فیوالے
اکے مضامین نہیں ہٹنے بلکہ ہم جماعتیوں کے ساتھ غیر نصابی موضوعات پر بحث مباحثے ہونے ہیں
تناد کے وہ مباحث ہونے ہیں جو وہ اصل موضوع سے ہٹ کر شروع کر دیتا ہے اور کتب خانوں کی
تابوں کا مطالعہ ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آغاز بلوغت میں ذہن روزمرہ کی چیزوں سے آگے بڑھ کر
چھپی ہوئی حقیقتوں کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔ اگر نوجوان ذہن کو یہ مواقع نہ ملیں تو تجسس کا
یہ مادہ دم گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ اسے اس بات کا علم نہیں ہونے پاتا کہ جو خیالات اس کے دل میں
چٹکیاں لے رہے ہیں، لیکن جن کے موزوں اظہار کے لیے وہ الفاظ نہیں پاتا ان کے متعلق ...
ابتدائے آفرینش سے عالم کیا کہتے آئے ہیں۔ غرض وسیع مطالعہ جو موزوں رہنمائی کے تحت کیا جائے ایک بڑی نعمت ہے۔

برطانوی ٹیکنیکل مدرسے کے متعلق یہ شکایت عام ہے کہ یہاں انگریزی زبان کا معیار اونچا نہیں
کیوں کہ یہ مضمون معمولی توجہ حاصل کرتا ہے اور زیادہ زور فنی مضامین پر دیا جاتا ہے، اس صورت حال
کا نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ علمی مضامین کی بجائے فنی مہارت ہی کو سب کچھ سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر کوئی بیرونی
شخص ٹیکنیکل ڈرائنگ کی جماعت میں داخل ہو تو وہ طلبہ کو کام میں اس قدر کھویا ہوا پائے گا کہ
کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ اس جماعت میں جائے جہاں
ذاتی مطالعہ ہو رہا ہے تو حیرت میں مشتاق نگاہیں اس کی طرف اٹھ جائیں گی اور طلبہ اس کی
آمد کو غنیمت جانیں گے۔ ٹیکنیکل مدرسے کی مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ عوام پیشہ ورانہ تعلیم کی اہمیت کو
بہت محسوس کرنے لگے ہیں، لیکن چھٹی جماعت کے طلبہ کے لیے یہ چیز ناپسندیدہ ہونی چاہیے
کہ وہ ساری توجہ خالص یا عملی سائنس ہی پر دیں۔ ایسے کرنے کا خطرہ یہ ہے کہ طلبہ جہالت کی
دھند میں لپٹ کر ایک تنگ نگاہ پیدا کر لیں گے اور انہیں یہ کبھی معلوم نہ ہونے پائے گا کہ
وہ کس قدر بے خبر واقع ہوئے ہیں۔

ذہنی بُعد

سائنس اور ٹکنالوجی کی بے تحاشا پیش قدمی نے ان مضامین کو ایسی پیچیدہ شکل دے دی ہے

کو سائنس دانوں اور غیر سائنس دانوں کے درمیان ذہنی بُعد نے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے، ماہرین تعلیم کو صورت حال پر تشویش کا اظہار کر رہے ہیں، اس کی وجہ یہ کہ بعد اس بلند سطح پر رونما ہوا ہے جہاں قومی زندگی کے اہم فیصلے کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک اعلیٰ سول افسر کے سامنے دو متبادل منصوبے موجود ہیں جن کی بدولت جوہری طاقت پُرامن مقاصد کے لیے استعمال ہو گی تو وہ خود یہ فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ ہی اس کا عملہ اس بارے میں رہنمائی کر سکتا ہے، سائنس دانوں کے متعلق یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ سیاسی امور میں قوت فیصلہ سے عاری ہوتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اب سیاست دان سائنس سے عاری ہیں۔

اس مشکل کا حل کیا ہے؟ سیاست دان اسکولوں اور کالجوں میں آرٹس کی تعلیم لے کر آتے ہیں۔ ان میں سے جس نے مدرسے میں تھوڑی بہت سائنس پڑھی بھی ہوتی ہے وہ بھی جلد بھول جاتی ہے اگر کچھ رہ بھی جائے تو یہ معمولی واقفیت جوہری توانائی کے اسرار سمجھنے میں کچھ مدد نہیں دے سکتی، اس مشکل کا حل ایک برطانوی ماہر تعلیم نے یہ پیش کیا ہے کہ آکسفورڈ اور دوسری یونی ورسٹیوں کے آرٹس کے نصاب میں سائنس کا ایک مضمون بھی شامل ہو۔ یونی ورسٹیوں میں ایک ایسا شعبہ قائم کرنے سے جو فلسفہ اور سائنس دونوں کی تعلیم دے۔ سائنس اور آرٹس کے بُعد کو پاٹا جا سکتا ہے، اس سے نہ صرف انتظامی حاکموں کو سہولت ہو جائے گی بلکہ فلسفیوں کو سائنس کی قدر و قیمت کا پتہ بھی چل جائے گا۔

اطالیہ میں تعلیمی اصلاحات

اطالیہ کی وزارت تعلیم نے ابتدائی تعلیم کی موجودہ حالت کا جائزہ لینے کے لیے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی ہے، یہ کمیٹی جیسے پس ماندہ اطالوی صوبوں کی حالت دیکھے گی، اس تحقیقات کے بعد تجرباتی اصلاحات نافذ کی جائیں گی جو بعد ازاں تمام اطالیہ میں رائج ہوں گی۔ چھے مجوزہ صوبوں میں سے ہر ایک میں اس تعلیمی تجربے کے لیے عام تعلیمی بجٹ کے علاوہ تیس کروڑ لائر (اطالوی سکہ) کی رقم مزید فراہم کی گئی ہے، یہ رقم ۵۸-۱۹۵۷ء تک صرف کی جانے گی۔

تحقیقاتی مطالعہ پچھلے جون کے مہینے تک پورا ہونا تھا۔ اس کی چھ بڑی بڑی مدیں ہیں۔

(۱) گھر گھر سے اطلاعات جمع کر کے مدرسوں کی حاضری کا پتہ کرنا۔

(۲) ایسے مدرسوں میں جہاں چوتھی اور پانچویں جماعت موجود نہیں وہاں یہ جماعتیں کھولنا۔

(۳) استادوں کی از سر نو تعلیم۔

(۴) مدرسوں میں صحت اور مجلسی اصلاح کے مرکزوں کا قیام۔

(۵) ایسے علاقوں میں مدرسے قائم کرنا جہاں عام رفتار ترقی کے مطابق مستقبل قریب میں مدرسے قائم ہونے کی امید نہیں۔

(۶) مدرسوں کی موجودہ عمارتوں کی مرمت۔ صفائی اور آرائش۔

اس اصلاحی مہم کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ والدین کا زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کیا جائے۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ مدرسوں میں زیادہ جاذبیت پیدا کی جائے گی، اس طور پر ناخواندگی کے خلاف جہاد کرنا مقصود ہے۔ پسماندہ صوبوں میں ناخواندگی خاص طور پر زیادہ ہے۔ ۱۵ صوبوں میں ایک کنبے کی اوسط آمدنی اتنی کم ہے کہ کھیتی باڑی کے کام میں بچوں سے مدد لیے بغیر گذارہ مشکل ہے۔ بچے عموماً بکریوں یا مویشیوں کو چراتے ہیں، خالص معاشی وجوہ کی بنا پر ماں باپ کے لیے ایسے بچوں کو مدرسے میں بھیجنا بڑا مشکل ہے۔

مدرسہ بند کر دیا گیا

ارجنٹائن کی وزارت تعلیم نے ایک سان ونسٹ اسکول کو عارضی طور پر بند کر دیا۔ وہ اس لیے کہ اس مدرسہ نے حکومت ارجنٹائن کے حالیہ قانون طلاق کی خلاف ورزی کی تھی۔ حکومت کا نیا قانون طلاق دادہ اشخاص کو دوسری شادی کا اختیار دیتا ہے۔ لیکن متذکرہ صدر مدرسے کی صدر معلمہ نے چار بچوں کو اس لیے مدرسہ سے نکال دیا تھا کہ ان کی ماؤں نے طلاق حاصل کر کے غیر ملکوں میں شادی کی تھی۔

بھگوڑے بچے کی عزت افزائی

ایک چودہ سالہ برطانوی لڑکا ہاورڈ جونز، جو ہمبرو کا رہنے والا ہے مدرسے سے بھاگ گیا

اور پورے تین مہینے فرانس کی خاک چھانتا رہا۔ آخر پولیس کی مدد سے تشکیل کے بعد حاکم بہبود نے اسے اس کے گھر واپس بھیجا مصر کے وزیر اعظم کرنل جمال عبدالناصر نے اس لڑکے کو مصر آنے کی دعوت دی ہے، یہ عزت افزائی اس لیے کی گئی کہ وزیر اعظم مصر کو یہ بتایا گیا تھا کہ یہ لڑکا آثار قدیمہ کا دیوانہ ہے اور اسی کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔

طلبہ کا جذبہ ایثار

ناروے کے تقریباً چار ہزار یونیورسٹی طلبہ نے پناہ گیروں کی امداد کے لیے اپنی گرمیوں کی تعطیلات کو وقف کر دیا ہے۔ انہوں نے مصیبت زدہ پناہ گیروں کی دست گیری کے لیے ایک فنڈ قائم کیا ہے چھٹیوں کے تین مہینوں میں طلبہ ہر قسم کی محنت مزدوری کریں گے اور ساری اجرت اس فنڈ کی نذر کریں گے۔ انہوں نے اعلان کیا ہے کہ ہم بچوں کی دیکھ بھال سے لے کر سڑکیں صاف کرنے تک ہر کام کرنے کے لیے تیار ہیں دو سال ہوئے جب ہالینڈ میں تباہی خیز طغیانی آئی تو ناروے کے طلبہ نے اسی طرح محنت مزدوری کر کے سیلاب زدہ لوگوں کے لیے چودہ سو پونڈ (تقریباً اٹھارہ ہزار روپے) جمع کیے تھے۔

ذہنی آزمائشیں

پچھلے مارچ میں آکسفورڈ کے مقام پر برطانوی استادوں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ اس میں برٹش جرنل آف ایجوکیشنل سائیکالوجی کے ایڈیٹر پروفیسر سی۔ ڈبلیو ولنسٹائن نے تقریر کی انہوں نے تقریر میں کہا اس وقت گیارہ سال عمر کے بچوں کی جو ذہنی آزمائش ہوتی ہے اس کی بنا پر صرف سوالوں کا ایک ہی مجموعہ ہے۔ میری رائے میں آزمائش کے لیے سوالوں کے تین مجموعے ہونے چاہئیں۔

اب تک سوالوں کے ایک ہی مجموعے پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کیا گیا ہے، جب ایک طالب علم کی ذہانت کا اندازہ دو قسم کے سوالوں کے مجموعوں سے کیا گیا تو اس کے ذہنی خارج قسمت میں ۲۰ نشانات کا فرق نکلا۔ ایک تجربے میں ۶۷۰ بچوں کی ذہنی آزمائش کی گئی، انہیں دو مختلف قسم کے سوالوں کے مجموعے دیے گئے۔ دوسری آزمائش میں ۲۲۰ کا ذہنی خارج قسمت بڑھ گیا اور ۱۶۱ بچوں کا گھٹ گیا۔

پروفیسر ولنسٹائن نے کہا کہ بعض لوگ ذہنی آزمائشوں کے متعلق بدگمانی رکھتے ہیں۔ ان کے خیال

یقین کرنا مشکل ہے کہ قدرت نے بعض بچوں کو زیادہ ذہانت دے کر بھیجا ہے اور بعض کو کم، یہ درست ہے کہ تجربوں سے اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بچوں کو تیاری کرانے سے ان کے ذہنی خارج قسمت میں فی یادس نشانات تک اضافہ ہو سکتا ہے لیکن اس ضمن میں یہ بات بھلا دی جاتی ہے کہ تیاری کا سب سے زیادہ اثر دو گھنٹے تک رہتا ہے، یہ بھی درست ہے کہ کئی حالتوں میں گھریلو حالات ذہنی خارج قسمت پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن اس ضمن میں یہ حقیقت نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ غلیظ گھروں کے بہت سے بچے ذہنی خارج قسمت میں اچھے گھرانوں کے بچوں سے بہتر ثابت ہوئے ہیں، اپنی تمام خامیوں کے باوجود ذہنی آزمائشیں بچوں کی ذہانت کی خبر اسی درستی کے ساتھ دیتی ہیں جس طرح عملی امتحان۔

اب ہم ایک ایسی منزل پر پہونچ چکے ہیں کہ گیارہ سالہ بچوں کے امتحان میں مزید اصلاح ممکن نہیں۔ آزمائشیں خواہ کتنی ہی مکمل کیوں نہ بنا دی جائیں پھر بھی کئی ایسے بچے نظر آئیں گے جن کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہوگا، مجھے یاد ہے کہ ایک سال برمنگھم میں جب امتحان لیا گیا تو ۷۵ بچے بالکل کنارے پر پاس ہوئے جبکہ ۷۲ بچے ایسے بھی تھے جو ایک فی صد نشانات کی کمی کی وجہ سے فیل ہوں، آپ کو بہت سے ایسے لوگ نظر آئیں گے جن کے ذریعہ قرعہ سے فیصلہ کرنا یا امتحان سے فیصلہ بالکل ایک سا نظر آئے گا۔

لوکل گورنمنٹ اور تعلیم

مسٹر نارمن فشر نے اپنی ایک تازہ تقریر میں اس تجویز پر اظہار خیال کیا جو بعض برطانوی حلقوں کی طرف سے پیش کی گئی ہے، تجویز یہ ہے کہ لوکل باڈیز سے تعلیم کا کام لے لیا جائے، برطانیہ میں لوکل باڈیز کے کندھوں پر تعلیم کی ساری ذمہ داری ہے اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو ٹھیک طور پر پورا نہیں کر رہیں، مسٹر فشر نے کہا تعلیم اس وقت مقامی حکومت خود اختیاری کی سب سے بڑی اور سب سے اہم ذمہ داری ہے، اس سے یہ ذمہ داری چھین لینا اسے ایک مہلک ضرب لگانے کے مترادف ہوگا

بطور ایک ماہر تعلیم کے مسٹر فشر نے تعلیم اور حکومت خود اختیاری کے باہمی روابط پر بحث کی اور ان سوالوں کے متعلق رائے ظاہر کی جو آج کل مقامی حکومت خود اختیاری کی نازک حالت کے متعلق

عموماً اٹھائے جانے ہیں۔ مسٹر فشر نے اپنی بحث کا آغاز ۱۹۴۴ء کے قانون تعلیم سے کیا، انہوں نے کہا اس قانون کی پہلی شق وزیر تعلیم کو مختلف تعلیمی محکموں پر قابو عطا کرتی ہے، یہ قومی نظام تعلیم کی طرف پہلا قدم ہے۔ اس قانون نے مقامی اور مرکزی حکام تعلیم کے درمیان توازن اقتدار قائم کر دیا اور پچھلے پچیس برس سے جو صورت حال چلی آ رہی تھی اس میں تبدیلی پیدا کر دی۔ لوکل باڈیز کے اختیار میں جو کمی واقع ہوئی تھی مالی مشکلات نے اس کا قدم تیز تر کر دیا۔ مرکزی حکومت کے مقابلہ میں مقامی ٹیکس کی غیر تغیر پذیری نے لوکل باڈیز کو مجبور کیا کہ وہ حکومت سے سہارا مانگیں، مالی امداد کا مطلب یہ تھا کہ باڈیز کے اخراجات اور طریق کار پر نگرانی بڑھ جائے اس سے ان کی آزادی پہلے سے گھٹ گئی۔

محنت کش اور مالک کے مراسم دن بدن اجتماعی لین دین کی شکل اختیار کر رہے ہیں اس رجحان نے لوکل باڈیز کے اختیارات کو اور محدود کیا۔ مسٹر فشر نے کہا یہ بات قابل افسوس ہے کہ لوکل باڈیز کو اپنے ملازموں کی تنخواہوں اور حالات کار پر اتنا تھوڑا اختیار باقی رہ گیا ہے اب یہ اصلاحات ایسے طور پر طے ہونے لگے ہیں جو لوکل باڈیز کے نقطہ نگاہ سے حقیقت پسندی سے بہت دور ہے۔ مسٹر فشر نے کہا کسی یونی ورسٹی کے شعبہ عمرانیات کو چاہیے کہ اس سوال کا مطالعہ کرے اور اعداد و شمار کی روشنی میں دیکھے کہ جو لوگ لوکل باڈیز کی ملازمت اختیار کرتے ہیں ان کی تعداد میں پچھلے پچاس سالوں میں کیا فرق پڑا ہے۔ اب برطانوی نظام تعلیم ایسے لوگ زیادہ تعداد میں تیار کر رہا ہے جو لوکل باڈیز کی ملازمت کے قابل ہوں۔ اس کے برعکس ایسے لوگ تعداد میں کم رہ گئے ہیں جو اتنی فرصت یا استطاعت رکھتے ہوں کہ لوکل باڈیز کی جزوی خدمت کے لیے وقت نکال سکیں۔

اسی سمت میں ایک اور موثر بھی کام کر رہا ہے۔ جدید حالات زندگی یہ ہیں کہ زیادہ لوگ کام ایک جگہ کرتے ہیں اور رہائش دوسری جگہ رکھتے ہیں۔ اس طرح مقامی وفاداری کا جذبہ پرورش نہیں پاتا۔ اور لوگ مقامی معاملات میں اتنی دلچسپی پیدا نہیں کر سکتے کہ ان کی خاطر وقت اور توجہ صرف کریں اس سے مقامی زندگی میں رہنماؤں کی بہت کمی پیدا ہو گئی ہے، ایسے لوگوں کا ملنا مشکل ہوتا جا رہا ہے جو ضروری ذہنی اور ذاتی اوصاف بھی رکھتے ہوں اور مقامی رہنمائی کا کام سنبھالنے کو بھی تیار ہوں

۸ شماره ۹]　　لاہور　　[دسم

اس شمارہ میں

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

دسمبر ۱۹۵۵ء

جلد ــــــــــ ۸
شمارہ ــــــــــ ۹

سالانہ چندہ
پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی نہال۔ پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

وحدت مغربی پاکستان

ایم۔ اے مختاروی

وحدت مغربی پاکستان کا قیام ہماری قومی تاریخ میں ایک سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے مغربی پاکستان کے سابقہ پانچ صوبوں کو سیاسی اور انتظامی امور کے لحاظ سے ایک وحدت کی تشکیل دے دی گئی ہے۔ دستوریہ کے اس فیصلے کو بجا طور پر قیام پاکستان کے بعد قومی استحکام کی طرف اہم ترین قدم قرار دیا گیا ہے۔

قائد اعظم علیہ الرحمۃ قومی اتحاد پر جس قدر زور دیتے تھے اس کا حال سب کو معلوم ہے زیارت کی بلندی سے قوم کو خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا "ہم سب پاکستانی ہیں۔ نہ ہم بلوچ ہیں نہ پٹھان نہ سندھی نہ بنگالی اور نہ پنجابی۔ ہم سب کو یہ خیال اور محسوس کرنا چاہیے کہ ہم پاکستانی ہیں۔ ہم سب کو اپنے پاکستانی ہونے پر جائز فخر ہونا چاہیے"۔ وحدت مغربی پاکستان کا قیام فی الحقیقت بانی پاکستان کے اسی خطاب کی صدائے بازگشت ہے۔

بطور معلین ہمیں اس معاملہ کے انتظامی پہلوؤں سے براہ راست کچھ سروکار نہیں، ہماری پہلی دلچسپی یہ ہونی چاہیے کہ نئی پود کی تعلیم و تربیت کے لیے نئے امکانات کیا ہیں؟ ہمارے سامنے فوری سوال یہ ہے کہ بچوں کو جمہوری طرز زندگی سکھانے کے لیے نئے مواقع سے کیوں کر فائدہ اٹھایا جائے، ان کی ہمدردیوں اور نقطۂ نگاہ میں کس طرح وہ وسعت پیدا کی جائے کہ قومی اتحاد اور ملکی استحکام کے لیے ایک بے پناہ جذبہ پیدا ہو جائے۔

استادوں کی حیثیت سے ہم میں سے ہر ایک کا یہ فرض ہے کہ پہلے اپنے اندر وہ وسعت قلب و نگاہ پیدا کرے جو وحدت مغربی پاکستان کا نصب العین ہے ، استاد کی بلند تر اور وسیع تر دلی ہمدردیاں تعلیمی طور پر طلبہ کے لیے نمونہ کا کام دیں گی ، آج ہماری سب سے بڑی قومی ضرورت تنگ دلیوں اور محدود نقطہ ہائے نگاہ کا خاتمہ ہے ۔ آج پاکستان کی فوری ضرورت یہ ہے کہ ہر شہری کے دل میں اپنے وطن کی سالمیت اور آبرو کے لیے ایسا قومی جذبہ موجود ہو جو اس کی دوسری تمام ہمدردیوں پر غالب آ سکے ، نئی پود کو یہ سبق سکھانے سے پہلے ہر استاد کو پہلے خود یہ سبق اچھی طرح سیکھنا چاہیے ۔

ہمیں یقین ہے کہ تمام پاکستانی استاد نہ صرف دل سے بچوں کی بھلائی چاہنے والے ہیں بلکہ وہ عزیز وطن کی خدمت کے لیے سپاہیانہ جذبے کے ساتھ کام کرنا بھی جانتے ہیں ، پاکستان اس وقت ان سے جو خدمت چاہتا ہے اس کی طرف وحدت مغربی پاکستان کا وجود واضح طور پر رہنمائی کر رہا ہے ۔ امید واثق ہے کہ ہمارے اساتذہ اس اہم قومی تقاضے کو اچھی طرح سمجھیں گے اور اپنے شاگردوں کو ایسا نقطہ نگاہ عطا کریں گے جو اس تقاضے کو کامیابی سے پورا کر سکے ۔

مُطالعہ زیرِ نگرانی

فضل احمد — سلسلہ ۲

مطالعہ کی رہنمائی کے لیے عام تکنیکیں

مطالعہ زیرِ نگرانی کی کامیابی کے لیے استاد کو یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اسے ہر وقت چوکس رہنا چاہیے اور ہر مجوزہ تکنیک کے نتائج پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ ہر مطالعہ کے آغاز سے پہلے استاد کو بعض ضروری شرائط کے متعلق تسلی کر لینی چاہیے جن کے بغیر مطالعہ کا کام ممکن ہی نہیں۔

(۱) پہلی شرط یہ ہے کہ مطالعہ کی عمارت اٹھانے کے لیے استعداد کی ایک ٹھوس بنیاد ہونی چاہیے اگر طالب علم ذہنی طور پر کمزور ہے مطالعہ میں قدم قدم پر رکاوٹیں آئیں گی، ایسی صورت میں کسی اعلیٰ کامیابی کی امید نہیں ہو سکتی۔ لیکن تحقیقی مطالعہ نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ذہنی استعداد کے معاملہ میں قدرت نے اتنی عدم مساوات نہیں برتی جتنا عام خیال ہے۔ بیسیوں ایسی مثالیں ابتدائی اور ثانوی مدرسوں اور کالجوں میں دیکھی گئی ہیں جہاں بعض طلبہ کو ناقابلِ علاج خیال کیا گیا لیکن جب انہیں نفسیاتی معالج کے حوالے کیا گیا تو پتہ چلا کہ پڑھائی میں کمزوری کی وجہ ذہانت کی کمی نہیں بلکہ بعض ایسے لسانی، جذباتی اور نفسیاتی اسباب ہیں جو قابلِ علاج ہیں۔ انہیں اصلاحی تربیت ملی اور جب یہ واپس اسکولوں کالجوں میں پہونچے تو اوسط یا اوسط سے بالاتر ثابت ہوئے۔ ان تجربوں نے جدید تعلیمی فکر کو یہ سبق سکھایا ہے کہ خاموش مطالعہ کی استعداد کا فقدان بیشتر حالتوں میں قابلِ علاج اسباب کی پیداوار ہوا کرتا ہے، استاد کو چاہیے کہ ان اسباب کے متعلق موزوں نفسیاتی نگاہ پیدا کرے تاکہ فردِ مند طلبہ کی آسانی سے دست گیری ہو سکے۔

(۲) حالیہ سالوں میں ذہنی خارج قسمت کی غیر متبدل نوعیت کا یقین بھی بہت کچھ کم ہو گیا ہے کئی تجربوں نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ماحول کے مؤثرات ذہنی خارج قسمت پر بہین اثر ڈالتے ہیں، اس تجرباتی شہادت

نے اس بات کی ضرورت اور بڑھا دی ہے کہ کسی طالب علم کو مطالعہ سے مستفید ہونے کے ناقابل قرار دینے سے پہلے اس کی ذہنی رکاوٹیں معلوم کرنے اور انہیں دور کرنے کی پوری کوشش ہونی چاہیے ان ساری باتوں کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ خداداد استعداد اور اصلی کامیابی کے درمیان براہ راست تعلق موجود ہے۔

(۷) ہر انسانی عمل کو جاری رکھنے کے لیے قوت محرکہ کی ضرورت ہے، یہ قوت محرکہ اس عمل کا مقصد ہے لوگوں کی نگاہ میں یہ مقصد مضحکہ خیز یا گھٹیا ہوا کرے۔ اگر کام کرنے والے کو خود اس مقصد کی قدر و قیمت کا یقین ہے تو کوئی شے اس کے ارادے یا اس کی کوششوں میں کمی پیدا نہ ہونے دے گی کسی مقصد کی قدر و قیمت کا پیمانہ کیا ہے؟ یہ وہ طمانیت ہے، خواہ یہ فوری ہو یا دیر سے ملنے والی، جو کام کرنے والا اس کام سے حاصل کرتا یا حاصل کرنے کی امید رکھتا ہے، رات دن گلی محلوں میں چھوٹے بچوں کو بے تحاشہ دوڑتے دیکھا جا سکتا ہے۔ کچھ چوروں کا کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں اور باقی ان کو پکڑنے والوں کا۔ اگر ماں باپ انہیں کسی ضروری کام کے لیے جانے کو کہتے تو وہ اتنا تیز کبھی نہ دوڑتے لیکن اب وہ ایسی دھن میں مگن ہیں کہ اپنی عمر اور طاقت سے بڑھ کر جسمانی تکان مول لے رہے ہیں بعض ٹھوکر کھا کر گر جاتے ہیں کسی کے چوٹ آ جاتی ہے، کسی کا کپڑا پھٹ جاتا ہے۔ لیکن یہ رکاوٹیں انکی دھن کو سرد نہیں کر پاتیں۔ آخر وہ کونسا جابر حاکم ہے جو انہیں یوں سرپٹ رفتار پر ہانکے جا رہا ہے؟ یہ حاکم ان کے طفلانہ مقاصد کے سوا اور کوئی نہیں۔

مطالعہ زیر نگرانی کو تسلسل اور صحت مند ترو تازگی عطا کرنے کے لیے لازمی ہے کہ طلبہ مطالعہ کا مقصد اچھی طرح سمجھ اور دیکھ لیں۔ مطالعہ گہرے انہماک کا مطالبہ کرتا ہے، اور انہماک عبارت ہے دقیق فکر سے، جب تک مقصد کا طاقت ور شہسوار طبیعت کے گھوڑے کو ایڑی نہ لگائے اس وقت تک انہماک اور گہری سوچ کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ ایک عالم نے انہماک پیدا کرنے کے لیے کچھ گُر بیان کیے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

(۱) طلبہ پر اچھی طرح واضح کر دیجیے کہ مطالعہ کے دوران میں تمام ایسے مؤثرات کو ختم کر دیں

جو توجہ میں خلل ڈالنے والے ہوں خود استاد پر بھی لازم ہے کہ کمرۂ جماعت سے ایسے تمام مؤثرات کا خاتمہ کردے

(ii) طلبہ کو مقصد کی اہمیت کے بوجھ تلے دب کر کام کرنے کی تربیت دی جانی چاہیے۔

(iii) طلبہ پر یہ نکتہ اچھی طرح کھل جانا چاہیے کہ سرگرم جرات عمل کے ساتھ مطالعہ شروع کرنا بہت سی رکاوٹوں کو از خود دور کر دیتا ہے۔

(iv) طلبہ کو یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ مطالعہ کی کامیابی کے لیے جسمانی چستی بھی لازمی ہے، انہیں یہ چیز حاصل کرنے کا ڈھنگ سکھانا چاہیے۔

(v) طلبہ کو یہ سکھانا چاہیے کہ کتاب کے جو حصے پیش نظر مقصد کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتے ہوں ان پر مستعدی کے ساتھ نگاہ پڑنی چاہیے۔

(۳) مطالعہ میں اچھی مہارت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ طالب علم کو اس کا درست ڈھنگ ابتدائی جماعتوں ہی سے سکھایا جائے۔ جونہی بچہ عبارت کو روانی سے پڑھنے کے قابل ہو جائے، اسے خاموش مطالعہ کی ابتدائی تربیت ملنی چاہیے۔ ثانوی مدرسے اور کالج میں یہ تربیت بدستور جاری رہنی چاہیے۔ اگر درست طریقہ ہائے مطالعہ کی تربیت اس طرح نہیں دی جاتی تو اغلب یہ ہے کہ ابتدا میں بچہ مطالعہ کی غلط عادتیں اخذ کرے گا اور بعد میں اس کے لیے بہت مشکل ہو گا کہ انہیں بھلا کر ان کی جگہ درست عادتیں سیکھے۔

پہلے یہ عام خیال تھا کہ جس شخص میں طبعی استعداد موجود ہے اور وہ کسی مضبوط مقصد کے تحت کام بھی شروع کر دیتا ہے تو وہ بالآخر آزمائش وسہو کے راستہ پر چلتا ہوا مطالعہ میں مہارت پیدا کر لے گا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔ لیکن اگر یہ شخص آزمائش وسہو کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے دوسروں کے تجربوں سے فائدہ اٹھاتا تو نسبتاً تھوڑے وقت اور تھوڑی محنت سے بہتر نتائج حاصل کر لیتا۔ جدید تعلیمی فکر اسی بنا پر اس بات کا سختی سے مطالبہ کرتا ہے کہ طلبہ کو پہلے ہی دن سے مطالعہ کی درست عادتیں سکھائی جائیں۔

(۴) چوتھی ضروری شرط لگاتار مشق ہے اس کے بغیر کوئی عادت پختہ نہیں ہو سکتی محض مطالعہ کی

درست عادتوں کا علم کسی شخص کو مطالعہ میں ماہر نہیں بنا سکتا جس طرح کوئی شخص تیراکی کے اصول پڑھ کر تیراک نہیں بن سکتا بلکہ اس کے لیے ساتھ ہی مشق کی ضرورت ہے، اسی طرح مطالعہ کے سائنسی اصولوں پر لگاتار عمل کیے بغیر کوئی طالب علم اچھا قاری نہیں بن سکتا۔ اس ضمن میں ایک اور احتیاط بھی لازم ہے، وہ یہ کہ اگر متعدد اصولوں کو بیک وقت جزوی طور پر سمجھ لیا جائے اور ان میں سے کسی کے متعلق واضح فہم پیدا کیے بغیر ان تمام کی ایک ساتھ مشق کی جائے تو یہ ایک دوسرے کے فالج ثابت ہوں گے اور نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔ اس لیے چاہیے یہ کہ ہر اصول کو خوب ذہن نشین کر کے اس کی اس طرح مشق کی جائے کہ یہ غیر شعوری عادت کا درجہ حاصل کرلے۔

قراءت کی غیر ضروری مہارتیں

پہلے یہ عام خیال تھا کہ جو شخص علمی کام میں تاک نہیں وہ لازمی طور پر کم ذہانت کا مالک ہے جدید تعلیمی اور نفسیاتی تحقیق نے یہ نظریہ غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ جو طلبہ اسکولوں کالجوں میں اعلیٰ درجہ پاتے ہیں اور چوٹی کے طالب علم ثابت ہوتے ہیں وہ نہایت کامیاب قاری ہوتے ہیں پڑھنے کی غیر معمولی مہارت انہیں علمی کام میں فوق العادۃ کامیابی عطا کرنے کا موجب بنتی ہے۔

پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ قراءت ایک سادہ ذہنی عمل ہے، لیکن اب یہ خوش فہمی ختم ہو چکی ہے قراءت ایک بہت پیچیدہ عمل ہے جو کئی اجزا سے مرکب ہے۔ تجربوں نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ مطالعہ میں زیادہ سے زیادہ رفتار پیدا کرنے کے لیے خاموش مطالعہ کی عادت پیدا کرنی چاہیے۔ بلند آواز سے پڑھنا رفتار پیدا کرنے میں زیادہ کام نہیں دیتا، جو لوگ خاموش مطالعہ کافی تیز رفتار سے کرتے ہیں ان کی مہارت کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سطر پڑھتے وقت نگاہ کو صرف تین چار مقامات پر گاڑتے ہیں یوں وہ ہر نگاہ میں وہ الفاظ کی ایک پر معنی وحدت کا احاطہ کر لیتے ہیں اس طرح چند ایک جستوں میں نگاہ سطر کو ختم کر کے فوراً نیچے نئی سطر پر آجاتی ہے، اس کے برعکس جو طلبہ آہستہ پڑھتے ہیں یا اپنے پڑھے ہوئے کا مطلب اخذ نہیں کر سکتے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ

ان کی نگاہ ایک بار میں صرف دو ایک الفاظ کا احاطہ کرتی ہے، جملے کے اس طرح بے معنی ٹکڑوں میں ٹوٹ جانے سے مطلب پلے نہیں پڑتا۔ سیاق و سباق میں ربط پیدا کرنے کے لیے انہیں نگاہ کو بار بار پیچھے آگے لے جانا پڑتا ہے، اس طرح رفتار بھی مدھم پڑ جاتی ہے اور مطلب بھی اچھی طرح صاف نہیں ہوتا۔

اچھا قاری بننے کے لیے ضروری ہے کہ نگاہ کو ہر بار الفاظ کے ایک معنی خیز مجموعہ کا احاطہ کرنا سکھایا جائے۔ بعض طلبہ خود بخود ایسا کرنے لگیں گے۔ لیکن بہت سے اس کے الٹ کریں گے ان کی نگاہ لفظ لفظ یا الفاظ کے ٹکڑوں پر اٹک کر رہ جائے گی، وہ بار بار نگاہ کو پیچھے لوٹانے کی ضرورت محسوس کریں گے، استاد جن طلبہ کو ایسا کرتے دیکھے اسے چاہیے کہ فوراً اس چیز کا تدارک کرے۔ بدقسمتی سے انہیں صرف زبانی بتا دینا کفایت نہیں کرے گا۔ استاد کی بات سمجھ لینے کے باوجود وہ غلط طریق کی طرف عود کریں گے۔ بہت سے امریکی مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں قرارت کو درست کرنے والے ماہرین نفسیات موجود ہیں۔ لیکن جہاں یہ خصوصی مدد موجود نہ ہو وہاں بھی استاد کافی مدد دے سکتا ہے، اس کے لیے اسے چاہیے کہ طلبہ کو خاموش مطالعہ کا عادی بنائے، انہیں ایک نگاہ میں زیادہ الفاظ احاطہ کرنے کا ڈھنگ سکھائے اور نگاہ کو تیزی سے حرکت کرنے کی تربیت دے۔

ایک نگاہ میں زیادہ الفاظ کو احاطہ کرنے کی استعداد اور قوت فہم کے درمیان واضح رابطہ ثابت ہو چکا ہے۔ اسی طرح فہم اور قوت حافظہ کے درمیان رابطہ موجود ہے، یہی وجہ ہے کہ ماہرین نفسیات ماہر مطالعہ کی رفتار بڑھانے کے لیے ایک نگاہ زیادہ الفاظ کو سمیٹنے کی صلاحیت کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ اس مطلب کے لیے نگاہ کی تیز حرکت اتنی کارآمد نہیں جتنی کسی طالب علم میں یہ صلاحیت بڑھے گی کہ الفاظ کے ایک بڑے گروہ کو حافظہ میں سموئے اسی قدر وہ اس بات پر زیادہ قادر ہوگا کہ سارے جملے کا مطلب سمجھ لے۔

تاہم مطالعہ کی رفتار ہی سب کچھ نہیں۔ رفتار کا انحصار استعداد کے علاوہ کتاب کی نوعیت

اس کے مندرجات سے طالب علم کی واقفیت اور مطالعہ کے مقصد پر بھی ہے۔ کہانیاں اور دوسری ہلکی پھلکی کتابیں زیادہ جلدی پڑھی جائیں گی لیکن درسی کتابیں جو مطالب سے زیادہ بھرپور ہوں گی آہستہ آہستہ پڑھی جائیں گی۔

پُرفہم مطالعہ کی تکنیکیں

نیچے کچھ عام تکنیکیں درج کی جاتی ہیں جن کا مدنظر رکھنا استاد کو اس قابل بنا سکتا ہے کہ اپنے طلبہ میں درست عادات مطالعہ کا شعور پیدا کر دے۔

(۱) رسکن کا قول ہے کہ سمجھ کر پڑھا ہوا ایک صفحہ دس ہزار بے سمجھے پڑھے ہوئے صفحوں سے بہتر ہے۔ مطالعہ سے مطالب اخذ کرنے کے لیے الفاظ کا ذخیرہ وسیع ہونا چاہیے، یہ غرض حاصل کرنے کے لیے طالب علم کو لغات کے استعمال سے واقف کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ طالب علم ہر اس لفظ کے لیے لغات کھولے جو اس کے لیے نیا ہو بہت سے الفاظ اور محاورات ایسے ہوں گے جن کے مطالب سیاق و سباق سے صاف ہو جائیں گے۔ ایسے الفاظ اور محاورات کے لیے لغات کے ورق الٹنا مطالعہ میں خواہ مخواہ بدمزگی پیدا کرنا ہے۔ طالب علم میں اس استعداد کی بھی ترقی ہونی چاہیے کہ عبارت کی مناسبت سے نئے الفاظ اور محاورات کا عام مفہوم اخذ کر لے۔

(۲) بیکن کا قول ہے کہ بعض کتابیں محض چکھنے کے لیے ہوتی ہیں بعض نگلے جانے کے لیے اور بعض آہستہ آہستہ چبانے کے لیے۔ طلبہ میں یہ نگاہ پیدا ہو جانی چاہیے کہ ہر کتاب کے نفس مضمون اور اس کے مطالعہ کے مقصد کے مطابق اس کو توجہ دیں۔ اگر وہ ایک افسانہ پڑھتے ہیں جو تفریح طبع کے لیے پڑھا جا رہا ہے تو اس میں سے تیزی سے گذر جانا چاہیے۔ اس کے برعکس اگر یہ تاریخ جغرافیہ یا سائنس کی کتاب ہے تو اس کی ہر سطر کو غور سے دیکھنا چاہیے تاکہ اسباب اور نتائج کا رشتہ خوب واضح ہو جائے۔

بڑی جماعتوں کے طلبہ کے لیے ہر مضمون پر ایک درسی کتاب کے علاوہ کئی اور کتابوں کے

مطالعہ کی ضرورت ہونی چاہیے۔ طالب علم کو چاہیے کہ ان پر تیزی سے ایک نظر ڈالے۔ جو مباحث نئے ہیں ان پر نشان کرتا جائے اور ساری کتاب میں سے گذر جانے کے بعد ان مقامات کو اچھی طرح دیکھ لے۔ وسیع مطالعہ کے لیے اس مہارت کا اخذ کرنا بھی ایسا ہی ضروری ہے جیسا گہرے مطالعہ کی استعداد کا پیدا کرنا۔

(۳) طلبہ کو اس امر سے آگاہ کرنا چاہیے کہ ہر مصنف ایک خاص نقطۂ نگاہ سے لکھتا ہے۔ یہ نقطۂ نگاہ اس کی ساری کتاب کو ایک مخصوص رنگ دیتا ہے۔ کتاب پڑھنے سے پہلے یہ نقطۂ نگاہ معلوم کر لینا بڑا فائدہ مند رہتا ہے۔ اس غرض کے لیے کتاب کا دیباچہ پڑھ لینا اور فہرست مندرجات پر اچھی طرح نگاہ ڈال لینا خاصی رہنمائی کر سکتا ہے۔ مصنف سے زیادہ اچھی طرح واقف ہونے کے لیے کتاب پر ایک سرسری نگاہ ڈال لینی چاہیے، ہر مصنف اپنی مخصوص طرز تحریر اور مخصوص ذخیرۂ الفاظ رکھتا ہے۔ بعض مصنف ایسے ہیں جو ہر پیراگراف کا خلاصہ اس کے آخری فقرے میں بیان کر دیتے ہیں۔ بعض مطلب کی بات پیراگراف کے درمیان میں کہہ جاتے ہیں اور بعض پیراگراف کا آغاز اس سے کرتے ہیں۔ کچھ صفحے دیکھ کر ہر مصنف کی عادت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اس طرح بڑی تیزی سے اس کی کتاب چکھی جا سکتی ہے۔ ہوشیار لڑکوں کو یہ کام خاطر خواہ کرنے کی تربیت دینی چاہیے۔ لیکن چھوٹی جماعتوں میں استاد کو خود چاہیے کہ طلبہ کو مصنف کے عام نقطۂ نگاہ سے پہلے آگاہ کر دے۔

(۴) ایک کارآمد تکنیک یہ بھی ہے کہ ہر باب کے متعلق معنی خیز سوالات کی بوچھاڑ ہو۔ کتاب کا نام، مختلف ابواب کے عنوان طرح طرح کے تنقیدی سوالوں کو پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا سہل کام ہے کہ طلبہ اس میں جلد مہارت پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ تربیت اخذ مطالب میں بہت فائدہ مند ثابت ہوئی ہے، اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے ہر باب کے متعلق گہرا فہم پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ہر طالب علم کو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ ایک خاص باب کو کن سوالوں کے جواب دینے چاہئیں۔ مطالعہ کرتے وقت اس کی نگاہ ان بنیادی مباحث ہی کو ڈھونڈے گی اور غیر ضروری باتوں کو نظر انداز کر دے گی جو مواد غیر متعلق

سمجھ کر چھوڑ گیا ہے، وہ بھی بالواسطہ طور پر فکر انگیز ثابت ہوگا، ممکن ہے کہ اس کے بعض حصے موضوع کے کسی ایسے پہلو پر روشنی ڈالتے ہوں جس پر سوالات وضع کرتے وقت نگاہ نہ پڑی تھی۔ مطالعہ ختم ہونے کے بعد سوالوں کی فہرست پر پھر سے نظر ڈالی جائے گی اور دیکھا جائے گا کہ ان سب کے جواب کہاں تک مل سکے ہیں اور مسئلہ کے کون سے نئے پہلو معلوم ہوئے ہیں۔

(۵) مطالعہ کے نتائج کو واضح اور پُرمعنی شکل دینے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے خاتمہ پر پڑھنے والا اپنے جی میں تمام مطالب کو یکجا کرے، ایسا کیے بغیر سوالات وضع کرنا اور ان کے جواب تلاش کرنا زیادہ کارگر ثابت نہ ہوگا۔

اس طریق کار کی تاثیر جانچنے کے لیے ایک امریکی کالج کے ایک سو اکتالیس طلبہ کی جماعت پر تجربہ کیا گیا۔ انہیں کتاب کا ایک حصہ پڑھنے کو دیا گیا۔ پھر کہا گیا کہ ہر طالب علم اس حصہ پر ایسے سوالات وضع کرکے لکھے جن کے جوابات میں مطالعہ کے بڑے بڑے مطالب آجائیں۔ اب ان سے پوچھا گیا کہ انہوں نے کس ذہنی طریق سے کام کیا۔ ایک بہت بڑی اکثریت نے کہا کہ انہوں نے پہلے مطالعہ کے سارے مطالب کو ذہن میں دہرایا۔ اس کے بعد سوال وضع کیے۔

(۶) ہر کتاب بعض معلومات، تصورات یا خیالات پیش کرے گی لیکن ہر اچھی کتاب اپنے مندرجات کے ذریعہ قاری کے دل میں نئے خیالات، تصورات اور جذبات کو بھی جگائے گی۔ اعلیٰ ادب کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اکثر مقامات پر محض اشاروں سے کام لیا جاتا ہے۔ ان اشاروں کی شرح فراہم کرنا پڑھنے والے کا اپنا کام ہے۔ قاری کا یہ ردِعمل اس کو ذہنی لذت بخشتا ہے۔ طلبہ کو اس بات کی تربیت ملنی چاہیے کہ جو کچھ پڑھیں اس کے مفہوم کو خود پھیلائیں، یہ دیکھیں کہ یہ واقعات اور حقائق ان کی انفرادی زندگی، قومی زندگی اور عالمی زندگی کے لیے کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے نتائج و عواقب کیا ہو سکتے ہیں، غرض کتاب جو کچھ بیان کرتی ہے پڑھنے والا اسے اپنے مخصوص ذہنی پس منظر میں رکھ کر دیکھے، اس ضمن میں استاد کو خود نمونہ پیش کرنا چاہیے، جو کتاب طلبہ پڑھ رہے ہیں اسے وہ خود بھی پڑھے، مطالعہ کے خاتمہ پر طلبہ کے تاثرات معلوم کرے اور اپنے تاثرات

بیان کرے، اس چیز کی ضرورت شروع شروع میں پیش آئے گی۔ بعد ازاں طلبہ خود نتائج لینا سیکھ جائیں گے۔

(۷) مطالعہ کرتے وقت بعض اوقات طلبہ کے لیے اہم اشارے لکھتے جانا ضروری ہو جاتا ہے اس چیز کی ضرورت بالعموم سہ گانہ ہوتی ہے، بعض دفعہ استاد کے تقریری سبق کے ضروری نکات لکھتے جانا ضروری ہو جاتا ہے بعض اوقات جب طالب علم کو کوئی رپورٹ جماعت کے سامنے پیش کرنا ہو تو یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ وہ مطالعہ کے اہم نتائج مختصر اشاروں کی شکل میں لکھ لائے تاکہ رپورٹ پیش کرنے وقت حافظہ کو مدد ملے۔ وحدتی طریق تدریس میں جہاں مطالعہ کی ایک جامع وحدت پیش نگاہ ہوتی ہے اور بہت سے ماخذوں سے معلومات جمع کرکے انہیں ایک مربوط نقطۂ نگاہ کی شکل میں مرتب کرنا ہوتا ہے۔ وہاں یہ امر بالکل ناگزیر ہو جاتا ہے کہ طالب علم اپنی تحقیق کے نتائج کو اختصار کے ساتھ لکھتا جائے۔

یہ اشارے کئی فائدے رکھتے ہیں، ان کی بدولت اہم نکات خوب ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور ان کا دوبارہ ذہن میں حاضر کرنا آسان ہو جاتا ہے، اہم حقائق کو مختصر مگر جامع الفاظ کا جامہ پہنا دینا حافظہ کے کام کو سہل بنا دیتا ہے بعض اوقات طلبہ اشارے تیار کرنے سے گھبراتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت یہ وقت اور محنت کی بچت کا ایک آزمودہ طریقہ ہے، پڑھتے وقت اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتا بہت آسان ہے کہ یہ بات آسانی سے ذہن میں محفوظ رہے گی۔ اس چینی ضرب المثل میں بہت بڑی سچائی ہے کہ پھیکی سے پھیکی سیاہی بھی تیز سے تیز حافظہ کی نسبت زیادہ قابل اعتماد ہے کچھ دن یا ہفتے گذرنے پر جب ذہن پر زور ڈالا جاتا ہے تو اکثر صورتوں میں مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ مطالعہ کے وقت اہم نکات کو لکھ لیا جائے۔

مفید اشارے تیار کرنا ایک فن ہے جو مناسب رہنمائی اور تربیت سے حاصل ہوتا ہے۔ استاد کو چاہیے کہ مطالعہ کے اوقات میں اشارے تیار کرنے کا ڈھنگ طلبہ کو بتائے اور تیار کردہ اشاروں کو کبھی کبھی دیکھتا بھی رہے۔

(۸) کتب خانے کی کتابوں سے مناسب فائدہ اٹھانے کے لیے بھی تربیت کی ضرورت ہے بعض امریکی مدرسے اس موضوع پر ایک باقاعدہ نصاب پیش کرتے ہیں لیکن جہاں یہ نصاب نہ ہو وہاں بھی استاد خود طلبہ کو بعض بنیادی امور سے آگاہ کر سکتا ہے۔

ہر کتاب کو پڑھنے سے پہلے اس کی متوقع افادیت کا خوب جائزہ لے لینا چاہیے۔ اگر طالب علم ایک ایسی کتاب کے مطالعہ پر وقت اور محنت صرف کرتا ہے جس کے مندرجات اب قابل سند نہیں تو یقیناً وہ وقت اور محنت ضائع کرتا ہے، تھوڑی سی تربیت سے ہر طالب علم اس قابل ہو سکتا ہے کہ کسی کتاب کی افادیت کا اچھا خاصہ اندازہ کرے۔ اس ضمن میں سب سے پہلی بات جس پر توجہ جانی چاہیے اس کتاب کا نیا یا پرانا ہونا ہے؟ پچھلے بیس پچیس سالوں میں تاریخ جغرافیہ معاشیات۔ سائنس۔ نفسیات اور بعض دوسرے مضامین میں عام نقطہ نگاہ میں اتنی بڑی تبدیلی آچکی ہے کہ پرانی کتابیں قریباً قریباً بے کار ہو چکی ہیں، صرف کسی کتاب پر تازہ سن کا درج ہونا اس کے نئے ہونے کی دلیل نہیں مثلاً اگر ایک کتاب ۱۹۵۱ء میں لکھی گئی تھی اور ۱۹۵۴ء میں وہ بغیر ترمیم کے دوبارہ چھپی ہے تو وہ لامحالہ پرانی ہی رہے گی۔ پچھلی آدھی صدی میں جو کچھ رونما ہوا ہے اس کا کچھ اثر اس کے صفحات میں نظر نہیں آئے گا۔

کتاب کے متعلق پتہ دینے والی دوسری چیز اس کا دیباچہ ہے، اس سے عموماً لکھنے والے کے مقاصد اور اس کے نقطہ نگاہ کا حال معلوم ہو جائے گا۔ تیسری قابل توجہ چیز کتاب کے مندرجات کی فہرست ہے۔ اس سے ایک نگاہ میں پتہ چل جاتا ہے کہ لکھنے والا موضوع زیر بحث میں کن کن باتوں کو زیادہ اہم سمجھتا ہے، اس نے کتاب میں کیا کچھ شامل کیا ہے اور کیا کچھ چھوڑ دیا ہے۔ کتاب میں جن ماخذوں کے حوالے دیے گئے ہوں۔ اگر ممکن ہو تو ان کی فوراً تصدیق کر لینی چاہیے۔ ان باتوں سے مطمئن ہو جانے کے بعد کتاب کے عام اسلوب تحریر پر نگاہ جانی چاہیے، مبالغہ سے بھری ہوئی زبان اور اظہار رائے میں غیر معمولی تشدد تنگ نظری کی دلیل ہے۔ اگر مصنف نے اپنی رائے کا اظہار عموماً تشکیکیہ انداز میں کیا ہے تو اس کے بیان کردہ واقعات کو مستند سمجھ لینا چاہیے

کتاب سے اچھی طرح فائدہ اٹھانے کے لیے "آئینۂ مندرجات" سے کام لینا بھی سیکھنا چاہیے، یہ شئے محض طلبہ کی رہنمائی کے لیے تیار کی جاتی ہے۔ اس لیے اس کا استعمال سیکھنا ضروری ہے۔
مطالعہ کو مؤثر بنانے میں کتب خانہ سے صحیح طور پر کام لینے کی صلاحیت کو کافی دخل ہے بہت سے طالب علم کالج تک جا پہونچتے ہیں لیکن کتب خانہ سے کتاب تلاش کرنے یا کسی حوالے کی کتاب سے فوراً مواد حاصل کرنے کا طریقہ نہیں جانتے، مطالعہ زیر نگرانی کے اوقات میں استاد کو یہ خاص ذمہ داری محسوس کرنی چاہیے کہ ہر طالب علم کو یہ باتیں اچھی طرح سکھائے۔

خاص تکنیکیں

مطالعہ زیر نگرانی کو پرتاثیر بنانے کے لیے اوپر دی گئی عام تکنیکوں کے علاوہ ان خصوصی تکنیکوں کا علم بھی ضروری ہے جو مطالعہ کے الگ الگ میدانوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ عام طالب علم یہ سمجھتے ہیں کہ کسی چیز کو سیکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ اسے پڑھ کر رٹ لیا جائے اور یہ امتحان کے موقع پر لفظ بلفظ پرچے پر لکھ دیا جائے، خواہ ہندسہ کا ایک مسئلہ ہو یا تاریخ کا، ایک موضوع اور یا ایک نظم وہ تینوں کو ایک ہی طور پر یاد کریں گے۔ یہ بات ان کے ذہن میں مشکل سے نہیں آئے گی کہ ہندسہ کا مسئلہ دراصل منطقی استدلال کی ایک زنجیر ہے۔ تاریخ کے سن اور ان میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات مجلسی اور سیاسی زندگی کے غیر منقطع تسلسل میں سنگ ہائے میل کا درجہ رکھتے ہیں اور اردو کی نظم محض الفاظ و محاورات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک چابکدست فن کار کی نفیس تخلیق ہے جو لفظی حسن کے علاوہ ترنم اور جذبات سے بھی بھرپور ہے۔
بعض استاد بھی تعلم کی ان مختلف صورتوں کے لیے مختلف تدریسی تدبیریں استعمال نہیں کرتے، یہ صورت حال بہت افسوسناک ہے۔ گو نفسیاتی طور پر ہر قسم کا تعلم ایک بنیادی وحدت کے ساتھ مربوط ہے اور ان سب میں متعدد رشتے موجود ہیں تاہم استاد کو چاہیے کہ تعلم کی مختلف اقسام اور ہر قسم کے مخصوص تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ لے۔ تعلم کی عموماً مندرجہ ذیل چار بڑی قسمیں تسلیم کی گئی ہیں۔

(۱) حواس و حرکات سے متعلق تعلم، اس کا تعلق، ادراک اور بدنی حرکات سے ہے۔
(۲) تعلم بالرٹ یعنی زبانی یاد کرنا۔
(۳) مسائل کا حل یعنی تدبر اور تفکر۔
(۴) استحسان۔ یعنی جذبات کی تربیت یا نقطہ نگاہ اور مقاصد کی پرورش۔

تعلم کی ان مختلف صورتوں میں فرق کیے بغیر سب کے لیے زبان رٹنے کا طریق برتنا اکثر حالتوں میں ناکامی کو دعوت دینا ہے، ان میں سے ہر مطالعہ کے لیے اس کے حسب حال طریقے برتنے جانے چاہئیں۔ پھر اسی پر بس نہیں، ان میں سے ہر نوع کے تحت جو مضامین آتے ہیں ان میں خود لف یاتی اختلافات موجود ہیں۔ مثلاً ریاضی اور تاریخ دونوں گہرے فکر کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن جہاں تاریخ میں وقت کے مسلسل تصور اور اس تصور میں مختلف واقعات اور شخصیتوں کو درست جگہ دینے کا سوال ہے وہاں ریاضی کے تصورات جداگانہ قسم کے ہیں، خود ریاضی کی تین شاخوں یعنی حساب، الجبرا، اور ہندسہ میں ایک ہی قسم کے تصورات سے واسطہ نہیں پڑتا، حساب میں اگر عددی مقداروں سے سابقہ پڑتا ہے تو الجبرے میں عدد رجہ مجرد قسم کے علاماتی استدلال سے جو طلبہ کو سخت مشکل معلوم دیتا ہے، کیوں کہ ان کا ذاتی تجربہ مقرون قسم کا ہوتا ہے، ہندسہ میں مکانی تصورات کی کارفرمائی ہے، غرض تدریس میں مضامین کے مخصوص نفسیاتی تقاضوں کا ہر وقت لحاظ رہنا چاہیے۔

تدریس کے طریقوں کے طے کرنے میں مطالعہ کے مقاصد کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ مروجہ طریقوں کو بلا سوچے سمجھے اختیار کر لیا جاتا ہے اور یہ نہیں سوچا جاتا کہ ہمارے مخصوص مقاصد کیا ہیں۔ مطالعہ کے طریقوں کا تسلی بخش یا غیر تسلی بخش ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ آیا نتائج ہمارے طے کردہ مقاصد کے مطابق ہیں یا نہیں۔ مثلاً انگریزی ہمارے نصاب کا ایک لازمی جزو ہے، اس کی تدریس کو بے حد تسلی بخش بھی کہا جا سکتا ہے اور بے حد غیر تسلی بخش بھی۔ اگر مقصد محض گرامر یا تحلیل نحوی سکھانا ہو تو اس ضمن میں ہمارے مدرسے بعض اوقات برطانوی

اور امریکی مدرسوں سے بھی بازی لے جاتے ہیں۔ لیکن اگر مقصد یہ ہے کہ طلبہ سہولت اور روانی سے انگریزی عبارت پڑھ سکیں اور انگریزی زبان بول سکیں تو پھر اس زبان کی تدریس سخت ناتسلی بخش نظر آئے گی، غرض مطالعہ سے متوقع فائدہ اٹھانے کے لیے لازمی ہے کہ استاد خود بھی اس کے مقاصد کو وضاحت سے سمجھ لے اور طلبہ کو بھی یہ مقاصد سمجھا دے۔

مطالعہ کی کامیابی کے اہم اسباب۔

مطالعہ زیر نگرانی بظاہر تحصیل علم کی ذمہ داری طلبہ کے کندھوں پر ڈالتا ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ کام ایک قابل اور ہوشیار استاد کی رہنمائی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا، استاد کو مطالعہ کے فن کا خود ماہر ہونا چاہیے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ ایک خاص مضمون کے مطالعہ یا مختلف مقاصد کے تحت ایک ہی مضمون کے مطالعہ میں کس قسم کے ذہنی عمل کی ضرورت ہے، اسے ہر مضمون، ہر جماعت اور بعض اوقات مختلف طلبہ کے مخصوص نفسیاتی تقاضوں کو سمجھنا اور ان کے حسب حال طریق کار اختیار کرنا پڑے گا۔ اس میں وہ سرگرم جذبہ بھی ہونا چاہیے جو دوسروں کو مطالعہ پر ابھارے اور اس میں یہ قیمتی قوت فیصلہ بھی ہونی چاہیے کہ ہر طالب علم کو کس قدر مدد کی ضرورت ہے۔

ماحول اور سازوسامان

جہاں استاد اور طلبہ مطالعہ کی تکنیکوں سے واقف ہوں اور پوری مستعدی سے اس کام کے درپے ہوں وہاں بھی پرسکون ماحول اور ضروری لوازمات کے بغیر اچھے نتائج نہیں نکل سکتے۔ مطالعہ کے لیے خواہ کتب خانہ کو چنا جائے یا جماعت کے کمرے کو اس بات کا اہتمام ہونا چاہیے کہ یہاں کوئی شے توجہ میں خلل نہ ڈالے۔ ہر قسم کا شوروغل اور اشیاء کا بلا قرینے بکھرے ہونا توجہ کو پڑھائی سے ہٹاتا ہے، اچھے طلبہ کے مطالعہ زیر نگرانی سے اچھی طرح مستفید نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہیں جماعت کی بھیڑ میں وہ یکسوئی حاصل نہیں ہوتی جو خیالات کے تسلسل کے لیے ضروری ہے۔

پرسکون ماحول کی طرح ضروری لوازمات کا ہونا بھی لازمی ہے۔ مثلاً ایک لڑکا

مطالعہ کر رہا ہے۔ اگر اسے ایک نقشہ نہیں مل سکتا جو مختلف مقامات کے جائے وقوع کی وضاحت کرے تو یقیناً کہ بہت سے حصے مبہم رہیں گے۔ اسی طرح اگر کسی طالب علم کو اچھی لغات یا جامع العلوم نہیں ملتی تو بعض الفاظ اور واقعات کے متعلق اس کا ذہن صاف نہ ہو سکے گا۔ غرض مطالعہ کے کمرے میں یا اس کے قریب وہ ضروری لوازمات موجود ہونے چاہئیں جو اخذ مطالب اور توضیح مفہوم کے لیے ضروری ہیں۔

ایک منضبط منصوبہ

ہر تدریسی سرگرمی کی طرح مطالعہ زیر نگرانی بھی اسی صورت میں بہترین نتائج پیدا کرے گا جب اسے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انجام دیا جائے، جب تک استاد ایک منضبط منصوبہ تیار نہیں کرے گا۔ مطالعہ کا کام بعض اہم پہلوؤں سے عاری رہے گا اور ادھورا ثابت ہوگا۔ سال کے آغاز ہی میں استاد کو ان امور کی فہرست تیار کر لینی چاہیے جن میں خاص طور پر تربیت دینا مقصود ہے ان میں سے جن کے متعلق یقین ہو جائے کہ طلبہ نے ان میں مہارت حاصل کر لی ہے انہیں اس فہرست سے خارج کر دیا جائے اور دوسرے ضروری امور پر توجہ مرکوز کی جائے، اس ضمن میں ضروری احتیاط یہ ہے کہ زیادہ اہم امور کو توجہ پہلے ملے اور دوسروں کو بعد میں، مطالعہ زیر نگرانی کے گھنٹہ میں استاد کو جن امور کی طرف خاص توجہ دینی چاہیے ان کی ایک فہرست نیچے درج ہے، ہر استاد اپنی مخصوص ضرورتوں کے مطابق اس میں کمی بیشی کر سکتا ہے۔

(۱) زبانی یاد کرنے کے طریقہ میں طلبہ کی رہنمائی ہونی چاہیے۔

(۲) یاد دہانی کا اصول ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے۔

(۳) طلبہ کو مختلف کتابوں اور دوسرے مواد کی تلاش کا صحیح طریقہ سکھانا چاہیے۔

(۴) طلبہ کو کتابوں، نقشوں اور اعداد و شمار سے کام لینے کا ڈھنگ سکھانا چاہیے۔

(۵) طلبہ کو اس قابل بنانا چاہیے کہ خاصی رفتار کے ساتھ پڑھیں اور مطالب سمجھتے جائیں۔

(۶) خاموش مطالعہ کی کافی مہارت پیدا ہونی چاہیے۔

(۷) طلبہ کو مطالعہ کا ڈھنگ سکھانا چاہیے۔

(۸) مطالعہ کا ایک عام خاکہ تیار کرنے کا ڈھنگ سکھانا چاہیے۔

(۹) کتاب کے اہم نکات کو تحریری اشاروں کی شکل دینا سکھانا چاہیے۔

(۱۰) طلبہ کے تیار کردہ اشاروں کی نگرانی ہونی چاہیے۔

(۱۱) طلبہ جب کسی موضوع پر مواد جمع کر رہے ہوں تو اس کام کی نگرانی ہونی چاہیے۔

(۱۲) جمع شدہ مواد کو ترتیب دینے کے کام کی نگرانی ہونی چاہیے۔

(۱۳) مرتب کردہ مواد کی روشنی میں مفروضے قائم کرنے میں رہنمائی ہونی چاہیے۔

(۱۴) مفروضوں سے نتیجے نکالنے، ان کے متعلق رائے قائم کرنے اور ان کے اطلاق میں طلبہ کی رہنمائی ہونی چاہیے۔

(۱۵) طلبہ کی انفرادی صلاحیتوں اور دلچسپیوں کا کھوج لگانا چاہیے۔

(۱۶) مطالعہ کے روزانہ کام کا ربط پچھلے کام سے قائم رہنا چاہیے۔

ان تمام تدبیروں کے علاوہ استاد کو ہر مخصوص اور غیر متوقع ضرورت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اسے ان کتابوں کی فہرستیں جمع کرتے رہنا چاہیے جو طلبہ کے مطالعہ کے لیے مفید ہیں۔ ایسی فہرستیں تعلیمی رسالوں میں عموماً چھپتی رہتی ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں:

انگریزی تعلیم (ایک بچہ اسکول کی سیر)

محمد عبد العزیز

مسلسل نمبر ۱

پس منظر

پاکستان میں تعلیمی ترقی اور تعلیمی سہولتوں کے فقدان کے متعلق گفتگو کرنا ایک امر ناگزیر ہے کہ ابھی ہم زندگی کے ان مراحل کے قریب بھی نہیں پہونچے جہاں دوسری قومیں کم سے کم پچاس برس پہلے پہونچ چکی ہیں۔ لیکن اگر بحث کا موضوع برطانوی ثانوی تعلیم کی تعمیر نو ہو تو ایک مرتبہ ذہن اس حقیقت کو من وعن قبول کرنے سے ضرور گریز کرے گا۔ اس لیے نہیں کہ تعلیم میں ترقی کی گنجائش نہیں بلکہ اس لیے کہ جو نظامِ تعلیم اس وقت ہمارے ملک میں رائج ہے وہ تمام تر اسی نظامِ تعلیم کی پرچھائیں ہے اور ہم اسے اپنی ترقی کی شاہراہ میں روشنی کا ایک ایسا مینار سمجھتے ہیں جو ہمارے ماحول کو منور کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس نظامِ تعلیم پر جو تنقید کی جائے گی وہ ایک مرتبہ ہمیں چونکا ضرور دے گی۔

موجودہ برطانوی نظامِ تعلیم اگرچہ صدیوں کی شکست وریخت کا نتیجہ ہے لیکن اس میں آج بھی ایسی بنیادی خامیاں موجود ہیں جو طلبہ کو طبقوں اور گروہوں میں تقسیم کر دیتی ہیں۔ اگرچہ ثانوی مدارج میں یہ تقسیم محض ذہنی بلندی اور پستی پر منتج ہوتی ہے لیکن آگے چل کر یہی تقسیم سماجی امتیازات کا بہت بڑا سبب بن جاتی ہے۔ پاکستان میں مختلف قسم کے ثانوی مدارس دراصل اسی نظامِ تعلیم کی برکات ہیں۔ لاہور میں ماڈل اسکول۔ ایچیسن کالج اور سینٹ انتھنی انگریزوں کے گرامر اسکول، پبلک اسکول اور پیرش اسکول کی نمائندگی کرتے ہیں جنھیں ہم اپنی قومی زندگی کا بہت بڑا کارنامہ سمجھ کر انہی پر قانع ہو گئے ہیں۔ لیکن برطانیہ میں اس وقت ثانوی تعلیم اور ثانوی مدارس کو ایک نہج پر لانے کی مسلسل کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس کوشش میں صرف ماہرینِ تعلیم ہی نہیں سیاست دان اور صناع بھی شامل ہیں ان میں سے ہر گروہ اور ہر شخص اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے اس مسئلے کا جائزہ لیتا ہے اور پھر اسے اپنے مخصوص انداز میں تمام بیماریوں کا نسخہ کیمیا اثر سمجھ کر عوام کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان میں سے

روہ پبلک اسکولوں کے بند کرنے کے حق میں ہے تو دوسرا COMPREHENSIVE SCHOOL
یا حامی ہے۔ ایک گرامر اسکولوں کی زندگی کے اس سفر میں سنگ میل کا درجہ دیتا ہے تو دوسرا
ی جدید مدارس (SECONDARY MODERN SCHOOLS) کو قومی ترقی کا زینہ
بتاتا ہے، یہ اور اس قسم کے متباین نظریات کو جو بعض اوقات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے معلوم
تے ہیں دراصل سوچنے والوں کی بدنیتی پر محمول نہیں کیا جا سکتا، انگریز جو کچھ سوچتا ہے اپنے لیے
ں اپنی قوم کے لیے سوچتا ہے۔ اگر ایک شخص پبلک اسکول کی مخالفت میں آواز اٹھاتا ہے
الواقع وہ اسے قومی مفاد کے منافی سمجھتا ہے، ان میں سے ہر گروہ کا مقصد یہی ہے کہ ہم اپنے
رسوں میں ایک ایسا ماحول اور ایک ایسا نظام پیدا کر دیں جہاں انہیں اپنی شخصیت کے بنانے
بیش از بیش مواقع میسر آسکیں۔ لیکن کیا بہ یک وقت ان متضاد نظریات پر عمل کرنا ممکن ہے اور
ر فی الفرض ممکن بھی ہو تو اس سے ایک انتشار پیدا ہونے کا جو اندیشہ باقی رہتا ہے۔ درآں حالیکہ
س تجدید کے مطالبے کا مقصد اس انتشار کو دور کرنا ہے، اس لیے آج کل برطانوی نظام تعلیم کو جدید
تقاضوں کے پورا کرنے کا اہل بنانے کے لیے بعض اہم تعمیری تبدیلیاں ہو رہی ہیں اس سلسلے میں ایک
عجیب بات یہ ہے کہ تجدد کی اس خواہش کے باوجود انگریز اس قدر قدامت پسند ہے کہ وہ اپنے ان
اداروں کو مٹانا بھی نہیں چاہتا، جہاں ایک ماہر تعلیم کے الفاظ میں "اگرچہ مفکر اور سائنس دان تو پیدا نہیں
ہوئے لیکن ایسے اولوالعزم سیاست دان اور انتظام کار ضرور پیدا ہوئے جنھوں نے اس چھوٹے سے
جزیرے کو ایک عالم کی وسعت بخشی۔ میں نے خود اس موضوع پر دو تین اساتذہ سے بات چیت
کی۔ نظری اعتبار سے وہ اس نظام میں یکسانیت پیدا کرنے کے حامی ہیں لیکن جب اس یکسانیت
پر عمل کا رنگ روغن چڑھانے کا موقع آتا ہے تو وہ ایٹن اور ہیرو کو تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتے اس
سلسلے میں، میں نے اپنے ان ہم جماعتوں سے بھی بات کی جو کسی گرامر یا سکنڈری ماڈرن اسکول میں
مدرس ہیں اور شام کو لکچر سننے کے لیے انسٹی ٹیوٹ آتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ان اداروں کو ایک
تاریخی سرمایہ سمجھتے ہوئے سینے سے لگا کر رکھنے کے آرزو مند ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر اس نئی تعلیمی

تحریک اور موجودہ کش مکش کے سمجھنے کے واسطے برطانوی تعلیم کے تاریخی پس منظر کا جاننا ضروری ہے چناں چہ اس تحریک کے ماله وما علیہ کی توضیح سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مختلف اداروں کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کروں۔

پبلک اسکولوں سے قطع نظر اس وقت برطانیہ میں پانچ قسم کے مدارس قائم ہیں جو اپنے نظام کار، نصاب، اور طریق تدریس میں بالکل آزاد ہیں۔ ان میں جونیر مکسڈ انفینٹ اسکول (JONIOR MIXD INFANT SCHOOL) پرائمری ہیں۔ سیکنڈری گریمر اسکول (SECONDARY GRAMMAR SCHOOL) اور سیکنڈری ماڈرن اسکول (SECONDARY MODERN SCHOOL) خالص تعلیمی ثانوی مدارس ہیں، جہاں آرٹس اور سائنس کے مضامین کی رسمی تدریس ہوتی ہے۔ سکنڈری ٹیکنیکل اسکول (SECONDARY TECHNICAL SCHOOL) اور کامپری ہنسیو اسکول (COMPRE HENSIVE SCHOOL) البتہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے جداگانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ اس مضمون میں، میں صرف پہلی قسم کے اسکول کا ایک مفصل خاکہ پیش کروں گا۔

بچوں کا اسکول

۱۸ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو دس بجے میں چند دوسرے ایشیائی ساتھیوں کی معیت میں ایج ویر جے، ایم، آئی، اسکول مڈل سکس، EDGWARE JUNIOR INFANT SCHOOL، دیکھنے گیا۔ ایج ویر لندن کے شمالی علاقے میں پڑھے لکھے EDGWARE - MIDDLESE لوگوں کی ایک خوب صورت سی آبادی ہے۔ ایج ویر کے بچوں کا یہ اسکول ٹیوب اسٹیشن کے قریب ہی ہائی اسٹریٹ پر واقع ہے۔ ہائی اسٹریٹ سے اسکول کا منظر اتنا دل کش نہیں بلکہ باہر سے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس جگہ کوئی اسکول بھی ہے۔ میں اپنے ساتھیوں سے ذرا پہلے پہونچ گیا تھا۔ اسٹیشن سے ہدایت کے مطابق ہائی اسٹریٹ پہونچا۔ کوئی پندرہ منٹ تک مل ہل ایسٹ (MILL HILL EAST) طرف چلتا رہا۔ لیکن مجھے کوئی اسکول نہ ملا۔ اب دس بجنے والے تھے، اس لیے ذرا تشویش ہوئی۔ میں نے

دو ایک حضرات سے پوچھا بھی مگر کسی نے میری رہ نمائی نہ کی، وقت پر اسکول نہ پہونچنے کا مجھے زیادہ افسوس تھا۔ اب دس بجنے میں صرف دس منٹ باقی تھے، یہاں چوں کہ لوگ اپنے کاروبار میں اس قدر منہمک رہتے ہیں کہ انہیں اپنے گردوپیش کی خبر نہیں رہتی، اس لیے میں نے کسی سے مزید استفسار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ قریب میں کوئی سپاہی بھی نظر نہ آیا کہ اس سے پوچھ لیتا۔ کیوں کہ لندن میں نوواردوں کے لیے سپاہی خضر راہ کا کام دیتا ہے۔ میں نے مجبور ہو کر یہ سوچا کہ ہیڈ ماسٹر کو فون کردوں کہ میں ریلوے روڈ جو رہا ہے کے قریب ہی ہائی اسٹریٹ ٹیلی فون بوتھ پر کھڑا ہوں، اسکول نہیں مل رہا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میری نگاہیں سامنے والی عمارت پر پڑیں۔ شیشے کی کھڑکیوں سے چند بچوں کی شکلیں دکھائی دیں۔ بہ یک وقت ایک کمرے میں بہت سے بچوں کا ہونا ایک مدرسے کی نشان دہی ضرور کرتا تھا، اس لیے میں احاطے میں داخل ہوا۔ عمارت کے سامنے ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ اب میں نے عمارت کو ذرا غور سے دیکھا مختلف کمروں میں بچے پڑھ رہے تھے، میں نے ادھر ادھر گھوم پھر کر دیکھا اور جب قرائن سے یہ اندازہ لگا لیا کہ یہ وہی اسکول ہے تو باہر اپنے ساتھیوں کے انتظار میں کھڑا ہوگیا۔ کوئی چار پانچ منٹ میں سب لوگ جمع ہو گئے اور ہم اسکول میں داخل ہوئے۔

اسکول کے جس دروازے سے ہم لوگ داخل ہوئے اس کے ساتھ ہی بچوں کا کلرک روم ہے، کلرک روم سے نکل کر ہم ایک درمیانی راستے سے ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں پہونچے، ہیڈ ماسٹر کا نام ایم اے۔ ایچ۔ او۔ پورٹر (MA. H. O. PORTER) ہے، چوں کہ انہیں ہمارے آنے کی پہلے سے ہی اطلاع تھی، اس لیے ہمیں کوئی قباحت نہیں ہوئی۔ ہمارے یہاں کسی نووارد کی آمد پہ اس بات کا بالخصوص خیال کیا جاتا ہے کہ اجنبی کی نگاہ مدرسے کے ان مقامات پر نہ پڑے جو خود مدرسہ والوں کی نگاہوں میں برے ہوتے ہیں، لیکن یہاں اس قسم کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ مسٹر پورٹر بڑی محبت سے ملے۔ ہم سب نے اپنی برساتیاں ان کے کمرے میں ٹانگیں۔ تھوڑی دیر تک دفتر میں ہی بات چیت ہوتی رہی۔ اس کے بعد مسٹر پورٹر کے ساتھ اسکول کے مختلف حصوں میں پھرتے رہے فی الحال ہم کسی جماعت میں داخل نہیں ہوئے۔ بلکہ باہر ہی سے اسکول کا ایک سرسری جائزہ لیا،

اسکول لائبریری پہنچے۔ یہاں مسٹر پورٹر سے کم و بیش دو گھنٹے تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، دوران گفتگو میں چائے آئی، باتیں ہوتی رہیں اور چائے کا دور چلتا رہا۔ مسٹر پورٹر کا انداز گفتگو ایسا غیر رسمی اور دوستانہ تھا جیسے ہماری ان کی مدت سے جان پہچان ہو اور ہم سب ایک غیر مشترک موضوع پر اپنے بھی خیالات کا اظہار کر رہے ہیں کبھی کبھی باتوں میں مزاح کی چاشنی آجاتی کہ فضا میں قہقہے بلند ہو جاتے اور کبھی کبھی یہی خوش مذاقی زیر لب تبسم ہی تک محدود رہتی۔

سشن اور داخلے

اس مدرسے میں پانچ برس سے گیارہ برس تک کے بچے تعلیم پاتے ہیں یعنی انفینٹ یا ابتدائی جماعت میں جو بچہ پانچ برس کی عمر میں داخل ہوتا ہے وہ اس اسکول میں چھے سال تک تعلیم حاصل کرتا ہے، دو سال انفینٹ کلاس میں اور چار سال جونیر کلاس میں۔ جونیر کلاس فرسٹ ایر، سکنڈ ایر، تھرڈ ایر اور فورتھ ایر کہلاتی ہیں، سال اول سے سال دوم تک بچوں کے امتحانات اسکول ہی میں ہوتے ہیں لیکن سال چہارم کے اختتام پر ایک عمومی امتحان ہوتا ہے جس میں مڈل سکس بورو کے سارے طلبہ شریک ہوتے ہیں۔

یہ مدرسہ اپنے نظام کار اور طریق تدریس میں جونیر ماڈل اسکول لاہور سے ملتا جلتا ہے لیکن جو زندگی میں نے اس ادارے کے طلبہ اور اساتذہ میں دیکھی جونیر ماڈل اسکول میں اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ جونیر ماڈل کی طرح یہاں بھی طلبہ اور طالبات ساتھ ساتھ پڑھتے ہیں لیکن بعض مخصوص مضامین کی تدریس یا مخصوص کام کے سلسلے میں دونوں علاحدہ بھی کر دیے جاتے ہیں مثلاً جس وقت طالبات بُننے یا سینے پرونے کا کام سیکھتی ہیں اور طلبہ گتے سے چھوٹی چھوٹی چیزیں بنانا سیکھتے ہیں۔

برطانیہ کے ہر ناقوی تعلیمی ادارے میں سال تین حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ سال کا پہلا دور ستمبر کے پہلے ہفتے سے شروع ہوتا ہے اور دسمبر کے پہلے ہفتے میں ختم ہو جاتا ہے، دوسرا دور جنوری کے دوسرے ہفتے سے شروع ہوتا ہے اور ایسٹر کی تعطیلات سے پہلے ختم ہو جاتا ہے تیسرا دور

ایسٹر کی تعطیلات کے بعد شروع ہوتا ہے اور جولائی کے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ پہلے دور کو (ARTUMN TERM) کہتے ہیں اور دوسرے اور تیسرے دور کو علی الترتیب (SPRINGTERM) اور (SUMMER TERM) کہتے ہیں۔ مدرسے کا سال ستمبر سے شروع ہوتا ہے اور جولائی میں ختم ہو جاتا ہے، جون کے آخری ہفتے میں سال چہارم کے امتحان ہو جاتے ہیں اور یہ بچے اگلے سیشن میں کسی گرامر یا سیکنڈری ماڈرن یا کسی اور ثانوی مدرسے میں داخل ہو جاتے ہیں اور مزید پانچ سال تک تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ انگلستان اور ویلز میں تعلیم پندرہ سال کی عمر تک لازمی ہے اس کے بعد تین سال تک ہر طالب علم تعلیم مزید (FURTHER EDUCATION) حاصل کر سکتا ہے۔

برطانوی مدارس میں داخلے کا طریقہ بالکل مختلف ہے۔ بالخصوص انفینٹ اسکولوں میں تو اس کی نوعیت ہی جداگانہ ہے۔ پہلے سیشن میں جو بچے داخل ہوں گے، ۴ ستمبر کو ان کی عمر پانچ سال کی ہو جاتی ہے۔ اس طرح جن بچوں کی عمر پانچ سال کی ہوتی جائے گی وہ ہر سیشن میں داخل ہوتے جائیں گے یہ نہیں ہوگا کہ اگر بچہ ۵ ستمبر کو پانچ سال کا ہوتا ہے تو اسے ایک سال تک مسلسل انتظار کرنا پڑے دوسرا سال آئے اور بچہ داخل ہو۔ بچوں کی تعلیم و تربیت اور وقت کی قدر و قیمت کے سلسلے میں انگریز جس قدر محتاط ہے اس کا اندازہ اس کے تعلیمی نظام کار سے لگایا جا سکتا ہے۔ پندرہ سال تک تعلیم لازمی اور کم و بیش مفت ہے لیکن اس تعلیمی کل کے چلانے میں حکومت صرف روپیہ اور مشورہ دیتی ہے۔ اس نظام کو خود نہیں چلاتی۔ بلکہ مقامی تعلیمی حکومتیں ان فرائض کو انجام دیتی ہیں، حکومت پنجاب اس وقت تک ملک میں صرف دو جونیئر ماڈل اسکول قائم کر سکی ہے۔ ایک تقسیم ملک سے پہلے قائم ہوا اور دوسرا تقسیم ملک کے بعد۔ لیکن ان دونوں اداروں میں وہ نظم و ضبط اور خوش سلیقگی نہیں ہے جو انگریزی ابتدائی مدرسوں کا طرۂ امتیاز ہے، چونکہ تعلیم لازمی ہے اور تعلیم کے لیے ہر مقامی حکومت اور خود مرکزی حکومت ایک گراں قدر رقم خرچ کرتی ہے، اس لیے طلبہ کو داخلے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ طلبہ کی تعداد کے مطابق ہر علاقے میں ابتدائی اور ثانوی مدرسے قائم ہیں۔ تاکہ انہیں اس عمر میں زیادہ سفر نہ کرنا پڑے۔

ہمارے تعلیمی نظام کا ایک بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم تعلیم کو حکومت کی ذمہ داری سمجھ کر اس بار گراں کو حکومت کے کاندھوں پر ڈال دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ حکومت اپنے وسائل کے مطابق ہی تعلیمی ترقی کی کوشش کرے گی۔ اس کے برعکس برطانیہ میں تعلیم مقامی حکومتوں کی ذمہ داری ہے۔ ہر برو میں ایک تعلیمی کمیٹی ہوتی ہے جو مقامی تعلیمی حکومت کہلاتی ہے۔ یہ مقامی تعلیمی حکومت برو کے منتخب اراکین پر مشتمل ہوتی ہے جو اپنی ضروریات کے مطابق اس کے نظم ونسق کو چلاتے ہیں۔ انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں اس کی داغ بیل ہمارے ملک میں بھی ڈالی لیکن ہمارے یہاں ہنوز روز اول ہے، بلدیاتی اسکولوں کا حال ناگفتہ بہ ہے اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکولوں میں تعلیم کا جس طرح منہ چڑایا جاتا ہے اس کی ایک نہیں سیکڑوں مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں ابھی تک ایک کام کو جمہوری انداز میں چلانے کا سلیقہ پیدا نہیں ہوا۔ اول تو ہمارا نقطۂ نگاہ ذاتی منفعت تک محدود رہتا ہے اور بالفرض اس سے ہٹ کر اگر ہم نے قوم کے متعلق کچھ سوچ بھی لیا تو وہ محض لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ لاہور مغربی پاکستان کا صدر مقام ہے لیکن اس کے ابتدائی مدارس کا جو حال ہے، اس کی مفصل تصویر اکثر پاکستان ٹائمز کے صفحات میں نظر آجاتی ہے۔

جماعتیں

برطانوی ابتدائی اور ثانوی نظام تعلیم کی دوسری مابہ الامتیاز خصوصیت ایک جماعت میں طلبہ کی تعداد ہے۔ ہمارے یہاں ماڈل اسکول میں بھی یہ تعداد بعض اوقات ۴۵ سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ بلدیاتی مدارس میں بھی یہی تعداد ایک سو ہو جاتی ہے، یہی حال انجمنوں کے مدارس کا بھی ہے۔ اندریں حالات بچوں کی تدریس مدارس کے کھیل سے زیادہ وقیع نہیں ہوتی۔ زمانۂ مابعد جنگ میں برطانوی اسکولوں میں بھی گنجائش کم ہونے کی وجہ سے جماعتوں میں طلبہ کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے۔ میں نے مسٹر پورٹر سے اس موضوع پر بڑی دیر تک بات چیت کی۔ مسٹر پورٹر کے اسکول میں کل چھ جماعتیں ہیں دو انفینٹ اور چار جونیئر۔ ان میں انفینٹ جماعت کے چار فریق ہیں اور ہر فریق میں طلبہ کی تعداد ۴۲ ہے۔ سال اول کے ایک فریق میں ۳۰ اور باقی سال اول سے سال چہارم تک

پانچ فریقوں میں طلبہ کی تعداد پینتالیس پینتالیس ہے اور ایک فریق میں یہی تعداد ۴۸ تک پہنچ جاتی ہے۔ برطانوی تعلیمی قانون کے مطابق ابتدائی جماعتوں میں طلبہ کی تعداد ۴۰ ہے اور جونیئر ثانوی جماعتوں میں ۴۰ سے متجاوز نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے مسٹر پورٹر سے اس کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے ہر جماعت میں تعداد کے یکساں نہ ہونے کا سبب بتایا۔ سب سے بڑی وجہ تو یہی ہے کہ زمانہ مابعد جنگ میں تعلیم کی مانگ بڑھ گئی اور تعلیم کے لازمی ہونے کی وجہ سے طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اس مانگ کو پورا کرنے کے لیے بے شمار نئے مدرسے قائم ہو رہے ہیں مسٹر پورٹر کو امید ہے کہ پانچ سالہ منصوبے کی تکمیل کے بعد جماعتوں میں طلبہ کی تعداد میں یکسانی پیدا ہو جائے گی۔ تعداد میں عدم یکسانیت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر دور میں طلبہ داخل ہوتے رہتے ہیں مثلاً انفینٹ کلاس میں چند بچے ستمبر میں داخل ہوتے ہیں اور چند جنوری میں، ان داخلوں کی وجہ سے یکسانیت کے توازن کا قائم نہ رہنا یقینی ہے، اس اسکول میں سال کے ہر دور میں ۳۵ طلبہ داخل کیے جاتے ہیں اور یہ طلبہ بالعموم انفینٹ کلاس کے ہوتے ہیں۔ بڑی جماعتوں میں اگر طلبہ کی تعداد زیادہ ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر ابتدائی جماعتوں میں یہ لوگ آج بھی اس بات کا خاص اہتمام رکھتے ہیں کہ تعداد میں اضافہ نہ ہونے پائے کیوں کہ اس صورت میں بچوں کی شخصیت کی تہذیب و تربیت میں مدرس انفرادی توجہ دینے سے قاصر ہو جائے گا۔ تیسری اور سب سے اہم وجہ اساتذہ کی کمی ہے۔

اصولی طور پر انہیں اعتراف ہے کہ زیادہ تعداد میں طلبہ کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر ہی ناممکن نہیں ان میں عدم تعلم بھی پیدا ہو جاتا ہے، اس لیے مقامی تعلیمی حکومتیں اور تعلیم کے دوسرے ارباب حل و عقد اس مسئلے کی طرف بالخصوص توجہ دے رہے ہیں اور زندہ قومیں جب کسی چیز کا عزم کر لیتی ہیں تو اس کی تکمیل مشکل نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس قوم کو اس سلسلے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

نظامِ اوقات

اکتوبر کے نصف آخر میں لندن کا درجۂ حرارت ۴۶ اور ۵۲ کے بین بین رہتا ہے۔ سورج شاذ و نادر کسی دن نکلتا ہے۔ کہرا پڑتی رہتی ہے کبھی کبھی ہوائیں تیز ہو جاتی ہیں تو سردی بڑھ جاتی،

گرم ملکوں کے لوگوں کے لیے اتنی سردی بھی بڑی سرد ہوتی ہے۔ مگر یہاں کے رہنے والوں کے لیے تو یہ ایک قسم کا خوش گوار موسم ہے، ۸ بج کر ۵۵ منٹ پر اسکول شروع ہوتا ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے کی تعلیم و تربیت کے بعد ساڑھے دس بجے گھنٹی بجتی ہے، اس وقت بچوں کو دودھ دیا جاتا ہے جو کم و بیش ایک پاؤ ہوتا ہے بعض بچے ایسے بھی ہیں جو دودھ نہیں پیتے۔ اس لیے ہیڈ ماسٹر دودھ کی اتنی ہی بوتلیں منگواتا ہے جتنی اسے ضرورت ہوتی ہے، یہ دودھ لندن کاؤنٹی کونسل کی طرف سے مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔ انگریزوں کو اپنی قومی صحت کے تحفظ کا اتنا زیادہ خیال ہے کہ وہ شروع ہی سے بچوں کی صحیح نشو و نما کی جانب توجہ دیتے ہیں، دودھ کی تقسیم اس لیے اور ضروری سمجھی جاتی ہے کہ ایسے بچے جو والدین کی مالی حالت کے سقیم ہونے کی وجہ سے ناقص تغذیہ کے شکار ہو جاتے ہیں انہیں ایسی خوراک مہیا کی جائے جس سے ان کا جسمانی توازن قائم رہ سکے اور وہ بھی دوسرے بچوں کے دوش بدوش جسمانی اور ذہنی اعتبار سے بڑھتے رہیں۔

یہ وقفہ صرف دس منٹ کا ہوتا ہے۔ بارہ بجے پھر چھٹی ہوتی ہے، گھنٹی بجتے ہی لڑکے کھانے کے کمرے میں جمع ہو جاتے ہیں، اس اسکول میں باورچی خانہ نہیں ہے، اس لیے کھانا باہر سے پک کر آتا ہے۔ بچے نہایت سلیقے سے قطار اندر قطار چلتے رہتے ہیں۔ ایک لڑکا اپنی پلیٹ میں آلو، گوشت، سبزی اور پھر چھری کانٹے لے کر اپنی نشست پر بیٹھ جاتا ہے، اس کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا، علی الترتیب چلتے رہتے ہیں، بچوں کی یہ خوش سلیقگی دیکھ کر مجھے حیرت تو نہیں ہوئی کیوں کہ آزاد قوموں کی تنظیم کا معیار یہی ہوتا ہے، لیکن یہ خیال ضرور پیدا ہوا، اے کاش ہمارے بچے بھی اسی ترتیب و تنظیم کے حامل بن جائیں۔ ہمارے مدرسوں میں بھی بچوں کی تہذیب و تربیت کا یہی معیار ہو۔ کھانا کھا کر ایک بچہ اٹھتا ہے اور اپنی پلیٹ اور چھری کانٹا اٹھا کر ان دو لڑکیوں کو دے دیتا ہے جو ان کے جمع کرنے پر مامور ہوتی ہیں، یہ لڑکیاں بچا کھچا کھانا ایک بالٹی میں ڈال کر پلیٹیں جمع کرتی جاتی ہیں اور بچے پھر اسی قطار میں پہنچ کر کوئی میٹھی چیز لے کر اپنی نشست پر واپس آ جاتے ہیں۔ یہ آمد و رفت اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک سارے بچے کھانا

مالیں مسٹر پورٹر نے بتایا کہ جو لڑکیاں اس وقت پلیٹیں جمع کر رہی ہیں انہیں ہم مامور نہیں کرتے بلکہ خود رضاکارانہ طور پر کام کرتی ہیں۔ کسی دن کوئی کسی دن کوئی۔ میرے ایک ساتھی نے ہنس کر نہایت متعجب سے پوچھا، کیا یہ از خود کام کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ مسٹر پورٹر نے بتایا کہ اس خدمت کے لیے لڑکوں اور لڑکیوں میں اکثر مقابلہ رہتا ہے اور گروہ در گروہ اس کے لیے تیار رہتے ہیں۔ انہیں کبھی ان سے کچھ کہنے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ انھیں ہماری مافعت کی آرزو ہوتی ہے۔ یہ انہی کا کام ہے اس لیے یہ خود ہی اسے انجام دیتے ہیں، صرف ان کی رہنمائی کے لیے ایک استاد موجود رہتا ہے۔ کھانے کے سلسلے میں عام قاعدہ یہ ہے کہ چھوٹا بچہ پہلے اور بڑا بعد میں۔

بچوں کے کھانے کا انتظام دیکھ کر ہم مسٹر پورٹر کی معیت میں اسٹاف روم پہنچے، بچوں کی کثرت کی وجہ سے کھانے کے کمرے میں گنجائش نہیں ہوتی اس لیے اساتذہ اسٹاف روم میں کھانا کھا لیتے ہیں، جب ہم پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس وقت مزید چھ سات افراد کے واسطے یہاں بھی گنجائش نہیں، اس لیے مسٹر پورٹر نے ہمارے کھانے کا انتظام اپنے دفتر میں کیا۔ ہمارے ساتھ کچھ ہندو بھی تھے۔ ان میں ایک صاحب کچھ زیادہ پابند روایات تھے، اس لیے انھوں نے اپنے کھانے کے متعلق کچھ ضروری ہدایات دیں، مجھے اندیشہ تھا کہیں یہ بے چارے فاقہ کرنے کا ہی ارادہ نہ کر لیں۔ کیوں کہ دوسرے کے ہاتھ کا تیار کردہ کھانا یہ کیوں کر کھا سکتے ہیں۔ مگر معلوم نہیں انھوں نے اس کے علاوہ اور کوئی فہمائش نہ کی۔ ہم سب نے ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے وقت بھی ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں کچھ اسکول کے متعلق اور کچھ لندن اور لندن والوں کے متعلق۔

دوپہر کے کھانے کی قیمت بچوں سے نو پنس فی کس لی جاتی ہے اور اساتذہ سے اس کھانے کی قیمت ایک شلنگ تین پنس فی کس، بازار میں یہی کھانا تین چار شلنگ سے کم میں نہیں مل سکتا۔ مقامی تعلیمی حکومتیں ہر ادارے میں دودھ اور کھانے کا باقاعدہ اہتمام کرتی ہیں، دودھ کی قیمت بچوں سے وصول نہیں کی جاتی، کھانے کی معمولی سی رقم لے لی جاتی ہے، اس سے تین فائدے ہوتے ہیں، اول تو یہ کہ بچے اسکول میں اپنا گھریلو ماحول پا کر دن بھر خوش رہتے ہیں، دوسرے یہ کہ والدین کو اس سلسلے میں کوئی قباحت اٹھانی نہیں

پڑتی۔ ماں باپ دونوں صبح کو کام کرنے چلے جاتے ہیں اور بچے مدرسے۔ تیسرے یہ کہ قومی صحت کے گرنے
اندیشہ باقی نہیں رہتا۔

میں جب ان حالات کا اپنے ملک کے مدرسوں سے موازنہ کرتا ہوں تو مجھے افسوس ہوتا ہے کہ
ہم ابھی کس قدر پس ماندہ ہیں، جونیئر ماڈل اسکول پنجاب کا ایک منفرد ادارہ سمجھا جاتا ہے۔ یہی و
کہ سال بھر لوگ اپنے بچوں کو اس ادارے میں داخل کرانے کی فکر میں دن رات پریشان رہتے ہیں۔ لیکن
حق یہ ہے کہ وہاں بھی بچوں کو وہ ماحول میسر نہیں آتا، کھانے پینے کا اتنا عمدہ انتظام تو دیوانے کا خوا
اس کے نظام کار میں بھی وہ خوش سلیقگی نہیں ہے، اس سے میری مراد جونیئر ماڈل اسکول کی تنقیص
نہیں ہے، بلکہ میرا مقصد ان دونوں اداروں کو ایک متوازی سطح پر رکھ کر دونوں کا موازنہ کرنا ہے
بچوں کو بڑوں کی نسبت جلد بھوک لگتی ہے، اس لیے ہر گھنٹے دو گھنٹے بعد انہیں کچھ کھانے کی آرزو ہو
ہے۔ لیکن ہمارے یہاں دوپہر سے پہلے انہیں کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ تفریح کے وقت بلکہ تفریح سے
پہلے اور بعد میں بھی جوق در جوق طلبہ خوانچہ فروشوں سے گلی سڑی چیزیں لے کر اپنی بھوک مٹاتے ہیں
اس سے اگر غور کیا جائے تو تین قسم کے نقصان ہوتے ہیں، اول تو یہ کہ بچوں میں چاٹ کھانے کی عادت
پڑ جاتی ہے جو آگے چل کر اسراف کی صورت اختیار کر سکتی ہے، دوسرے بچوں کی صحت پر اس کا بہت
برا اثر پڑتا ہے تیسرے یہ کہ ان میں نظم اور ضبط قائم نہیں رہتا۔ ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے میں جو تو
ہم دردی۔ بھائی چارہ اور اخلاص پیدا ہوتا ہے اس افراتفری میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاتا او
جب انگریزی مدارس میں اس چھوٹی سی عمر ہی سے بچوں کو اس قسم کی تربیت دی جاتی ہے تو یہ
ضروری ہے کہ جو نقوش آج ان کے دل پر مرتسم ہوں گے، وہی ان کی آئندہ زندگی میں بھی جلوہ نما
ہوں گے، اس سلسلے میں اس وقت ہم ان انگریزی مدارس کا تو خیر کیا مقابلہ کریں گے، حق یہ ہے کہ
ہم یو۔پی کے عمومی مدرسوں کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہاں ہر ثانوی اور ابتدائی مدرسوں میں، سردیوں
میں ایک بجے اور گرمیوں میں آٹھ بجے کے قریب بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ کھانے کا اہتمام ہوتا ہے۔
کسی دن عمدہ قسم کے چنے کی گھنگنی، کسی دن پھل، اور کسی دن پھل اور چنے دونوں، ۱۹۴۲ء کے بعد سے

مجھے ان مدرسوں کا خود کوئی ذاتی تجربہ نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ آزادی کے بعد ان مدارس میں اس قسم کی اور زیادہ سہولتیں پیدا کر دی گئی ہوں گی، اس جگہ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا ہم اپنے مدرسوں میں تعلیمی نقطۂ نگاہ سے بچوں کے لیے ایسی سہولتیں مہیا کر سکتے ہیں، میرے خیال میں ہم اپنے موجودہ ماحول ہی میں تھوڑی سی ترمیم کے بعد اس سلسلے میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ صرف ایک اقدام کی ضرورت ہے۔

ڈیڑھ بجے طلبہ پھر درس و تدریس کے لیے اپنے کمروں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ انفینٹ کلاس کے بچوں کو ساڑھے تین بجے اور جونیئر کلاس کے بچوں کو چار بجے چھٹی مل جاتی ہے، چھٹی کے بعد بچے اپنے گھر واپس جاتے ہیں، قریب رہنے والے پیدل چلے جاتے ہیں اور دور رہنے والے بسوں میں بیٹھ کر سڑک پر سفید اور کالی پٹی کا ایک راستہ ہوتا ہے، ایک پٹری سے دوسری پٹری پر جانے کے لیے سڑک کو اس مخصوص مقام سے عبور کیا جاتا ہے، اگر آپ کسی دوسری جگہ سے سڑک پار کرتے ہیں اور کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو اس کی ذمہ داری آپ کی اپنی ہوگی، اسکولوں کے قریب ٹریفک کو ہدایت ہے کہ جس وقت کوئی سڑک پار کر رہا ہو تو گاڑی روک لی جائے، سڑک پار کرنے والا گاڑی کے گذرنے کا انتظار نہیں کرے گا۔ یہاں موٹر گاڑیاں خاصی تیز چلتی ہیں لیکن ڈیوس روڈ لاہور کے بچوں کا سا حادثہ یہاں سننے میں نہیں آتا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچوں کے ساتھ ان کا ایک نگراں ہوتا ہے اور وہ سڑک پر ایک نشان لے کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ''رک جاؤ، بچے سڑک پار کر رہے ہیں'' (STOP CHILDREN ARE CROSSING) اس نشان کو دیکھ کر دونوں طرف گاڑیاں رک جاتی ہیں اور بچے اطمینان سے سڑک پار کر لیتے ہیں۔

نصابی کتابیں اور اسٹیشنری

نصاب اور نصابی کتابوں کے سلسلے میں ہمارے ملک میں اب تک وہ معیار قائم نہیں ہو سکا جو اس ملک میں قائم ہو چکا ہے۔ ہمارے یہاں محکمۂ تعلیم نصاب مقرر کرتا ہے، لوگ کتابیں لکھتے ہیں ناشر انہیں چھاپ کر محکمے کے ارباب حل و عقد کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، محکمہ ان میں سے کچھ

کتابوں کو معیاری سمجھ کر منظور کر لیتا ہے اور باقی کتابوں کو مسترد کر دیتا ہے۔ لیکن برطانیہ میں نصابی کتابوں کے انتخاب کا انداز ہی مختلف ہے۔ سال میں ہر ناشر اور بالخصوص وہ ناشر جو بچوں کے واسطے درسی کتابیں پیش کرنے کے ماہر سمجھے جاتے ہیں مختلف موضوع پر مختلف کتابیں چھاپتے رہتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر خود اپنے اسکول کے لیے کتابوں کا انتخاب کرتا ہے۔ انتخاب کتب کے سلسلے میں اپنے ہم کار اساتذہ سے مشورہ بھی لے لیتا ہے۔ گرامر اسکول میں ابتدائی مدارس کی نسبت ہر شعبے کے صدر اور اس کے معاون اساتذہ کو زیادہ آزادی ہوتی ہے، ہیڈ ماسٹر ان کے انتخاب کا جائزہ لے کے اپنی رائے دیتا ہے۔ لیکن انہیں مسترد نہیں کرتا، آپ کے اس مشورے کے بعد ابتدائی مدرسوں کے ہیڈ ماسٹر یہ کتابیں خود بازار سے خرید کر اسکول لاتا ہے اور بچوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

کتابیں کاغذ پنسل، کاپیاں اور دوسرے درکار لوازمات بچوں کو اسکول مہیا کرتا ہے۔ اس کے لیے ہر مقامی تعلیمی حکومت ایک مخصوص گرانٹ دیتی ہے، یہ مخصوص گرانٹ لندن کاؤنٹی کونسل کے مختلف بر (BOROUGH) میں مختلف ہوتی ہے۔ ایج ویر (EDGWARE) مڈل سکس برو MIDDLESEX (BOROUGH) کا ایک حصہ ہے۔ مڈل سکس میں اس وقت ۷۷ ابتدائی مدارس ہیں، ان مدرسوں کے یہاں کی مقامی تعلیمی حکومت نے نصابی کتابوں اور اسٹیشنری کے سامان کے لیے جو گرانٹ مخصوص کی ہے وہ ۱۵ شلنگ فی کس ہے۔ یعنی جنوری میں طلبہ کی تعداد کے مطابق یہ رقم اسکولوں کو دے دی جاتی ہے مثلاً اس سال ایج ویر کے اس اسکول میں طلبہ کی تعداد ۳۴۰ تھی، اس لیے اسے ۱۵ × ۳۴۰ = ۵۱۰۰ شلنگ یعنی ۲۵۵ پونڈ گرانٹ ملی جو کم و بیش ۳۴۰۰ روپے کے برابر ہوتی ہے، اس گرانٹ سے اسکول کے جملہ طلبہ اور طالبات کے لیے ہر قسم کا درسی سامان خریدا جاتا ہے۔ نصابی کتابیں کاغذ پنسل کاپیاں گتا۔ رنگ سوزن کاری کا سامان وغیرہ وغیرہ۔ میں نے مسٹر پورٹر سے پوچھا کہ کیا یہ معمولی سی رقم بچوں کی ان ضروریات کے لیے کافی ہوتی ہے، مسٹر پورٹر نے میرے اس سوال پر پچھلے دو تین سال کا حساب دکھایا اور ان کی وضاحت یوں کی کہ جو اسکول پچھلے تین سال سے چل رہا ہے اس کے لیے یہ گرانٹ کافی ہوتی ہے کیوں کہ ہر سال ہر بچے کے لیے یہ کتابیں نہیں خریدنی پڑتیں کچھ پرانی کتابیں کام آجاتی ہیں نیز

مدرسوں میں پرانی کتابوں کا ہر طرح کام آنا ہمارے ملک میں تو ممکن نہیں کیوں کہ وہاں تو سال میں بعض خوش سلیقہ بچے کم سے کم دو تین کتابیں پھاڑ دیتے ہیں، لیکن یہاں بچے کتابیں بڑی احتیاط سے رکھتے ہیں، جب وہ ایک جماعت سے دوسری جماعت میں چلے جاتے ہیں تو ان کی کتابیں تازہ واردوں کے کام آتی ہیں اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے

اسٹیشنری کا حساب ذرا اس سے مختلف ہے، کیوں کہ ایک لکھی ہوئی کاپی کسی دوسرے بچے کے کام نہیں آسکتی، اس لیے یہ نسبتاً زیادہ خرچ ہوتا ہے، ہیڈ ماسٹر کے دفتر کے سامنے ہی ایک اسکور روم ہے جس میں اسٹیشنری کا سامان اور نصابی کتابیں رکھی ہوئی ہیں، مسٹر پورٹر خود ہی حسب ضرورت سامان تقسیم کرتے رہتے ہیں، میرے اس سوال پر کہ یہ کام آپ خود کرتے ہیں یا اپنے کسی ہم کار سے بھی مدد لیتے ہیں، مسٹر پورٹر نے فرمایا: میں ہی خریدتا ہوں، میں ہی تقسیم کرتا ہوں، میں ہی ذمہ دار ہوں اساتذہ بچوں کی ضروریات کے پیش نظر ہیڈ ماسٹر سے ضروری سامان لے کر بچوں کو دے دیتے ہیں۔ (باقی)

سائنس
سبقوں کے خاکے

(بن محمد ملک) مسلسل نمبر ۳

مائع حرارت سے پھیلتے ہیں۔

یہ سبق چھٹی جماعت کے بچوں کو دیا گیا تھا۔ بچے ٹھوس اشیا پر حرارت کے اثرات کو پہلے سے جانتے ہیں۔

استاد:- ہم نے پچھلے سبق میں یہ معلوم کر لیا تھا کہ جب ہم دھاتوں کو گرم کرتے ہیں۔ تو ؟

شاگرد:- وہ پھیلتی ہیں۔

استاد:- اور جب ٹھنڈا کرتے ہیں۔ تو ؟

شاگرد:- وہ سکڑ جاتی ہیں۔

استاد:- بھلا تمہیں یہ بات کس تجربہ سے معلوم ہوئی ؟

شاگرد:- گولی اور چھلے کے تجربے سے

استاد:- ہم نے تجربہ شروع کیسے کیا تھا ؟

شاگرد:- سب سے پہلے آپ نے گولی کو چھلے میں سے گذار کر دکھایا تھا، اس وقت گولی چھلے میں سے آسانی سے گذرتی تھی۔

استاد:- پھر گولی کو کیا کیا گیا ؟

شاگرد:- اسے گرم کیا گیا

استاد:- اس کے بعد بھی گولی چھلے میں سے گذر گئی ؟

شاگرد:- نہیں۔

استاد:- کیوں ؟

شاگرد:- اس لیے کہ گرم کرنے کے بعد گولی حرارت سے پھیل گئی تھی۔

استاد:- بھلا بتاؤ تو گولی کس سمت میں پھیلی۔ لمبائی میں یا چوڑائی میں؟

شاگرد:- سبھی سمتوں میں پھیلی۔ جب دھاتوں کو گرم کیا جاتا ہے تو وہ سبھی سمتوں میں پھیلتی ہیں اور سبھی سمتوں میں سکڑتی بھی ہیں۔

استاد:- اچھا اب یہ بتاؤ کہ مادے کی تین حالتوں کے کیا نام ہیں؟

شاگرد:- ٹھوس۔ مائع۔ گیس۔

استاد:- اب ہم نے یہ تو معلوم کر لیا کہ ٹھوس اشیا حرارت سے پھیلتی ہیں اور ٹھنڈا ہونے پر سکڑتی ہیں۔ ٹھوس چیزوں کے بعد ہم کس کو لیں؟

شاگرد:- مائع کو

استاد:- ہم استعمال کا پانی کہاں سے لیتے ہیں؟

شاگرد:- نلکے سے۔

استاد:- دنیا میں پانی کا سب سے بڑا ذخیرہ کہاں ہے؟

شاگرد:- سمندر میں۔

استاد:- ٹونٹی سے کچھ پانی لے لو۔ ہم نے یہ پانی لیا ہے، اس کا رنگ کیسا ہے؟

شاگرد:- بے رنگ ہے۔

استاد:- اچھا ایک بات بتاؤ جب گولی حرارت سے پھیل گئی تھی تو ہم نے اسے چھلے میں سے گذار کر معلوم کر لیا تھا کہ یہ پھیل گئی ہے۔ لیکن اگر یہ پانی بھی حرارت سے پھیلا تو اسے کیسے معلوم کریں گے؟

شاگرد:- جب پھیلنے لگے گا تو خود بخود نظر آ جائے گا۔

شاگرد ۲: واہ یہ بھی کوئی پاسی کرنے کا سوال ہے کہ پانی پھیلا تو جھاگ بھی اوپر اٹھنا شروع ہوئی اور جھاگ کو اوپر اٹھتا دیکھ کر معلوم کر لیا کہ پانی پھیل رہا ہے۔

استاد:- ہاں بھئی تم ٹھیک کہتے ہو اس میں کوئی جھاگ تو ہے نہیں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ دریا میں اگر پانی چڑھتا ہے تو اس کا پتہ کیسے چلتا ہے؟

شاگرد:- ماسٹر صاحب دریا کے کناروں سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ پہلے پانی کنارے سے بہت نیچا ہوتا ہے، جب پانی چڑھتا ہے تو آہستہ آہستہ اونچا ہونا شروع ہوتا ہے۔ آخر کار کناروں تک لبالب ہو جاتا ہے۔

شاگرد ۲:- ہمیں تو گھر میں بیٹھے بٹھائے ہی دریا کے چڑھنے کا پتہ چل جاتا ہے۔ ہمارے گھر کے قریب سے ایک نالا گزرتا ہے۔ جب زور کا پانی آتا ہے تو اس میں بھی پانی چڑھنا شروع ہو جاتا ہے، ہم تو وہیں سے اندازہ لگا لیتے ہیں۔

استاد:- بہت خوب بھئی تم نے اچھی ترکیب بتائی۔ اب ہم اس صراحی میں کچھ پانی لیتے ہیں تم اس کو اپنا دریا سمجھ لو۔ لیکن اس کے لیے ایک تالاب کیسے بنائیں جس میں پانی کے چڑھاؤ یعنی پھیلاؤ کا اندازہ لگ سکے۔

شاگرد:- ماسٹر صاحب اس کے منہ میں ایک شیشے کی نلی لگا دیں۔

استاد:- بھئی خوب ترکیب نکالی۔ ہم یہی کریں گے۔ جوں جوں صراحی کا پانی پھیلے گا تو یہ نلی کے پانی کو اوپر دھکیلتا جائے گا۔ ہم نلی میں پانی کی سطح یا لیول کا مشاہدہ کرتے رہیں گے۔

شاگرد ۲:- ماسٹر صاحب شیشے کی نلی میں پانی چڑھے گا تو اچھی طرح نظر نہیں آئے گا۔

شاگرد ۳:- ہم اس میں تھوڑا سا رنگ کیوں نہ ڈال لیں۔

استاد:- واہ بھئی یہ تو تم نے بہت ہی اچھا مشورہ دیا (استاد پانی میں پوٹاشیم پرمنگنیٹ کے تھوڑے سے دانے ڈال دیتا ہے جس سے سارا پانی رنگین ہو جاتا ہے) بھلا جانتے ہو یہ کیا چیز ہے؟

شاگرد:- جی ہاں یہ ایک سرخ رنگ کی دوائی ہے۔ جسے کنوؤں میں بھی ڈالا کرتے ہیں۔

استاد:- اچھا اب ہم نلی میں پانی کے لیول پر ایک نشان لگا دیتے ہیں اور اپنا تجربہ شروع

کرتے ہیں (استاد تجربہ کرتا ہے، ابھی پانی گرم ہو رہا ہے، اس دوران میں وہ بچوں کو بے کار بیٹھنے نہیں دیتا۔ وہ ان سے برابر کوئی نہ کوئی کام کی بات کرتا رہتا ہے)

استاد:- (سپرٹ لیمپ کی طرف اشارہ کر کے) یہ کیا ہے؟

شاگرد:- اسے سپرٹ لیمپ کہتے ہیں۔

استاد:- کیوں؟

شاگرد:- اس لیے کہ اس میں سپرٹ جلتی ہے۔

استاد:- کیا تم نے کبھی سپرٹ دیکھی ہے؟

شاگرد:- جی ہاں۔

استاد:- اچھا بھئی ذرا یہ تو بتاؤ کہ سپرٹ لیمپ کی بتی کو اس ڈھکنے سے بند کیوں رکھتے ہیں؟

شاگرد:- ماسٹر صاحب اگر بند نہ رکھیں تو ساری سپرٹ بتی کے ذریعے اوپر چڑھتی جائے گی اور ہوا میں اڑ جائے گی۔

استاد:- یہ کیسے؟

شاگرد:- ایک دفعہ میرے بھائی کی انگلی کٹ گئی تھی تو میں نے اس پر سپرٹ ڈالی تھی، بہت ٹھنڈی ٹھنڈی لگی۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اڑ گئی۔

استاد:- بھئی باتوں باتوں میں تم تجربے کو تو بھول ہی گئے۔ نلی پر لگایا ہوا نشان نہ بھول جانا۔ یہ دیکھو اب صراحی کو آنچ لگی۔

شاگرد:- ماسٹر صاحب یہ کیا ہوا۔ نلی کا پانی تو اوپر چڑھنے کی بجائے نیچے کو آرہا ہے۔

استاد:- ہاں ابھی اور آنچ لگنے دو اور برابر دیکھتے رہو۔

شاگرد:- لیجئے اب پانی کی سطح دوبارہ چڑھنا شروع ہوئی۔ اب تو ہمارے لگائے ہوئے نشان سے بھی آگے بڑھ گئی۔

(استاد اب سپرٹ لیمپ کو اٹھا لیتا ہے)

استاد :- دیکھو پانی کی سطح کو کیا ہو رہا ہے ؟
شاگرد :- اب تو یہ سطح چڑھنی بند ہو گئی ۔
استاد (کچھ وقفے کے بعد) اور اب ؟
شاگرد :- اب نیچے جا رہی ہے ۔
استاد :- اچھا اب یہ بتاؤ کہ جب پانی کی سطح اوپر چڑھ رہی تھی اس وقت پانی کی کیا حالت تھی ؟
شاگرد :- پانی پھیل رہا تھا ۔
استاد :- ہاں تو بات یہ ہے کہ جب کسی مایہ کو گرم کیا جاتا ہے تو وہ پھیلتا ہے اور جب اسے ٹھنڈا کرتے ہیں تب کیا کرتا ہے ؟
شاگرد :- سکڑنے لگتا ہے ۔
استاد :- بالکل ٹھیک ! ہاں تو ایک مائع کو جب گرم کیا جاتا ہے تو وہ پھیلتا ہے اور جب ٹھنڈا کرتے ہیں تو وہ سکڑتا ہے ۔ بھلا کوئی اور چیز بھی ایسا ہی کرتی ہے ؟
شاگرد :- جی ہاں ٹھوس اشیا کا بھی یہی حال ہے ۔
استاد :- اچھا اب یہ بتاؤ کہ اس تجربے میں ہم نے کن کن چیزوں کو حرارت پہونچائی تھی ؟
شاگرد :- ہم نے پانی کو گرم کیا تھا ۔
استاد :- کیا سپرٹ لیمپ کی حرارت محض پانی ہی کو پہونچی تھی ؟
شاگرد :- نہیں صراحی بھی تو اس کے ساتھ ساتھ گرم ہوئی تھی ۔
استاد :- اچھا تو سب سے پہلے حرارت کسے پہونچی ؟
شاگرد :- صراحی کو ۔
استاد :- پھر صراحی پر اس کا اثر کیا ہوا ہوگا ؟
شاگرد :- صراحی کا شیشہ بھی پھیلا ہوگا ۔
استاد :- جب صراحی پھیلی تو پانی کو کیا ہوا ہوگا ؟

اگرد:- شروع شروع میں پانی کی سطح نیچے چلی گئی -

ناد:- لیکن جب ہم اسے برابر گرم کرتے گئے تو ؟

اگرد:- تو حرارت پانی تک پہونچی۔ پانی پھیلنے لگا تو اس کی سطح بڑھنے لگی -

ناد:- اچھا اب ہم نے سپرٹ لیمپ ہٹا دیا اور پانی ٹھنڈا ہونا شروع ہوا تب کیا ہوگا ؟

اگرد:- پانی کی سطح گرنا شروع ہوگی -

استاد:- کیوں ؟

شاگرد:- پانی سکڑنا شروع ہوگا -

استاد:- اچھا اب یہ بتاؤ کہ جب کسی مائع کو گرم کرتے ہیں تو اسے کیا ہونے لگتا ہے ؟

شاگرد:- وہ پھیلتا ہے -

استاد:- اور جب اسے ٹھنڈا کیا جاتا ہے تو ؟

شاگرد:- تو یہ سکڑنے لگتا ہے -

استاد - ہاں تو ہمیں اب اس بات کا پتہ چلا ہے کہ جب مائع کو حرارت پہونچتی ہے تو وہ پھیلنے لگتا ہے اور جب ٹھنڈا ہونے لگتا ہے تو سکڑنے لگتا ہے - اب ذرا نلی میں پانی کو دوبارہ دیکھو پانی کی سطح گر رہی ہے یہ کیوں ؟

شاگرد:- اس لیے کہ پانی ٹھنڈا ہو رہا ہے -

(استاد مزید تجربہ کرتا ہے)

استاد:- اچھا یہی فرض کرو کہ ہم نے جو حرارت اس صراحی کو پہونچائی اس سے پانی کی سطح ایک انچ اوپر کو اٹھ گئی۔ اب اگر ہم اسے اس سے دوگنی حرارت پہونچا دیں تو پھر نلی میں پانی کی سطح کتنی بلند ہو جائے گی ؟

شاگرد:- دو انچ -

استاد:- اگر اس سے تگنی حرارت دی جائے ؟

شاگرد:- تگنی حرارت دی جائے تو پانی کی سطح تین انچ بلند ہوگی۔

استاد:- پہلی بار تو اس کی سطح ایک انچ بلند ہوئی، دوسری مرتبہ دو انچ، دوسری مرتبہ میں نے اسے کتنی حرارت پہونچائی؟

شاگرد:- دوگنی

استاد:- فرض کرو کہ پانی کی سطح تین انچ اونچی ہوگئی تو میں نے پہلی بار کے مقابلے میں اسے کتنی حرارت پہونچائی؟

شاگرد:- تگنی۔

استاد:- اچھا اگر میں تم سے پوچھوں کہ کمرے میں گرمی زیادہ ہے یا باہر تو کیسے بتاؤگے؟

شاگرد:- جہاں گرمی زیادہ ہوگی وہاں ہم کو بھی گرمی زیادہ لگے گی۔

استاد:- یہ تو محض اندازہ ہے۔ بھلا ماپ کر کیسے بتاؤگے؟

(ایک ہوشیار لڑکا) ہم تھرمامیٹر سے ماپیں گے۔

استاد:- بھئی تھرمامیٹر کہاں سے لاتے پھریں۔ یوں سمجھو کہ تمہارے پاس بس یہی تجربے کی چیزیں ہیں اور کچھ نہیں۔ انہی سے ماپ کر دکھاؤ۔

شاگرد:- تو بھی صراحی باہر لے جائیے پھر دیکھیے کہ پانی کی سطح کو کیا ہوتا ہے۔

استاد:- خوب اگر میں صراحی کو باہر لے جاؤں اور پانی کی سطح چڑھنی شروع ہو جائے تب؟

شاگرد:- باہر زیادہ گرمی ہوگی۔

استاد:- اور اگر سطح گرنے لگے۔

شاگرد:- تب یہاں کی نسبت باہر زیادہ سردی ہوگی۔

استاد:- اچھا اگر مجھے یہ معلوم کرنا ہو کہ فلاں جگہ اس کمرے سے زیادہ گرم ہے یا ٹھنڈی تو یہ بڑی صراحی اور اس کے ساتھ ہی ایک لمبی نالی لیے پھروں، نہ تو یہ ہاتھ میں سنبھالی جائے گی نہ جیب میں رکھی جائے گی، تب کیا کرنا چاہیے؟

شاگرد:- ماسٹر صاحب ایک دفعہ مجھے بخار کی شکایت ہوئی۔ والدہ نے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو کہنے لگیں اس کا جسم تو مارے بخار کے پھنک رہا ہے اس پر ابا جان نے کہا ذرا تھرمامیٹر لاؤ میں ناپ کر دیکھوں درجہ حرارت کیا ہے۔

استاد:- وہ کس قسم کا تھا؟

شاگرد:- یہ شیشے کی ایک نلی سی تھی جس کے نیچے ایک گولی تھی۔ گولی میں چمکتا ہوا پارہ بھرا تھا پہلے تو ابا نے اسے خوب جھٹکا۔ پھر مجھے دکھایا تو سارے کا سارا پارہ گولی میں آ گیا تھا۔ اس کے بعد اس پارہ کی گولی کو میرے منہ میں رکھ دیا۔ کچھ دیر کے بعد جو نکالا تو دیکھا کہ پارے کی ایک لکیر اوپر کو چڑھ گئی تھی۔

استاد:- واہ بھئی تم نے تو تھرمامیٹر کا حال خوب بیان کیا۔ بس ہماری اس صراحی کو بھی تھرمامیٹر ہی سمجھ لو۔

شاگرد:- لیکن ماسٹر صاحب اتنا فرق ضرور ہے کہ یہ بڑی ہے اور تھرمامیٹر چھوٹا ہوتا ہے۔

استاد:- اور کیا فرق ہے؟

شاگرد:- جناب صراحی میں پانی بھرا ہے اور تھرمامیٹر میں پارہ ہوتا ہے۔

استاد:- مگر بھئی اس میں تھرمامیٹر کی گولی کہاں ہے؟

شاگرد:- ماسٹر صاحب اس صراحی کو تھرمامیٹر کی گولی سمجھ لیجیے۔ اُس میں پارہ بھرا ہوتا ہے۔ اس میں پانی ہے۔

استاد:- اور تھرمامیٹر کی نلی؟

شاگرد:- یہ شیشے کی وہ نلی ہے جس میں رنگدار پانی کی سطح چڑھتی اور اترتی ہے

استاد:- تو پھر تھرمامیٹر میں کونسی مائع ہے؟

شاگرد:- پارہ۔

اس کی گولی کو جب منہ میں رکھتے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟

شاگرد :- پارہ پھیلتا ہے -

استاد :- پھر کیا ہوتا ہے ؟

شاگرد :- پارہ پھیل کر اوپر کو چڑھتا ہے۔ اور نلی میں پارے کی سطح اونچی ہوتی جاتی ہے

استاد :- اگر اسے ٹھنڈا کیا جائے ؟

شاگرد :- تو پارے کی سطح نیچے ہوتی جاتی ہے

استاد :- اب بتاؤ کہ تھرمامیٹر کس اصول پر بنایا گیا ہے -

شاگرد :- مائع حرارت پانے پر پھیلتے ہیں ، اور ٹھنڈا ہوتے پر سکڑتے ہیں -

سب لڑکے :- ماسٹر صاحب آج آپ نے ہمیں خوب خوب باتیں بتائیں۔ ہمارے دادا تو ایک دن کہنے لگے کہ بھئی تھرمامیٹر کو منہ میں نہ ڈالنا ورنہ زہر چڑھ جائے گا۔ مجھے تو آج معلوم ہوا کہ یہ تو بڑے کام کی چیز ہے -

استاد :- ہاں بھئی اگر ہمارے ساتھ پڑھتے رہوگے تو اور بھی کام کی بہت سی باتیں سنتے رہوگے ؛

امریکہ میں اعلیٰ تعلیم اور غیر ملکی طلبہ

مسلسل ع ۳

شاہد اشرف

یونی ورسٹی

امریکی یونی ورسٹی اپنی ساخت اور تنظیم میں کالج کے مقابلہ میں بہت زیادہ پیچیدہ اور وسیع ہے، اس میں ایک آرٹس کالج بھی ہوتا ہے۔ قانون، طب، دینیات وغیرہ کے پیشہ ورانہ اسکول بھی اور ایک گریجوایٹ اسکول بھی جو بی۔ اے سے آگے اعلیٰ تر تحقیق و مطالعہ کا کام انجام دیتا ہے جو باتیں کالج کی زندگی کے متعلق کہی گئی ہیں وہ سب کی سب زیادہ وسیع پیمانے پر یونی ورسٹی کی زندگی کے متعلق بھی درست ہیں۔

جدید یونی ورسٹیاں بیش از بیش اس کوشش میں ہیں کہ عوام کے ساتھ روابط قائم رکھیں، اس غرض کے لیے انہوں نے مندرجہ ذیل ذرائع اختیار کیے ہیں:۔

(۱) انہوں نے اپنے نصابوں کو وسیع کیا ہے۔ انہوں نے بعض خاص نصاب جاری کیے ہیں۔ مثلاً بین الاقوامی مراسم۔ لائبریری سائنس اور دوا سازی وغیرہ۔

(۲) انہوں نے اپنے کتب خانوں اور تجربہ گاہوں کو خوب وسعت دی ہے۔

(۳) انہوں نے توسیعی خدمات کا جال پھیلا کر دیہاتوں اور دور دور کے قصبوں تک اپنی خدمات پہونچائی ہیں، وہ دن بدن ساری آبادی کے رنگارنگ تعلیمی مفاد کی نگہداشت اور ترقی کا ذریعہ ثابت ہو رہی ہیں، اب وہ محض ایک محدود طبقے کو ثقافتی پس منظر اور پیشہ ورانہ تربیت بہم پہونچانے کا ذریعہ نہیں۔

جدید یونی ورسٹی کا اہم ترین کام یہ ہے کہ انسانی سعی کے ہر میدان میں تحقیقاتی کام کو جاری رکھے، اس کے بیش قیمت علمی وسائل اور اس کے استادوں کی خصوصی مہارت اس کام کو

سہل بناتی ہے۔ نئی تحقیق اور اس کی تکنیکوں میں تربیت دینے کے کام میں آج حکومت تعلیمی اوقاف اور صنعت سب کے سب یونی ورسٹی کے ساتھ گہرا تعاون کرتے ہیں۔ انسانی علوم کے متعلق سارا تحقیقاتی کام زیادہ یونی ورسٹیوں کے ہاتھ میں ہے، اگرچہ وہ اسی مطلب کے لیے پرائیویٹ مالی مدد سے بھی کام لیتی ہیں۔ کتابچوں اور رسالوں کی اشاعت کے ذریعہ وہ اپنی تحقیقات کے نتائج سے عوام کو آگاہ رکھتی ہیں، یونی ورسٹیاں اپنے گریجوایٹ طلبہ کو تحقیقاتی کام کے لیے خاص مالی مدد اور وظیفے دیتی ہیں۔ اس قسم کی مالی امداد ریاستوں، مرکزی حکومت اور تعلیمی اوقاف کی طرف سے بھی دی جاتی ہے۔

گریجوایٹ اسکول

جس چیز کو آج کل گریجوایٹ مطالعہ کہا جاتا ہے اس کی ابتدا انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوئی۔ نوآبادیاتی دور میں بعض کالج ایم۔ اے کی ڈگری بھی دیا کرتے تھے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ تعلیم آرٹس کالج ہی کی توسیع کا درجہ رکھتی تھی، اگر کوئی طالب علم کتابی مطالعہ کی جگہ تحقیقاتی مطالعہ کرنا چاہتا تو اس کے لیے نصاب میں کوئی گنجائش نہ تھی، انیسویں صدی کے نصف آخر میں بعض ماہرین تعلیم نے جرمن یونی ورسٹی کے طریق کار سے متاثر ہوکر یہ مطالبہ کیا کہ یونی ورسٹی کو کالج کی تعلیم سے ایک قدم آگے بڑھ کر تحقیقاتی کام کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اس وقت سے یونی ورسٹیوں کے گریجوایٹ شعبوں میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔

گریجوایٹ سطح پر کام کرنے والے طلبہ کی تعداد میں جو حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے استادوں کے تعلیمی معیار میں نمایاں ترقی ہوئی ہے، پہلے یہ کیفیت تھی کہ مدرسوں میں پڑھانے کے لیے بی۔ اے کی ڈگری کافی سمجھی جاتی تھی اور کالج کے استاد کے لیے ایم۔ اے ہونا کافی تھا۔ لیکن پچھلے بیس سالوں میں اکثر مدرسوں میں استاد کے لیے کم سے کم ایم۔ اے ہونا ضروری قرار دیا جا چکا ہے، جبکہ یونی ورسٹی کے استاد کے لیے کم سے کم پی۔ ایچ۔ ڈی ہونا ضروری سمجھا گیا ہے، اسی طرح سرکاری عہدوں، پرائیویٹ

لازمتوں اور علمی پیشوں میں داخل ہونے کے لیے بھی اعلیٰ تر تعلیمی معیار لازمی ہو جانے سے گریجوایٹ طلبہ کی تعداد میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔ پبلک زندگی میں داخل ہونے والی عورتوں کے لیے بھی اعلیٰ تر علمی قابلیت کا مطالبہ ہونے لگا ہے۔ سن ۱۸۹۰ء میں ریاستہائے متحدہ میں گریجوایٹ طلبہ کی کل تعداد صرف دو ہزار تھی، آج یہ تعداد ساٹھ ہزار ہے۔

یونی ورسٹیوں کے اعلیٰ نصاب مختلف اقسام کے ہیں۔ گریجوایٹ تدریس میں مختلف تدریسی طریقے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً لیکچر۔ استاد کی زیر نگرانی مطالعہ اور اپنے طور پر تحقیقاتی مطالعہ مخصوص پیشوں۔ مثلاً قانون اور طب میں گریجوایٹ نصاب کو مختلف حصوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ جو بنیادی علم کو کئی سالوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ لیکن سائنسوں۔ علم ادب اور معاشرتی علوم میں جو تربیت دی جاتی ہے اس کی نوعیت زیادہ انفرادی قسم کی ہے۔ پیشہ ورانہ اور تحقیقاتی نصابوں کے علاوہ ایسے لوگوں کے لیے زیادہ عام قسم کے نصاب بھی موجود ہیں جن کو تعلیمی یا ادبی کام کرنا ہو یا سرکاری ملازمت اختیار کرنا ہو، یہ لوگ ایک سے زائد شعبوں میں تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ عام گریجوایٹ ڈگریاں یہ ہیں:- ایم۔ اے (آرٹس) ایم۔ ایس (سائنس) اور پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پیشہ ورانہ تعلیم میں اعلیٰ ڈگریاں یہ ہیں:- ایم۔ ڈی (طب) ایل ایل ڈی (قانون) ایم۔ اے

کالج اور یونی ورسٹیاں جن گریجوایٹ ڈگریوں کے نصاب پیش کرتی ہیں، ان سب میں ایم اے کے مقاصد زیادہ غیر واضح ہیں۔ مثلاً جو شخص صحافت کے لیے یا کسی سرکاری ملازمت کے لیے یہ نصاب اختیار کر رہا ہے، اسے ایک وسیع پس منظر کی ضرورت ہوگی جو کئی علوم سے تعارف پیدا کرنے ہی سے حاصل ہو سکے گا، اس کے مقابلے میں ایک اور طالب علم بھی ہو سکتا ہے جو علم کی کسی خاص شاخ میں گہری تربیت کی ضرورت رکھتا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایم۔ اے کے نصاب میں پوری لچک رکھی گئی ہے۔ یونی ورسٹیاں کوشش یہ کرتی ہیں کہ یہ نصاب ایسا ہو جو ہر قسم کی ضرورت کو پورا کر سکے۔

ایم۔ اے کے لیے اکثر یونی ورسٹیوں کی طرف سے ضروری شرط یہ ہے کہ ایک سال تک پڑھائی کی جائے اور پورا نصاب ختم کیا جائے، بعض کالج اور یونی ورسٹیاں ایم۔ اے کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی پہلی منزل قرار دیتی ہیں، لیکن بعض ایسا نہیں کرتیں، اس نصاب کے لیے عام یونی ورسٹیاں ایک غیر ملکی زبان کے علم کو ضروری شرط قرار نہیں دیتیں، اگرچہ بعض یونی ورسٹیاں کم از کم ایک غیر ملکی زبان کا جاننا لازمی قرار دیتی ہیں، جہاں نصاب میں تحقیقاتی کام بھی شامل ہو وہاں جرمن یا فرانسیسی زبان کے علم پر زور دیا جاتا ہے، ہر مضمون میں امتحان پاس کرنا لازمی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سارے نصاب پر حاوی ایک جامع امتحان بھی دینا پڑتا ہے، کئی ادارے مقالے کی تیاری کے لیے حقیقی تحقیقاتی کام کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ تاکہ مواد کے تجزیہ اور اس کی تنظیم میں مہارت پیدا ہو جائے۔ تاہم یہ تحقیقاتی کام کلی طور پر لازمی نہیں۔

پی۔ ایچ۔ ڈی۔

چوں کہ امریکی یونی ورسٹیاں تحقیقاتی کام پر خاص زور دیتی ہیں اس لیے ان کی سب سے اہم ڈگری پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہے۔ اس کے لیے بی۔ اے کرنے کے بعد کم سے کم پورے تین سال صرف کرنے پڑتے ہیں گویا ایم۔ اے کے بعد دو سال اور۔ ایک لازمی شرط یہ بھی ہے کہ یونی ورسٹی میں کم سے کم ایک سال تک قیام رہے۔ ہر ایم۔ اے پاس کو بلا تخصیص پی۔ ایچ۔ ڈی کی جماعت میں داخل نہیں کر لیا جاتا۔ ایک عام شرط یہ ہے کہ امیدوار کم سے کم دو غیر ملکی زبانوں کو پڑھنا جانتا ہو اس کے علاوہ امیدوار کو اپنے خصوصی مطالعہ کے مضمون میں ایک امتحان پاس کرنا پڑتا ہے اور ساتھ ہی دو عام نوعیت کے تحریری اور تقریری امتحانوں میں سے گزرنا پڑتا ہے، پی۔ ایچ۔ ڈی کے نصاب کا سب سے اہم حصہ وہ علمی مقالہ ہے جو خالص تحقیقاتی کام کی پیداوار ہونا چاہیے بعض ادارے یہ مطالبہ بھی کرتے ہیں کہ یہ مقالہ شائع کیا جائے۔

غرض پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے امیدوار کے لیے ضروری ہے کہ اپنے مضمون کے متعلق خوب وسیع واقفیت حاصل کرے، اس کے کسی خاص پہلو کے متعلق خصوصیت کے ساتھ

گہرا مطالعہ کرے، اور تحقیقاتی کام میں خوب مہارت حاصل کرے۔ اعلیٰ نصاب اور اسے مضمون کا وسیع علم عطا کرتے ہیں اور تحقیقاتی کام کی بدولت خصوصی مہارت حاصل ہوتی ہے

پیشہ ورانہ تعلیم

ریاست ہائے متحدہ میں پیشہ ورانہ تعلیم یونیورسٹی کا کام ہے، اگرچہ استادوں کی تعلیم موسیقی، آرٹ اور قانون کے لیے علٰحدہ کالج بھی ہیں جو سرکاری خرچ پر چل رہے ہیں۔ پیشہ ورانہ تعلیم کے معیار خود پیشہ ور لوگوں کی انجمنیں اور تنظیمیں مقرر کرتی ہیں۔ پیشے تعداد میں بہت ہیں۔ اس لیے ان کے نصاب بھی متعدد ہیں، یہاں یہ ممکن نہیں کہ ان سب نصابوں کی تفصیلیں دی جائیں۔

عام صورت یہ ہے کہ طب۔ دندان سازی۔ دینیات اور قانون کے اعلیٰ ادارے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ امیدواروں نے داخلہ سے پہلے آرٹس کالج میں کم سے کم دو سال تک تمہیدی تعلیم حاصل کی ہو۔ اکثر ہوتا یوں ہے کہ بہت سے طلبہ ان پیشہ ورانہ نصابوں کا رخ کرنے سے پہلے بی۔ اے پاس کر لیتے ہیں بعض پیشہ ورانہ تعلیم گاہوں نے داخلہ کی شرط ہی بی اے پاس ہونا قرار دے دیا ہے، طب اور دندان سازی میں پیشہ ورانہ نصاب کی مدت چار سال ہے۔ طب میں ایک اور سال داخلی مشق کے لیے بھی لگانا پڑتا ہے۔ قانون اور دینیات کے نصاب عموماً سہ سالہ ہیں۔

ابتدائی اور ثانوی تعلیم، انجینیرنگ۔ زراعت۔ جنگلات۔ خانگی معاشیات، دواسازی اور دوسرے مخصوص اور ٹیکنیکل مضامین کے نصاب ثانوی مدرسہ کے بعد چار سال کی تعلیم کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان نصابوں کے لیے عموماً یہ بھی ضروری ہے کہ پہلے آرٹس کالج میں تعلیم پائی جائے چناں چہ یہ نصاب پیش کرنے والے ادارے اپنے خصوصی نصابوں کے ہمراہ انسانی علوم کا کچھ نصاب بھی شامل کر لیتے ہیں۔ اب رجحان یہ ہو رہا ہے کہ ابتدائی اور ثانوی اساتذہ اور انجینیرنگ کے نصابوں کو ثانوی تعلیم کے بعد پانچ سالوں کی مدت میں پھیلا دیا جائے۔

امریکی تعلیمی اداروں میں غیر ملکی طلبہ

امریکی کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں مدتوں سے غیر ملکی طلبہ آتے رہے ہیں اور انہ
خوش آمدید کہا جاتا رہا ہے لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد ان کی تعداد دوچند ہو گئی ہے د
ہر جگہ یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ سیاسی تعلقات زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ بین الاق
تلخی کی شدت کو کم کر دیں، اس لیے قوموں کے درمیان بہتر فہم اور زیادہ گہرے مراسم پیدا کر
کے لیے دوسرے طریقے تلاش کرنے چاہئیں، تاکہ جنگ کے اسباب مٹ جائیں اور عالمی تعاون ک
راستہ صاف ہو جائے، امریکی کالجوں اور یونی ورسٹیوں نے اپنی حکومت کی تائید اور بین الاقوا
تعلیم کی انسٹی ٹیوٹ کی قسم کے اداروں کی مدد سے کوشش کی ہے کہ مختلف ملکوں کے ساتھ طل
تبادلہ ہو اور لگاتار ایسے ذرائع تلاش کیے جائیں جو زیادہ سے زیادہ طلبہ کو امریکہ آنے کی ترغیب
دیں۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ پر اقوام متحدہ کے مختلف شعبوں نے جو ترقی کی ہے اور ام
تعلیم نے اپنے معیاروں کو جس طرح بلند کیا ہے اس سے بھی اس تحریک کو بڑی مدد ملی ہے۔

کسی غیر ملک میں تعلیم حاصل کرنے سے کئی فائدے میسر آتے ہیں۔ طالب علم دنیا کو دیکھتا ہے
ایک غیر قوم میں رہ کر اس کی زبان بولنا سیکھتا ہے، اس کے اخلاق و عادات کا مطالعہ کرتا ہے اس کا
پیشہ ورانہ علم اور ذہنی افق وسیع ہوتا ہے اور وہ کئی نئے دوست بناتا ہے جس کالج میں غیر ملکی
طلبہ پڑھتے ہیں اسے بھی فائدہ پہنچتا ہے، دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ پر جو امریکی طلبہ جنگی
محاذوں سے واپس لوٹ کر پھر کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں آئے، ان کی بدولت ان اداروں
میں ایک خاص قسم کی متانت اور پختگی آ گئی تھی، بالکل اسی قسم کا فائدہ غیر ملکی طلبہ کی موجودگی
سے حاصل ہوتا ہے، ان کی موجودگی غیر ملکی مراسم کا احساس پیدا کرتی ہے، ان کا اثر صرف
کالج یا یونی ورسٹی کے رقبہ تک محدود نہیں رہتا بلکہ مقامی آبادی تک پہنچتا ہے۔ جب غیر ملکی
طلبہ اپنے ملکوں کو واپس جاتے ہیں تو ریاست ہائے متحدہ کے متعلق صحیح معلومات پھیلانے کا
ذریعہ بنتے ہیں۔ اس دو طرفہ فائدہ کی طرف بے شمار دفعہ اشارہ کیا جا چکا ہے، مثال کے طور پر

آسٹریا سے آئے ہوئے ایک طالب علم نے یہ الفاظ لکھے تھے ۔

میں ریاست ہائے متحدہ کے مسائل کا جس قدر مطالعہ کرتا ہوں اتنا ہی انہیں الجھا ہوا پاتا ہوں مجھے اس ملک کے درمیانے طبقہ کی قوت کو دیکھ کر حیرت ہوئی ، اسی طرح کنبے کی زندگی ، اور گرجے کو جو اثر حاصل ہے وہ بھی کم حیران کن نہیں ، اس ملک کے وسائل حیرت انگیز طور پر تروتازہ اور ناقابل اختتام نظر آتے ہیں ، میں یہ علمی منصوبہ تیار کر رہا ہوں کہ یورپ میں امریکہ کے متعلق بے خبری کو کس طرح دور کیا جائے اور دونوں براعظموں کے درمیان غیر جانب دارانہ مراسم کو کس طرح بہتر بنایا جائے ۔

انگلستان سے مناظر طلبہ کی ایک جماعت امریکہ میں آئی تھی ، اس کے متعلق عام امریکی تاثر یہ تھا : وہ بہت پیارے مہمان تھے ، ان کی آمد نے مقامی آبادی کے دلوں میں انگلستان اور آکسفورڈ کے متعلق دوستانہ جذبات پیدا کر دیے ۔

غیر ملکی طلبہ امریکہ میں کئی قسم کے اسباب کے ماتحت آتے ہیں بعض بہتر ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں ، بعض امریکی قوم کو قریب سے دیکھنے کے لیے آتے ہیں ان کے آنے کی غرض کچھ بھی ہو ، ان کی رپورٹیں اس امر کی مظہر ہیں کہ وہ جس مطلب کے لیے آئے تھے وہ پورا ہو گیا ، اس کا یہ مطلب نہیں کہ امریکہ میں ہر چیز سہل ہے ، ایک غیر ملکی طالب علم نے اس ضمن میں اپنے خیالات یوں ظاہر کیے ہیں : -

"میں سب سے زیادہ اس بات سے متاثر ہوا ہوں کہ طلبہ کو ہر اس چیز کو دیکھنے اور سمجھنے کی سہولت دی جاتی ہے جو وہ دیکھنا چاہیں طالب علم جس زاویۂ نگاہ سے چاہے اسے دیکھے اور امریکی زندگی کے متعلق بے لاگ ذاتی رائے قائم کرے ، میرے خیال میں صحیح جمہوریت یہی ہے"

دنیا کے مختلف ملکوں سے آنے والے طلبہ بدیہی طور پر واضح اسباب کی بنا پر امریکہ میں آتے ہیں ، دنیا کے کم ترقی یافتہ ملکوں مثلاً مشرق وسطیٰ ، افریقہ اور ایشیا سے زیادہ تر ایسے طلبہ آتے ہیں جو ٹیکنیکل اور فنی میدانوں میں تربیت حاصل کر کے ملکی معیشت کی تعمیر میں حصہ

لینا چاہتے ہیں مثلاً ترکی۔ اسرائیل اور برصغیر پاک وہند سے آنے والے طلبہ میں ایک تہائی سے نصف تک ایسے ہوتے ہیں جو انجینئرنگ اور اس سے متعلقہ علوم کے مطالعہ کے لیے آتے ہیں دوسرے ملکوں سے آنے والے طلبہ کی اکثریت معاشرتی علوم اور وسیع المشرب فنون کے مطالعہ کے لیے آتی ہے، اس لیے ان کی آمد کے اسباب بھی اتنے ہی مختلف ہوتے ہیں جتنے ان کے اختیار کردہ نصاب۔ مثلاً ہارورڈ میں پڑھنے والے ایک فرانسیسی طالب علم سے جب پوچھا گیا کہ تم امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کیوں آئے تو اس نے کہا:- "میں نہیں سمجھتا کہ میرے لیے اس امر کی وجہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ میں نے اس جگہ پڑھائی جاری رکھنا کیوں پسند کیا جہاں مارشل پلان تیار ہوکر دنیا کے سامنے جلوہ گر ہوئی۔"

اس کے مقابلہ میں ایک برطانوی طالب علم نے جس کا مخصوص مضمون جنگلات تھا یہ خیالات ظاہر کیے:- میں نے ریاست ہائے متحدہ میں آنا اس لیے پسند کیا کہ یہاں مجھے زبان کی سہولت تھی، دوسری وجہ یہ ہے کہ انگلستان جنگلات کو از سرِنو وجود میں لانے کے لیے جس منصوبے کو عملی شکل دے رہا ہے اس کے ماتحت ایسے درخت لگائے جا رہے ہیں جن کا اصل وطن بحرالکاہل کا شمال مغربی ساحل ہے۔

سنہ ۱۹۵۱-۵۲ء کے اعداد و شمار کے مطابق امریکی یونیورسٹیوں میں تیس ہزار چار سو غیر ملکی طلبہ تعلیم پا رہے تھے۔ اس تعداد میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے، یہ طلبہ ۱۲۶ مختلف ملکوں اور علاقوں سے آئے تھے، ان میں کناڈا اور میکسیکو جیسے ہمسایہ ملکوں کے طلبہ بھی شامل تھے اور ن لینڈ۔ لبنان۔ یوگنڈا، اور ہند چینی جیسے دور دراز کے ملکوں کے طلبہ بھی، حسب معمول سب سے زیادہ طلبہ کناڈا سے آئے تھے، تعداد کے لحاظ سے دوسرا درجہ چین کو حاصل تھا تیسرا جرمنی کو۔ چوتھا میکسیکو کو اور پانچواں جاپان کو۔

پچھلے پندرہ سولہ سال کے عرصے میں دنیا کے مختلف حصوں سے آنے والے طلبہ کی تعداد میں بیشی ہوتی رہی ہے، اس امر کی کئی ایک وجوہ ہیں، طلبہ کو امریکہ میں بھیجنے کے لیے ڈالر

چاہئیں۔ مبادلہ کی مشکلات بعض اوقات طلبہ کے راستے میں ناقابل عبور رکاوٹ بن جاتی ہیں۔
دوسری عالمی جنگ کے بعد جو آزاد ملک آہنی پردہ کے پیچھے جا چھپے ان کے طلبہ کا آنا خواہ مخواہ
بند ہو گیا۔ حالیہ سالوں میں مشرق بعید، دوسرے ایشیائی ملکوں اور افریقہ کو امریکہ کے ساتھ جو
دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ دنیا کے ان خطوں سے زیادہ طلبہ امریکہ
آنے لگے ہیں، دوسری عالمی جنگ کے عرصہ میں مغربی نصف کرہ کے طلبہ کل غیر ملکی طلبہ کے نصف کے
برابر تھے۔ اب ان کا تناسب ایک تہائی رہ گیا ہے کیونکہ دوسرے ملکوں سے زیادہ طلبہ آنے
لگے ہیں۔ براعظم وار آج بھی سب سے زیادہ طلبہ نئی دنیا سے آتے ہیں، اس سے دوسرے
درجہ پر ایشیا سے، تیسرے درجہ پر یورپ سے اور چوتھے درجہ پر افریقہ سے۔

داخلہ کی تیاری

پاکستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے درمیان سیاسی یگانگت کے جو مراسم قائم ہو چکے ہیں
ان کے باعث زیادہ سے زیادہ پاکستانی طلبہ اب امریکی یونیورسٹیوں کا رخ کر رہے ہیں، اس
ضمن میں طالب علم کو اچھی سوجھ بوجھ کے ساتھ قدم اٹھانا چاہیے، دوسری تفصیلیں طے کرنے
سے پہلے طالب علم کو یہ قطعی طور پر طے کر لینا چاہیے کہ وہ کس کالج یا یونیورسٹی میں داخل ہونا
چاہتا ہے محض کسی مشہور یونیورسٹی کے نام کی کشش سے یا اس خیال سے کہ فلاں یونیورسٹی
میں بہت سے پاکستانی طلبہ پہلے سے موجود ہیں، کسی یونیورسٹی کا انتخاب کر لینا بعد میں ناموزوں
ثابت ہو سکتا ہے، یونیورسٹی یا کالج کے انتخاب میں اہم ترین چیز جس کا جاننا ضروری ہے
یہ ہے کہ کونسا تعلیمی ادارہ میرے مخصوص مقاصد کو پورا کرے گا، اس غرض کے لیے امریکی مرکز
اطلاعات یا دوسرے متعلقہ ذرائع کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اور اگر کسی وجہ سے کوئی بات اس طرح
واضح نہ ہو سکے تو اس کے متعلق ریاست ہائے متحدہ کو لکھنا چاہیے، جو لوگ ریاست ہائے متحدہ میں
تعلیم حاصل کر چکے ہوں وہ بھی مفید مشورہ دے سکتے ہیں لیکن یہ لوگ عموماً اس ادارے کی زیادہ
سفارش کریں گے جس میں وہ خود پڑھتے تھے، اس لیے بہتر ہے کہ ان کے مشورے ہی پر سارا بھروسہ

نہ کیا جائے۔ نیو یارک میں قائم شدہ انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل ایجوکیشن ہر اس طالب علم کی رہنمائی کے لیے تیار ہے جو اس سے رجوع کرے۔

جو طلبہ انڈر گریجوایٹ درجہ پر تعلیم کے لیے جانا چاہیں ان کے لیے اعلیٰ تعلیمی ادارے کا انتخاب کوئی دشواری پیش نہیں کرتا، کیوں کہ تمام امریکی کالج اور یونی ورسٹیاں بی۔ اے اور بی ایس سی کے متنوع نصاب پیش کرتے ہیں۔ لیکن گریجوایٹ تعلیم اور خصوصی فنی اور ٹیکنیکل تعلیم کے معاملہ میں انتخاب ہوشیاری کے ساتھ کرنا چاہیے بعض لوگ اس غلط فہمی میں ہیں کہ امریکی یونی ورسٹیوں کے معیار نسبتاً پست ہیں، اس لیے وہاں سے ڈگری حاصل کر لینا چنداں مشکل نہیں، یہ خیال درست نہیں امریکی یونی ورسٹیاں دن بدن اپنے معیار بلند تر کیے جا رہی ہیں، ایک اور عام غلط فہمی یہ ہے کہ امریکہ میں معمولی کوشش سے اس قدر کما لینا آسان ہے جس سے تعلیمی اخراجات پورے ہو جائیں اس لیے پڑھائی کے مالی پہلو کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں یہ خیال بھی پوری طرح درست نہیں غیر ملکی طلبہ کو کام کرنے کی وہ سہولتیں حاصل ہیں جو امریکی طلبہ کو میسر ہیں، دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں وہاں زندگی بہت گراں ہے، اس لیے ڈالروں کا تسلی بخش انتظام کیے بغیر گھر سے چل دینا کسی طرح قرین مصلحت نہیں۔

ہر امریکی کالج اور یونی ورسٹی سال بسال ایک کتابچہ شائع کرتی ہے، اس میں پیش کردہ نصابوں کی تفصیل کے علاوہ فیس، اور دوسرے اخراجات کا تخمینہ بھی درج ہوتا ہے، ان کتابوں کو دیکھ کر یہ فیصلہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ کون تعلیمی ادارہ سب سے زیادہ حسب حال رہے گا یہ فیصلہ کر لینے کے بعد ریاست ہائے متحدہ کے قونصل خانہ سے معلوم کر لینا چاہیے کہ آیا یہ ادارہ اٹارنی جنرل کی فہرست پر موجود ہے، طالب علم کو امریکی قونصل خانہ کی طرف سے ویزا اسی صورت میں ملے گا جب منتخب کردہ تعلیمی ادارے کا نام اس سرکاری فہرست پر ہو۔

غیر ملکوں سے آنے والے طلبہ کا گذشتہ سالوں میں عام رجحان مشرق کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں کی طرف رہا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نیو یارک، بوسٹن اور دوسرے بڑے بڑے مشرقی شہروں میں

غیر ملکی طلبہ کا جا ؤ رہا، امریکہ میں اعلیٰ تعلیمی اداروں کی تعداد سینکڑوں کو پہونچتی ہے مشرق کی یونی ورسٹیاں بے شک زیادہ پرانی ہیں، ان کے تعلیمی معیار گو عام طور پر اونچے ہیں لیکن ہر یونیورسٹی کی خاص شہرت صرف دو ایک شعبوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اگر بعض شعبوں میں مشرقی یونی ورسٹیوں نے نام پیدا کیا ہے تو ملک کے دوسرے علاقوں میں واقع یونی ورسٹیوں نے ان سے مختلف شعبوں میں امتیازی مقام حاصل کر رکھا ہے، ایسا تعلیمی ادارہ کوئی نہیں ملے گا جو تمام علمی شعبوں میں چوٹی پر ہو۔

مشہور یونی ورسٹیوں کے متعلق ایک اور بات بھی سمجھنے کے قابل ہے، ان کی شہرت کا مدار ان کے شہرۂ آفاق پروفیسروں پر ہے لیکن ان استادوں کو ایسی پر ہجوم جماعتوں کو پڑھانا پڑتا ہے اور ان کے دوسرے مشاغل اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ غیر ملکی طلبہ کو ان سے زیادہ توجہ حاصل کرنے کی توقع نہ کرنی چاہیے، اس کے مقابلہ میں اگر وہ کسی چھوٹی یونی ورسٹی میں چلے جائیں جہاں امریکی طلبہ کی زیادہ بھیڑ نہ ہو تو یقینی طور پر انہیں بہت زیادہ توجہ ملے گی۔ تمام استاد ان کی خاطر داری کے لیے کوشاں نظر آئیں گے۔ اور مقامی آبادی بھی ان میں زیادہ دلچسپی لے گی، ایسی یونی ورسٹی میں جانے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ یہاں مالی مدد اور وظائف کے امکانات نسبتاً زیادہ ہوں گے، امریکہ میں کئی اعلیٰ تعلیمی ادارے ایسے ہیں جن میں غیر ملکی طلبہ کے لیے وظائف موجود ہوتے ہیں لیکن ان سے فائدہ اٹھانے والا کوئی نہیں آتا، کالج اور یونی ورسٹی کے انتخاب سے پہلے ان تمام امکانات کو اچھی طرح دیکھ لینا چاہیے۔

ان تمام باتوں کا فیصلہ داخلے سے کوئی سال بھر پہلے ہونا چاہیے اور پسند کردہ کالج یا یونی ورسٹی کو کم سے کم آٹھ دس مہینے پہلے داخلہ کی درخواست بھیج دینی چاہیے کیونکہ یہ ادارہ فیصلہ کرنے کے لیے وقت لے گا، اگر کسی وجہ سے وہ درخواست نامنظور کر دے تو اتنا وقت باقی ہونا چاہیے کہ کسی دوسرے ادارے کو لکھا جا سکے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ایک اداروں کو چن کر ان سب کو بیک وقت درخواستیں بھیج دی جائیں اور ان کے جواب موصول ہونے پر پہلی پسند کے ادارے میں داخلہ لے لیا جائے۔

داخلے کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ تعلیمی ادارے سے درخواست کا مطبوعہ فارم طلب کیا جائے۔ داخلے کی درخواست منظور ہونے پر ادارہ خود بخود یہ فارم بھیجا کرتا ہے، اس فارم کو پُر کر کے اس کے ساتھ اپنی سابقہ تعلیمی قابلیت کے مصدقہ کوائف لگانے چاہئیں۔ یہ سندوں کی مصدقہ نقلیں ہوں گی، ساتھ ہی یونی ورسٹی کیلنڈر کا وہ حصہ بھی منسلک کر دینا چاہیے جو ختم کردہ تعلیمی نصاب کی تفصیلوں کی خبر دیتا ہے، سابقہ کالج اور یونی ورسٹی کے کسی ذمہ دار آدمی کی ایک چٹھی بھی ضروری ہے جو طالب علم کے تعلیمی کام کی خوبی کو ظاہر کرتی ہو، فارم داخلہ پر امیدوار کا فوٹو چسپاں ہونا چاہیے صحت کا سرٹیفکیٹ بھی فارم داخلہ کے ساتھ ہونا ضروری ہے، اگر یہ تمام کاغذات مطلوبہ صورت میں بھیج دیے جائیں تو تعلیمی ادارے کے دفتر داخلہ کی طرف سے داخلہ کی منظوری کی اطلاع تین تصدیقی سندوں کی صورت میں موصول ہو جائے گی، ان میں سے ایک امریکی قونصل کو بھیجنا ہو گی جس سے ویزا حاصل کیا جائے گا، دوسری ویزا کے ساتھ لگے گی اور تیسری نقل طالب علم کے پاس رہے گی۔

اخراجات کا تخمینہ

روانگی سے پہلے طالب علم کو یہ تعین کر لینا چاہیے کہ اس نے قیام امریکہ کے لیے تسلی بخش مالی انتظامات کر لیے ہیں۔ غیر ملکی طلبہ کو زرمبادلہ کی دقتوں کے باعث عموماً زیادہ روپیہ میسر نہیں آ سکتا، اس لیے انہیں پہلے سے سوچ سمجھ کر تمام تفصیلیں طے کر لینی چاہئیں، امریکہ میں قیام کے لیے کس قدر روپیہ چاہیے؟ یہ سوال ہے جس کے جواب کا انحصار کئی باتوں پر ہے مثلاً یہ کہ طالب علم نے کس تعلیمی ادارے کو چنا ہے؟ اس نے کون سا نصاب اختیار کیا ہے اس کا پسند کردہ تعلیمی ادارہ امریکہ کے کس حصہ میں واقع ہے؟ ان باتوں کو معلوم کر کے طالب علم کو اندازہ کر لینا چاہیے کہ اس کی پڑھائی، رہائش اور خوراک کے اوسط اخراجات کس قدر ہوں گے، دوسری عالمی جنگ کے بعد زندگی کے اخراجات کافی بڑھ گئے ہیں اور ابھی بدستور کافی بڑھ رہے ہیں فیس کے معاملے میں پرائیویٹ یونی ورسٹیاں مثلاً کولمبیا، ہارورڈ، ییل وغیرہ

ریاستی یونیورسٹیوں کے مقابلے میں زیادہ مہنگی ہیں، مشرقی اور مغربی ساحلی علاقوں پر واقع تعلیمی ادارے زیادہ مہنگے ہیں، وسط مغرب اور جنوب کے ادارے ان کے مقابلے میں سستے ہیں جنوب مغرب کے ادارے سب سے سستے ہیں، ان علاقائی اختلافات کے علاوہ عورت کو مرد کی نسبت زیادہ اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں ریاست ہائے متحدہ کے ۳۹۴ کالجوں کے اوسط سالانہ اخراجات کا ایک تخمینہ شائع کیا گیا تھا، اگرچہ پچھلے پانچ چھ سالوں میں یہ اخراجات پرانی سطح سے قدرے اونچے ہو چکے ہیں، تاہم یہ عام رہنمائی کے لیے اب بھی مفید ہیں، ان کی تفصیل درج ذیل ہے :-

سالانہ اخراجات	کالجوں کی تعداد
۴۰۰ — ۶۰۰ ڈالر	۲۱
۶۰۱ — ۸۰۰ "	۸۵
۸۰۱ — ۱۰۰۰ "	۱۰۶
۱۰۰۱ — ۱۲۰۰ "	۷۷
۱۲۰۱ — ۱۵۰۰ "	۷۱
۱۵۰۱ — ۱۷۰۰ "	۲۱
۱۷۰۰ سے اوپر	۱۳

ان اخراجات میں گرمائی نصاب کے اخراجات شامل نہیں اور نہ ہی امریکہ میں پہنچنے کا کرایہ اور سفر خرچ شامل ہے، امریکہ میں طلبہ کو فیس کی رعایت دینے کا دستور نہیں، ان اخراجات میں صرف فیس، رہائش اور خوراک کے اخراجات شامل ہیں، صرف فیس کی شرح حسب ذیل ہے :-

سالانہ فیس	کالجوں کی تعداد
۵۰ ڈالر سے کم	۷
۵۱ سے ۱۰۰ ڈالر	۱۲

۲۰۱ ڈالر سے ۳۰۰ ڈالر	۸۷
۳۰۱ سے ۴۰۰ ″	۱۱۲
۴۰۱ سے ۶۰۰ ″	۱۱۴
۶۰۱ سے ۹۰۰ ″	۱۸

فیس کی عام شرح ۳۰۰ — ۶۰۰ ڈالر سالانہ ہے، یہ فیس آرٹس کالجوں اور انجینئرنگ کالجوں کی ہے، طب کے لیے فیس کی شرح زیادہ ہے، خوراک اور رہائش کے اخراجات مندرجہ ذیل ہیں۔

خوراک اور رہائش کا ماہانہ خرچ	کالجوں کی تعداد
۳۰ ڈالر سے کم	۱۱
۳۱ سے ۴۰ ڈالر	۳۴
۴۱ ″ ۵۰ ″	۹۶
۵۱ ″ ۶۰ ″	۹۹
۶۱ ″ ۷۰ ″	۶۷
۷۱ ″ ۸۰ ″	۴۳
۸۰ ڈالر سے اوپر	۱۴

امریکی کالج کا تعلیمی سال عموماً ساڑھے نو مہینے کا ہوتا ہے۔ اوپر دیے گئے اخراجات صرف تعلیمی سال کے ہیں، لیکن چوں کہ طالب علم کو پورا سال گذارنا ہوتا ہے، اس لیے اس رقم میں تعطیلات گرما، سرما اور بہار کے اخراجات بھی جمع ہونے چاہئیں، چوں کہ ان چھٹیوں میں طلبا امریکہ میں گھومنا پھرنا بھی پسند کریں گے، اس لیے چھٹیوں کے اخراجات کا تخمینہ ۵۰۰ ڈالر سالانہ سے کم نہ ہونا چاہیے، امریکہ بڑا وسیع و عریض ملک ہے، جو مشرقی ساحل سے مغربی ساحل تک تین ہزار میل تک پھیلتا چلا گیا ہے ان طویل فاصلوں کی سیر و سیاحت پر بہت خرچ کیا جا سکتا ہے — ۵۰۰ ڈالر کے اندازے میں صرف قریبی نواح کی سیر شامل ہے، اس کے علاوہ ۴۰۰ ڈالر سالانہ کتابوں اور متفرق اخراجات کے لیے شمار ہونے چاہئیں، جن میں صحت کا بیمہ، کپڑوں کی دھلائی اور مجلسی اخراجات شامل ہیں، اگر کالج کے اخراجات کو ایک ہزار ڈالر سالانہ فرض کر لیا جائے تو سال بھر کے کل اخراجات مل ملا کر ۱۹۰۰ ڈالر سالانہ کو جا پہونچیں گے۔ (باقی)

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

فلمیں اور تعلیم

"ہم اپنے بچوں کو عیارانہ اور اخلاق سوز پروپگنڈا کی نذر کر رہے ہیں" یہ الفاظ ایک کتاب کے ہیں جو انگلستان میں ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی اور جس کا نام تھا شیطانی کیمرہ۔ فلم کے معترضین نے عام طور پر ایسے انتہائی خیالات کا اظہار بہت کم کیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ متحرک تصاویر بچوں اور نوجوانوں کے ذہن و دماغ پر جس شدت کے ساتھ چھا گئی ہیں اس سے صاحب فکر لوگوں کو بسا اوقات تشویش ہوتی رہی لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ فلموں کے متعلق بہت سے خطرے کم ہو گئے ہیں۔ مثلاً اب یہ یقین کیا جاتا ہے کہ بچوں کے جرائم کی اولین ذمہ داری فلموں پر عاید نہیں ہوتی۔ اب فلموں کی تعلیمی افادیت کے متعلق بہت سی امیدیں باندھی جا رہی ہیں اور یہ کہا جا رہا ہے کہ ان کی لذت نظارہ کو تعمیری طور پر اخلاقی اور جمالیاتی احساسات کی پرورش کے لیے کیوں استعمال نہ کیا جائے۔

گذشتہ موسم گرما میں لکسمبرگ کے مقام پر چودہ ملکوں کے فلمی ماہروں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ انہوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ سینما جو سب سے آخر میں پیدا ہونے والا فن لطیفہ ہے خصوصیت کے ساتھ نوجوانوں کا فن ہے، نوجوان اس سے عموماً صحت مند تاثرات لیتے ہیں، اس رائے کو اس امر سے تقویت ملی ہے کہ اب بچوں کے لیے فلمیں تیار ہونے لگی ہیں اور نوجوانوں کے لیے تعلیمی فلمیں بھی، اس میں شک نہیں کہ بچوں کی فلمیں بہت ہر دل عزیز اور کامیاب ثابت ہوئی ہیں

فلموں کی مضرت کے متعلق پہلے جو عام خیال پیدا ہو گیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ بچوں کو بلا روک ٹوک وہی فلمیں دیکھنے کی اجازت تھی جو بالغ لوگ دیکھتے تھے، اب یہ اصول مان لیا گیا ہے کہ بچوں کا ذوق اور ان کی ضرورتیں بالغوں سے مختلف ہیں، اس لیے ان کے حسب حال

فلمیں تیار کرنے کا الگ اہتمام ہونا چاہیے۔ اب یونیسکو اس کوشش میں ہے کہ بچوں کی فلمیں تیار کرنے کے لیے ایک بین الاقوامی مرکز قائم کیا جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ صرف بچوں کے لیے خاص فلمیں تیار کر دینے سے یہ مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوتا۔ اگرچہ بچے کی اپنی دنیا الگ ہے لیکن اس دنیا کی حدیں متعین نہیں کی جا سکیں۔ بچہ بالغوں کے ساتھ مل کر زندگی گذارتا ہے اور ان کی راحتوں اور لذتوں میں شریک ہوتا ہے۔ اس لیے بالغوں کے لیے تیار کی گئی فلموں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جہاں بچوں کے لیے الگ فلمیں تیار کی جائیں وہاں یہ اہتمام بھی ہو کہ بچوں کو اس قابل کیوں کر بنایا جائے کہ وہ بالغوں کے لیے تیار شدہ فلموں کے ان ناپسندیدہ اثرات سے بچے رہیں جو چھن چھن کر ان تک پہنچ جاتے ہیں۔ اڈنبرا میں جو فلمی میلہ ہو رہا ہے اس میں اس موضوع پر بھی غور ہوگا۔ اگر یہ بین الاقوامی اجتماع اس مشکل سوال کا تسلی بخش حل ڈھونڈ سکے اور فلموں کی تعلیمی افادیت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کے لیے عالمی رہنمائی کی خدمت کسی بین الاقوامی مرکز کو سونپ سکے تو یہ بہت بڑی انسانی خدمت ہوگی۔

تعلیمی انہماک

تاریک براعظم افریقہ علم کی روشنی کے لیے جس قدر بے تاب ہے اس کی تصویر ایک برطانوی پروفیسر نے اپنی ایک کتاب میں کھینچی ہے جو اس نے افریقہ سے واپسی پر لکھی ہے۔ موصوف لکھتی ہے کہ میں گولڈ کوسٹ میں اکرا کے مقام پر ایک ثانوی مدرسے میں گئی۔ یہ ایک غیر اقامتی مدرسہ تھا جس میں پانچ سو لڑکے پڑھتے تھے۔ اس کی عمارت اتنی بوسیدہ اور اذکار رفتہ تھی کہ انگلستان میں اسے کبھی قبول نہ کیا جاتا۔ اس کے کتب خانہ کو کتب خانہ کہنا گویا اس لفظ کے ساتھ مذاق کرنا تھا۔ ایک برآمدے میں کمرے باہم اس طرح پیوست تھے کہ استادوں کی آوازیں ایک دوسرے سے ٹکراتی تھیں۔ ان تمام موانع کے باوجود لڑکے اپنے سبقوں میں اس ذوق و شوق سے مگن تھے کہ انہوں نے ایک اجنبی سفید فام عورت کو ایک مختصر سرسری نگاہ سے زیادہ کا مستحق نہ سمجھا۔ اس امر کا ذکر کرتے ہوئے

پروفیسر موصوف لکھتی ہے :- "وہ یہ انہماک اس قسم کا ہے جس سے ہم پرانے ملکوں کے رہنے والے اب محروم ہو چکے ہیں" آغاز دنیا سے جہالت کے اندھیرے میں کھوئے ہوئے حبشیوں کا اس دعمہ) کے ساتھ علم کے حصول کے لیے بے تاب ہونا ایک بہت بڑا تاریخی واقعہ ہے جو نوجوان پاکستانی استاد پڑھانے کے دلدادہ ہیں اور خطر پسند طبیعت رکھتے ہیں انہیں سوچنا چاہیے کہ آیا وہ اس تاریخی بیداری میں حصہ دار بننا پسند نہیں کریں گے۔ کسی افریقی ثانوی مدرسے میں جوانی کے کچھ سال گذارنا شاید زندگی کا بہترین مصرف ثابت ہو۔

نوجوانوں کی کانفرنس

جنیوا میں ایٹمی قوت سے پر امن خدمات لینے کے متعلق جو کانفرنس ہوئی تھی اس کے ضمن میں نوجوانوں کی اس عالمی تنظیم کا اجلاس بھی ہوا جو ۱۹۴۹ء سے قائم ہے۔ یہ بالکل مناسب تھا کہ ایسی اہم کانفرنس کے موقع پر نوجوانوں کو بھی شریک کار کیا جاتا، نوجوانوں کے اس اجتماع پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک برطانوی روزنامے امید ظاہر کی تھی کہ اس سے نوجوانوں کے دلوں میں سائنس اور انجینئرنگ سے رغبت پیدا ہو گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی رغبت قومی سطح ہی پر پیدا کی جا سکتی ہے۔ مثلاً پاکستانی نوجوانوں میں سائنس کا شوق پیدا کرنے کے لیے انہیں جنیوا بھیجنے کی ضرورت نہیں، جنیوا کانفرنس میں ہر ملک سے صرف دو نوجوان پہنچے تھے۔ ظاہر ہے کہ دو نوجوان واپسی پر اپنے ملک کے نوجوانوں میں کوئی نئی روح نہیں پھونک سکتے

بے مقصدیت کا دور دورہ

برطانوی ماہر تعلیم مسٹر چارلس بریچ آلف نے کہا۔ آج دنیا میں ذہنی نامرادی کا دور دورہ ہے روائتی وفاداریاں غائب ہو چکی ہیں اور آج انسان ذہنی طور پر عجب ڈانوا ڈول ہے۔ اس کے پیچھے ایک ایسا حال ہے جو اپنے ہجوم اور بے نظمی کے باعث مقاصد اور جذبات کو کوئی واضح سمت عطا نہیں کر سکتا۔ آج دنیا کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ محبت اور ہم دردی کے جذبات ہیں لیکن یہ جذبات طرح طرح کی تنظیموں سے بھرپور قومی ماحول میں پیدا نہیں ہو سکتے

حجاموں کو شکایت

کوونیٹری (انگلستان) کے وڈلینڈز سیکنڈری مدرسے نے اپنے طلبہ کو یہ سہولت بھی دی ہے کہ پندرہ دن میں ایک بار ہر طالب علم کے بال کاٹے جائیں، ہر منگل کے دن ایک مقامی حجام کو مدرسے میں بلایا جاتا ہے، جو پندرہ دن بعد ہر لڑکے اور استاد کے بال تراش جاتا ہے، اس پر حجاموں کی قومی فیڈریشن اور خصوصاً دوکان داروں کی قومی انجمن نے احتجاج کیا ہے۔

صدر معلم مسٹر ایف ولیٹ نے صورت حال کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ نائی پہلے صرف استادوں کے بال تراشنے آیا کرتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد صدر معلم کو احساس شروع ہوا کہ بعض لڑکوں کے بال بہت لمبے اور گندے ہیں، جب ایسے لڑکوں سے وجہ پوچھی گئی تو جواب ملا کہ حجام کی دکان پر جانے کو وقت نہیں ملتا۔

اس قباحت کو دور کرنے کے لیے مدرسے نے بال تراشنے کی سہولت کا خود انتظام کر دیا تاکہ جو لڑکا چاہے بال ترشوا لے۔ کوئی ساٹھ لڑکے ہر مہینے اس سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا، یہ سہولت محض طلبہ کی خدمت کے لیے جاری کی گئی ہے اور مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس بارے میں اپنا رویہ بدلوں، یہ محض چند بچوں کی معمولی سی خدمت ہے جس پر خواہ مخواہ اتنا شور مچایا جا رہا ہے، اجرت میں کسی طرح کی کمی نہیں کی جا رہی لڑکے عام شرح اجرت جو ایک شلنگ چھ پنس ہے ادا کرتے ہیں۔

تعلیم اور تعلّم

سکاٹ لینڈ کی دوسری یونیورسٹیوں کے ساتھ مل کر ایڈنبرا کی یونیورسٹی بھی تعلیم و تعلّم کا جائزہ لینے والی ہے، اس تحقیقی مطالعہ کی رہنمائی پروفیسر پلیے کے ہاتھ میں ہوگی جنہوں نے ابھی ابھی یونیورسٹی میں شعبۂ علم التعلیم کی صدارت سنبھالی ہے، اساتذہ اور طلبہ کی ایک جوائنٹ کمیٹی اس کام میں مدد دے گی معلوم ہوا ہے کہ اصل تجویز طلبہ کی طرف سے پیش کی گئی تھی اور سینیٹ نے اس کی منظوری دے دی۔

پروفیسر پلے نے کہا کہ اپنا کام اچھی طرح انجام دینے کے لیے تحقیقاتی کمیٹی کو پہلے یونی ورسٹی تعلیم کے مقاصد کی تعیین کرنا ہوگی، بہت سی یونی ورسٹیاں اپنے وسیع المشرب مقاصد بھلا کر ٹکنالوجی کے مضامین پر زور دے رہی ہیں، پروفیسر پلے نے جو کچھ کہا ہے وہ نیا نہیں اس لیے یہ مشکل معلوم ہوتا ہے کہ محض یونی ورسٹی تعلیم کے مقاصد کو بار بار دہرانے سے کوئی بہت مفید نتیجہ نکل سکتا ہے، تاہم اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ کمیٹی میں جو طلبہ شریک ہیں ان کے ذہن صاف ہو جائیں گے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ طلبہ جس نکتہ کی وضاحت چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ لیکچر اور ٹیوٹر کی انفرادی توجہ کے درمیان کیا نسبت ہونی چاہیے، اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گو لیکچر کے طریقہ پر اب عموماً حملے ہونے لگے ہیں، سکاٹ لینڈ کی یونی ورسٹیوں میں آج بھی یہی طریقہ تمام مضامین کی تدریس کے لیے مستعمل ہے، آج سے ایک پشت پہلے کا طالب علم جب اپنے کالج کے دنوں کو یاد کرتا ہے تو وہ اس بات کو بھول نہیں سکتا کہ پروفیسر نے اسے کس قدر متاثر کیا تھا، اس کے عالمانہ لیکچروں میں وہ بے پناہ تاثیر تھی کہ کوئی سیمینار یا انفرادی توجہ ان کا بدل نہیں ہو سکتی، آج لیکچر میں وہ پرانی تاثیر باقی نہیں رہی، آج چھوٹی جماعتوں میں جو کام ہو رہا ہے وہ یقیناً بہتر تاثیر او رکشش کا حامل ہے۔ اب سیمنار اور ٹیوٹر کی انفرادی توجہ کو اہمیت حاصل ہے اور پڑھانے والوں کی تعداد میں اسی مناسبت سے اضافہ کیا گیا ہے۔

لیکن سب سے بڑا مسئلہ لیکچر یا دوسرے طریق تدریس کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ عام کارطلبہ کو اپنے طور پر کام کرنے کا ڈھنگ کس طرح سکھایا جائے، یہ مشکل ایسے طلبہ کی صورت میں اور بھی زیادہ شدید ہو جاتی ہے جہاں طالب علم ابھی اس پختگی کو نہ پہنچا ہو جو کالج کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے

ٹیکنیکل تعلیم کی اہمیت

امپیریل کیمیکل انڈسٹریز کے صدر نے حال ہی میں ایک برطانوی ٹیکنیکل کالج کا افتتاح کرتے ہوئے

کہا۔ مدرسوں میں سائنس پڑھانے والے استادوں کا تسلی بخش انتظام نہ کرنے کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ وہ مرغی ہی ختم ہو جائے جو سونے کا انڈا دیتی ہے۔ انہوں نے کہا مجھے امید ہے کہ تنخواہوں میں جو اضافہ ہوا ہے وہ اس مشکل کو حل کر دے گا، یہ ایک عام خیال ہے کہ ٹیکنیکل ماہر سائنس دان سے کم تر درجہ رکھتا ہے، یہ کہنا حقیقت کو بگاڑنا ہے تحقیقی مطالعہ بے شک اہم ہے لیکن اسی قدر اہم اس کے نتائج سے آگے کام لینا ہے، بعض اوقات یہ کام زیادہ مشکل ہے۔

ٹیکنیکل ماہروں کی کمی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ زیادہ طلبہ آرٹس کا نصاب لے لیتے ہیں، میں انسانی علوم کے مطالعہ کا مخالف نہیں بلکہ یہ سمجھتا ہوں کہ یہ علوم صحیح قسم کی تعلیم کے لیے لازمی ہیں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ پہلے سے زیادہ آرٹس کے طلبہ سائنس کا مطالعہ بھی ساتھ ہی کریں، چونکہ سائنس دانوں اور ٹیکنیکل ماہروں کو لوگوں کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے اس لیے انہیں لوگوں کے متعلق زیادہ معلوم ہونا چاہیے، وہ رسمی مضمون جو انسانوں کو بطور افراد اور بطور جماعت سمجھنے میں براہ راست مدد دیتا ہے تاریخ ہے۔

صدر معلموں کے لیے مزید تنخواہوں کا مطالبہ

برطانوی وزارت تعلیم نے حال ہی میں اس اصول کو منظور کر لیا ہے کہ جو استاد اعلیٰ جماعتوں میں کام کرتے ہوں انہیں باقیوں سے زیادہ تنخواہ ملے، اس اصول سے جہاں اور مسائل پیدا ہونے کا امکان ہے وہاں صدر معلموں کو بھی یہ فکر لاحق ہوئی ہے کہ اب اعلیٰ جماعتوں کو پڑھانے والے ماتحتوں سے ان کی تنخواہ بہت زیادہ نہیں رہے گی، چنانچہ صدر معلموں کی انجمن نے وزیر تعلیم کو ایک عرض داشت بھیجی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ان کی تنخواہ بھی بڑھائی جائے۔ انجمن کے سکرٹری نے کہا کہ صدر معلم کو جو الاؤنس ملتا ہے وہ اس کی ذمہ داریوں کے مقابلہ میں کم ہے، ماتحت استادوں کے لیے اب جو خاص الاؤنس منظور ہوا ہے، اس نے ان کی اور صدر معلموں کی تنخواہ میں بہت تھوڑا فرق باقی چھوڑا ہے، اس صورت حال نے یہ امر اور بھی ضروری بنا دیا ہے کہ صدر معلموں کی تنخواہ بڑھا دی جائے۔

روس میں مذہبی آزادی

ادریس احمد

روسی دستور اساسی کی ایک اہم دفعہ یہ ہے کہ اس ملک میں ہر شخص کو اپنی ضمیر کے مطابق عبادت کرنے اور مذہب کے خلاف پرچار کرنے کی اجازت ہے۔ مذہبی آزادی کا اس سے بڑا تمسخر غالباً ذہن میں آنا مشکل ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جہاں مذہب کے دلدادہ لوگوں کو اس بات کی اجازت ہے کہ اپنے گھروں یا اپنی عبادت گاہوں کو مقررہ اوقات پر مذہبی عبادات اور رسوم ادا کر لیا کریں وہاں الحاد اور مذہب پر کیچڑ اچھالنے والوں کو اس بات کی کھلی چھٹی ہے کہ برسر عام مذہب کے خلاف زہر اگلیں۔

روس میں جو غیر ملکی مہمان جاتے ہیں انہیں عبادت کرنے والوں سے بھرے ہوئے چند گرجے ضرور دکھائے جاتے ہیں اور اس کے فوراً بعد یہ جملہ بڑی شد و مد سے دہرایا جاتا ہے کہ روس میں لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ پچھلے دنوں کچھ روسی پادری انگلستان میں آئے ہوئے تھے۔ ان کی زبانی یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ انقلاب کے بعد اب پہلی بار انجیلیں چھپنے والی ہیں۔ یہ اطلاع بذات خود اشتراکی مذہبی آزادی پر ایک عجیب مگر معنی خیز تبصرہ پیش کرتی ہے۔

مذہبی تعلیم

جس شخص کو مذہب کے معاملہ میں ذرا بھی نگاہ حاصل ہے وہ فوراً کہہ سکتا ہے کہ چند گرجوں یا مساجد میں کبھی کبھار لوگوں کے جمع ہونے سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مذہبی تعلیم کی آزادی کس حد تک موجود ہے۔ اگر نئی پود کو مذہبی اقدار ودیعت کرنے کا کوئی تسلی بخش ذریعہ موجود نہیں تو اغلب یہ ہے کہ سال بہ سال گرجے اور مسجدیں عبادت کرنے والوں سے خالی ہوتے جائیں گے۔ ایک برطانوی پادری نے پچھلے سال روس کی ایک دینی درس گاہ کا ملاحظہ کیا تو اسے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی

طلبہ کے ہاتھوں میں مذہب پر کوئی جدید کتابیں نہیں تھیں، جب اس نے پوچھا کہ کیا گرجے کے ساتھ
داری مدرسہ بھی ملحق ہے تو جواب نفی میں ملا، وجہ یہ ہے کہ روسی قانون اس امر کی اجازت ہی نہیں
دیتا۔ روسی قانون کی رو سے اس امر کی اجازت بھی نہیں کہ کوئی پادری یا مولوی اٹھارہ سال سے
کم عمر لڑکوں یا لڑکیوں کو گرجے یا مسجد میں بھی مذہبی تبلیغ کرے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اٹھارہ سال
سے کم عمر لڑکے اور لڑکیوں کو گھر پر مذہبی تعلیم دینا بھی ممنوع ہے۔

انگریز سیاح نے مذہبی امور کی کونسل کے اراکین سے ماسکو میں کرید کرید کر سوال پوچھے
کونسل غیر مذہبی لوگوں پر مشتمل ہے اور اس کے ذمہ یہ کام ہے کہ مذہبی اداروں کو تعمیری سامان اور
کاغذ کی فراہمی پر نگاہ رکھے، ان کی زبانی معلوم ہوا کہ انہوں نے اب تک مذہبی اداروں کو صرف
ایک مرتبہ کاغذ مہیا کیا ہے، یہ ۱۹۵۲ء کی صلح کانفرنس کے موقع پر تھا، جب گرجے کے رہنماؤں
کی تقریروں کو کتابی صورت میں شائع کیا گیا، انگریز سیاح کو اس کتابچے کی ایک جلد دی گئی
جس میں لیتھوانیا کے آرچ بشپ نے یہ الفاظ لکھے تھے۔

"انگریز اور امریکی سرمایہ داروں نے کوریا میں جو جارحانہ جنگ جاری کر رکھی ہے اس کی وجہ سے
شمالی کوریا کے بچے سخت بری حالت میں ہیں معصوم بچوں اور ان کی بے بس ماؤں کو ہوائی حملوں سے
ہلاک اور زخمی کیا جا رہا ہے، ان بمباروں نے بھاری بموں کے ساتھ زہریلی گیس اور جراثیم کے بم
بھی گرانے شروع کر دیے ہیں، ان جراثیمی بموں میں طاعون، ہیضہ اور دوسری وباؤں کے جراثیم
بھرے پڑے ہوتے ہیں، یہ حقائق جمہوری وکلاء کی تحقیقات سے ثابت ہو چکے ہیں اور چین اور
شمالی کوریا کی حکومتیں ان کے متعلق اعلان کر چکی ہیں، انگریز اور امریکی حملہ آوروں نے ان مجرمانہ
ہتھیاروں کے ذریعہ عوام کو تہس نہس کرنے کا جو راستہ اختیار کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ انہیں
یہ احساس ہے کہ وہ کوریا پر زبردستی قبضہ قائم نہیں رکھ سکتے۔ ہراس کے عالم میں وہ جراثیمی
ہتھیاروں سے کام لینے لگے ہیں جس طرح ڈوبتا ہوا آدمی تنکے کا سہارا لیتا ہے"

(باقی)